



پیرا

نما جلالی

عزلی

پنڈاٹ

قلمراجنالوی



مکتبہ قریشی، چوک اور بازار، لاہور

طالب _____ منظور پریس لاہور
بار اول _____ ۶۱۹۸۲
قیمت _____ ۲۵/۰۰ روپے

مکتبہ القریش، چوک اردو بازار، لاہور
○

ادب اور تاریخ
کا
منفرد انداز
○

پندرہ

عظیم دوست اور ساتھی
احمد ندیم قاسمی
کے نام
○

(قمر اجالوی)

جسٹ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

مکتبہ القریش، چوک احمد بازار، لاہور

دریچہ

تاریخی ناول نگاری تو میرا پیشہ ٹھہرا اور یہ سلسلہ طالب علمی کے زمانہ ہی سے شروع ہو گیا تھا مگر تاریخی افسانہ مجھ سے پہلی بار تشکیل عادل زاہد نے لکھا۔ جو ”ہیا ہی بدیس“ کے نام سے ”سب رنگ“ میں شائع ہوا۔ اُن کی خواہش تھی۔ ”میں“ سب رنگ ”کے لیے مسلسل لکھوں مگر ایک روز نامہ کے ایڈیٹر کے لیے ہر ماہ تاریخ کھنگالنا اور تاریخی کہانی لکھنا کچھ مشکل سا کام ہے۔ یوں بھی افسانہ ”نظم“ غزل سب موڈ یا کیفیت کی باتیں ہیں اور یہ باتیں پابندی سے نہیں کی جاتیں۔

نذیرناجی نے ”انارکلی“ کا آغاز کیا تو تاریخی کہانی کا قلم میرے نام ڈالا بلکہ دوستی میں حکم لگایا کہ ہر ماہ لکھوں۔ میں اپنے دوستوں کی خاطر کبھی ”سولی“ پر بھی چڑھ جاتا ہوں۔ ”پنڈارے“ اُن کے لیے لکھا اور ہر ماہ کی ”سولی“ بھی قبول کی مگر نذیرناجی کی ”انارکلی“ حالات کی دیوار میں چن دی گئی۔ شاید انارکلی کی قسمت میں دیواریں ہی لکھی ہیں معلوم نہیں لاہور کا انارکلی بازار ابھی تک یہ درجہ شہادت کیوں حاصل نہیں کر سکا۔

”پنڈارے“ ادبی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔ بعض دوستوں نے خواہش کی۔ اسے جلد کتابی شکل دی جائے۔ یہ فرض میرے پبلشر عبد الحفیظ قریشی ادا کر رہے ہیں مگر ”پنڈارے“ کے ساتھ تین اور طویل مختصر افسانے بھی شامل کر دیئے ہیں۔

”طویل مختصر افسانے“ کی اصطلاح اردو میں کرشن چندر نے رائج کی تھی۔ قیام پاکستان سے قبل لاہور میں اُن سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا۔ طویل افسانہ اتنا تو ہونا چاہیے کہ اسے ”ناولٹ“ سمجھا جاسکے مگر کرشن چندر نے مجھ سے اختلاف کیا۔ اُن کا خیال تھا ناول اور افسانہ کی تکنیک میں جو فرق ہے اسے ”طویل مختصر افسانہ“ ہی کے نام سے قائم رکھا جاسکتا ہے۔

ناولٹ کی تکنیک الگ ہے۔ اسی زمانے میں میں نے ایک طویل مختصر افسانہ "اک نفی اک مادی صفر" کے عنوان سے لکھا تھا۔ جو میرے افسانوں کے مجموعہ "غڈا" میں شامل ہے۔

اب یہ تاریخی کہانیاں ترتیب دے رہا تھا تو میں نے ان کے لیے "طویل مختصر تاریخی افسانے" کی اصطلاح پسند کی مگر ایک صاحب نے مشورہ دیا۔ یہ "طویل مختصر تاریخی" کیوں نہ کہلائیں؛ میں "تاریخی" کے لفظ پر چونکا۔ سمعی اعتبار سے تو یہ لفظ میوزیکل سا لگا مگر اس کی املا پر غور کیا تو ذوقِ نظر پر بارسی گزری۔ ہم کسی کے "پرچھے" اڑتے تو دیکھ سکتے ہیں، بعض لوگوں سے "ٹچھے" بھی کھاتے رہتے ہیں مگر بصری طور پر شاید "تاریخی" کے لفظ پر ناک بھول چڑھانے بیٹھ جائیں۔ میں نے کہا۔

"بھئی! "تاریخی" کی املا کچھ جچتی نہیں۔ اس لفظ میں "خ" اور "چ" آپس میں

گڈمڈ ہو رہے ہیں۔"

"انہوں نے میری بات پکڑ لی۔"

"اور یہ "جچتی" کے بارے میں کیا خیال اس لفظ میں توجہ اور "چ" ایک دوسرے کا گلا دبوچ رہے ہیں پھر ذرا "صحیح" کے لفظ کو دیکھیے۔ یہاں اکٹھے دو "خ" اور پر نیچے ہو رہے ہیں۔"

ان کے نزدیک "جچتی" اور "صحیح" کے الفاظ عیبِ تنافر کی مثال ہیں جب کہ "تاریخی" کی ادائیگی میں موسیقی سی پائی جاتی ہے۔ اس دلیل کے باوجود میری طرف سے "طویل مختصر تاریخی افسانے" ہی قبول فرمائیے۔ آئندہ کبھی "طویل مختصر تاریخیوں" کے بارے میں سوچوں گا۔

تمرا جنادری

ایڈیٹر روزنامہ "مغربی پاکستان"

بیڈن روڈ۔ لاہور





استفادہ

- تاریخ ہندوستان
شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ
- جہوپال سے متعلق ایک مقالہ
شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد
- خال آفت ویٹل و سپائر
نرمباد و نائن سدرکار
- کہیں کی حکومت
ادی علیگ
- ہزاروں سنہیا
مشکوہ و مشکلا
- پنڈار سے کون تھے؟
مولا تاجدین انبیا



نواب کریم خاں روہیلہ کے پنڈاروں نے ریاست گوالیار کے سرحدی علاقے کو بڑی بے رحمی سے لوٹا۔ گاؤں کے گاؤں اجاڑ دیئے۔ لوٹ مار کا یہ سلسلہ تین دن سے جاری تھا۔ ہر وہ گھر جہاں مزاحمت ہوئی ویران ہو گیا۔ ہر وہ شخص جس نے مہاراجہ سندھیا کے نام کی دہائی دی تباہ و برباد کر دیا گیا۔

گوالیار مرہٹہ مہاراجہ دولت راؤ سندھیا کی ریاست تھی۔ کریم خاں کی سرحدی تاخت کا اصل مقصد مہاراجہ سے انتقام لینا اور اسے ایک ایسا سبق دینا تھا جسے وہ ہمیشہ پورے کھے دولت راؤ سندھیا کا جرم یہ تھا کہ اس نے کمپنی سرکار کے ساتھ مل کر پنڈاروں کو ختم کرنے ان کا زور توڑنے اور انہیں نیست و نابود کر دینے کی سازش کی تھی۔ آپ ضروری تھا کہ اس کے علاقے میں تھوڑی سی کانٹ چھانٹ کر دی جائے۔

پنڈا سے اصل میں مرہٹوں کے 'بازوئے شمشیر زن' بھی تھے اور ان کے کونٹے والے ہاتھ بھی۔ وہ شروع ہی سے ان کے لیے فوجی خدمات انجام دیتے رہے۔ جنگوں میں ہمیشہ ہر اول دتے کے طور پر نمودار ہوتے اور دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے نکل جاتے۔ مغلوں اور انگریزوں کے خلاف انہوں نے ہر جنگ میں بہادری کے حیرت انگیز جوہر دکھائے اور انہی کے طفیل مرہٹے ہندوستان میں ایک بڑی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے تھے مگر اب دولت راؤ سندھیا کی سیاسی مصلحت پنڈاروں کی

بہنچ کنی چاہتی تھی اور کریم خاں کے پنداروں نے اس کا یہ چیلنج قبول کر لیا تھا۔ وہ دو روز تک ریاست گوالیار کی سرحدی بستیاں گھومتے رہے۔ مرہٹوں کا کوئی فوجی دستہ مزاحمت کے لیے سامنے نہیں آیا البتہ جن لوگوں نے فرداً فرداً مقابلے کی کوشش کی ان کے گھروں کو آگ کے شعلے چاٹ گئے۔ دھوپوں کے مرغلوں میں ان کے ارمافوں کی چٹا جلتی رہی۔ مگر تیسرے دن اچانک بہت دور گردوغبار کے بادل نمودار ہوئے اور اڑتی ہوئی دھول میں زری کے لشکروں سے آراستہ پرچم حرکت کرتے نظر آئے۔ ان پرچموں کے پیچھے مرہٹہ سواروں کی کسی ٹکڑیاں اپنے مخصوص انداز میں حلقہ در حلقہ آگے بڑھ رہی تھیں۔

کریم خاں بڑی تیزی کے ساتھ گھوڑا دوڑاتا ایک بلند ٹیلے پر پہنچا اور مرہٹہ سواروں کو بستی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھنے لگا۔ زرتار جھنڈوں نے اسے حیران کر دیا کیونکہ زری پٹی کے علم مہاراجہ سندھیا یا اس کے خاص سرداروں کی علامت سمجھے جاتے تھے اور جس طرف یہ جھنڈے حرکت کرتے موت ان کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ پنداروں کی سرحدی تاخت کے مقابلے میں دربار گوالیار نے زری کے پرچموں کو حرکت دے کر اعلان کیا تھا کہ مقابلہ کسی معمولی حریت سے نہیں اور کریم خاں روہیلہ کوئی معمولی حریت تھا بھی نہیں۔ مہاراجہ سندھیا نے اس کی سرکوبی کیسے اپنے کسی خاص سردار کو پورے شاہی دبدبہ کے ساتھ روانہ کیا تھا لیکن مرہٹوں سے باقاعدہ جنگ کریم خاں کے منصوبے میں شامل ہی نہ تھی۔ وہ تو سندھیا کو پنداروں سے بدعہدی کی سزا دینے آیا تھا اور اس کے سرحدی علاقے تاخت و تاراج کر کے بکل جانا چاہتا تھا۔ ٹیلے سے اترتے ہی اس نے واپسی کا اشارہ کیا۔ فضا میں یکے بعد دیگرے تین بار بگل کی آواز گونجی۔ پندارے مال و اسباب کے پشمارے گھوڑوں پر لاوے بستی سے نکلے اور جنوب کی طرف ہولے۔

مرہٹہ لشکر نے دور ہی سے انہیں فرار ہوتے دیکھا تو گھوڑوں کو ایڑی لگائی۔ لشکر کا سردار جو کوئی بھی تھا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا کہ لوٹ مار کرنے والے گروہ کو سزا دینے کا بہترین موقع وہی ہوتا ہے، جب وہ مالِ غنیمت سمیٹ کر فرار ہو رہا

ہو۔ پنڈاروں کی افراتفری سے مرہٹہ سردار نے یہ بھی بھانپ لیا تھا کہ وہ مقابلہ کرنے کی بجائے لوٹ کا سامان لے کر نکل جانے ہی کو اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ اسی کمزوری کو بھانپ کر اس نے حملہ کا حکم دیا اور اپنا گھوڑا بھاگتے ہوئے پنڈاروں کے تعاقب میں ڈال دیا۔

مرہٹہ سردار کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ لوٹ مار کرنے والے پنڈارے کریم خاں واپس کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ خود ان کی کمان کر رہا ہے۔

کریم خاں کی کمان میں لڑنے والے پنڈارے جنگل کے چیتوں سے بھی زیادہ خونخوار ثابت ہوئے تھے مگر وہی پنڈارے اب گیدڑوں کی طرح فرار ہو رہے تھے اور خود کریم خاں ایسا بہادر سردار اپنے سواروں کو لے کر اس طرح بھاگا تھا جیسے دشمن سے خوفزدہ ہو۔ اس کی اس کمزوری کو دیکھ کر مرہٹے "شیر" ہو گئے

بستی کے جنوب میں اونچے ٹیلوں کی ایک قطار دور تک چلی گئی تھی اور ٹیلوں کی یہی قطار پنڈاروں اور مرہٹوں کے درمیان فصیل بن کر حائل ہو گئی۔ کریم خاں چھاپے مارنے اور لوٹ مار کرنے کے علاوہ فنون جنگ کا بھی ماہر تھا مگر مرہٹہ لشکر کو دیکھ کر وہ جس بدحواسی میں فرار ہوا اس سے روہیلے نواب کی جنگی مہارت کا بھرم کھل گیا اور اب مرہٹہ سردار چاہتا تھا کہ اس کے پنڈاروں کو ٹیلوں کے آس پاس گھیر کر ہلاک کر دے۔ مگر جو نہی مرہٹہ سوار ٹیلوں کے قریب پہنچے کریم خاں کا نائب نامدار خاں اپنے بچھے ہوئے سواروں کو لے کر نکلا اور بلائے ناگہانی بن کر حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑا۔

مرہٹہ سردار اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ بھاگنے والوں نے اپنی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کیا لیکن پنڈاروں کے جوابی حملے نے اس کی خوش فہمی کا خاتمہ کر دیا اور مرہٹہ سردار کو یک لخت تعاقب کی فطلی کا احساس ہوا لیکن اب بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ پھرے ہوئے پنڈاروں نے مرہٹہ سواروں کا راستہ اس طرح کاٹا کہ ہراول دستہ خاک و خون میں لوٹ گیا۔ توڑے دار ہندو تلوں کی پہلی بارہنے تعاقب کا سارا منصوبہ فاسد کر دیا۔ پنڈاروں کے گھوڑے سجلی جیسی تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ نیزوں کے

پھل گودوں میں اترتے چلے گئے اور آن کی آن میں میدان مرہٹوں کی لاشوں سے پٹ گیا۔ پنڈارے نہ تو کسی سے رحم کے طلبگار تھے نہ کسی پر رحم کرتے تھے۔ انہوں نے اس تندی سے حملہ کیا کہ مرہٹوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ ناگہاں بگل کی دوسری آواز کے ساتھ پنڈاروں کا دوسرا دستہ ٹیلوں کی اوٹ سے نمودار ہوا تو مرہٹہ سردار کی آنکھیں بھٹی کی بھٹی رہ گئیں۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی سپاہ کو ان خونخوار ٹیلوں سے دور ہٹائے۔ اس کے اشارے پر واپسی کا حزم بجا اور سوار بھیجے بیٹھے گئے۔

مرہٹے پنڈاروں کی جنگی چالوں کو سمجھتے اور جانتے تھے کہ گروہ درگروہ بھیجے ہوئے سوار دشمن پر کس طرح بجلی بن کر گرتے ہیں۔ کیا خبر ٹیلوں کے پیچھے کوئی تیسرا دستہ بھی گھات میں بیٹھا ہو۔ واپسی کے اشارے پر لڑتے مرتے سوار پنڈاروں کے حملہ کی زد سے نکل آئے تو مرہٹہ سردار نے اپنے عقبی رسالہ کو ایک خاص ترتیب سے کھڑا کیا کہ جب پنڈارے مرہٹہ سواروں کا تعاقب کرتے ہوئے آگے بڑھیں تو انہیں گھیر لیا جائے۔ نامدار خاں نے پلٹتے ہوئے مرہٹہ سواروں پر ضرب ضرور لگانی لیکن ان کے تعاقب کی غلطی نہیں کی بلکہ اپنے سواروں کو لے کر ایک بار پھر ٹیلوں کی اوٹ میں نائب ہو گیا۔

مرہٹہ سردار اسے بھی ایک جنگی چال سمجھا اور اپنی فوج کی صف بندی کرنے لگا تاکہ پنڈاروں کو کسی دوسرے چھاپے کا موقع نہ مل سکے۔ اس کا خیال تھا پنڈارے ایک بار پھر چھپ کر حملہ کریں گے لیکن کافی انتظار کے بعد بھی جب وہ ٹیلوں کی اوٹ سے باہر نہ نکلے تو مرہٹہ سردار نے خود ان پر چھاپہ مارنے کا منصوبہ بنایا اور جب ایک شہتی دستہ ان کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا تو ٹیلوں کے اس پار میدان خالی پڑا تھا اور پنڈارے انتہائی خاموشی کے ساتھ گوالیار کی سرحد بھی پار کر گئے تھے۔

اس اطلاع پر مرہٹہ سردار سر پٹ کر رہ گیا۔ وہ گوالیار سے کریم خان کی سرکوبانی کے لیے آیا تھا لیکن کریم خاں کے پنڈارے سرحدی دیہات کو تاخت و تاراج بھی

کڑکے اور حملہ آور مرہٹہ فوج پر تباہ کن ضرب بھی لگا گئے تھے۔ مرنے والے سواروں کی لاشیں اٹھی کی گئیں تو ان کی تعداد تین سو سے تجاوز کر رہی تھی۔ زخمی ہونے والے پانچ چھ سو کے درمیان تھے۔ زری پٹی کے کئی علم خاک میں اٹے پڑے تھے۔ مرہٹہ سردار زخمی سانپ کی طرح بل کھانے لگا۔ عجیب بات یہ تھی۔ پنداروں نے اپنے کسی سوار کی لاش میدان میں نہیں چھوڑی۔ وہ لاشوں اور زخمیوں کو اپنے ساتھ ہی لے گئے اور مرہٹہ سردار کے دل و دماغ پر اپنی فوجی دہشت کی نہ ٹٹنے والی تحریریں رقم کر گئے تھے۔



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کریم خاں کی سرحدی تاخت اور مرہٹہ لشکر کی ناکامی کا افسانہ گوالیار کے راج محل میں پہنچا تو مہارانی بیجا بائی کو سندھیا پر برسے اور سرزنش کرنے کا ایک عمدہ موقع ہاتھ آ گیا جو پہلے ہی اپنے شوہر سے ناراض اور اس کے نئے مشیروں کے خلاف اپنے خیالات کے اظہار کا بہانہ تلاش کر رہی تھی۔

بیجا بائی سرحدی راؤ کٹھنگی ایسے راجپوت سردار کی بیٹی اور مہاراجہ سندھیا کے مزارع میں بہت دخل رکھتی تھی۔ دولت راؤ سندھیا راج پتی کے کاموں میں کمزور اور ایک ضعیف الٹے حکمران تھا مگر حسن پرستی اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ سلطنت کے ہوشیار مشیر اور چالاک مصاحب اس کی اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھاتے اور جنین نذرانے پیش کر کے اپنا مطالب نکالنے کے ساتھ ساتھ مہاراجہ کی رائے بھی تبدیل کر دیا کرتے تھے۔ خود سرحدی راؤ کٹھنگی بھی اسی طرح وزارتِ عظمیٰ کی مسند تک پہنچا تھا۔ بیجا بائی حسن و خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔ اس سے شادی کے بعد دولت راؤ سندھیا نے سرحدی راؤ کو ۱۸۰۴ء میں گوالیار کا ملکہ المہام

دراج منتری) مقرر کر دیا کیونکہ اسی سال پہلے مدارالمہام وٹل ہنٹھ نے وفات پائی تھی۔ وٹل ہنٹھ وہ شخص تھا جس نے منشی کنول نین کے ذریعے کمپنی سرکار کے ہندوستانی گورنر جنرل لارڈ ولزلی کے ساتھ دوستی کے عہد و پیمانہ کو کے مہاراجہ سندھیا کو انگریزی خطوط سے نجات دلائی تھی۔ سر جی راؤ نے برسرِ اقتدار آتے ہی سلطنت کے داخلی امور میں بہت سی تبدیلیاں کر دیں مگر مہاراجہ کو ان تبدیلیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ تو سلطنت کا تمام کاروبار سر جی راؤ گٹھکی کے سپرد کر کے بیجا بانی کے حسن و جمال کی فسوں کاریوں میں کھو گیا تھا۔

راج محل میں شب و روز عیش و نشاط کی محفلیں آراستہ ہونے لگیں اور بیجا بانی نے مرہٹہ مہاراج کو پوری طرح اپنے حُسن کے جلوؤں کا اسیر کر لیا تھا۔ محل کے اندر بیجا بانی کی اور محل کے باہر سر جی راؤ کی حکومت تھی۔ سر جی راؤ طبیعت کا سخت اور ظلم و تشدد کو اپنے شخصی دیدہ بہ کی کلید سمجھتا تھا۔ ایک تو خود مرہٹہ چوت دوسرے، مہاراجہ کا سسر۔ محل کے اندر باہر اسی کا حکم چلتا تھا کسی کو اس کے خلاف دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ اس نے منشی کنول نین کو بھی سخت مشق بنایا جو مہاراج کے سامنے اکثر و بیشتر کمپنی سرکار کے گن گاتا رہتا تھا۔ کنول نین نے جب دیکھا کہ ابل اس کی دال نہیں گلتی تو سر جی راؤ کے مظالم سے تنگ آ کر وہلی چلا گیا۔

منشی کنول نین کے دربار گوالیار سے الگ ہونے ہی راجپوت اور مرہٹہ سرداروں کے درمیان اقتدار کی رستہ کشی ہونے لگی۔ بیجا بانی راجپوتی تھی۔ وہ بارہا اپنے راجپوتوں کے علاوہ مرہٹہ سرداروں کے مرتبہ و مقام کا خیال بھی رکھنا پڑتا تھا لیکن سر جی راؤ کے اقتدار کے خلاف جہاں جہاں حرکت کر رہی تھی وہ اسے نہ روک سکی۔ سازشیں برابر گوالیار کی روایت بن چکی تھیں اور بیجا بانی کا حُسن بھی اپنے باپ کے اقتدار کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ صرف دو سال کے اندر دولت راؤ سندھیانے سر جی راؤ گٹھکی کو اقتدار سے الگ کر دیا اور ۱۸۰۶ء میں مرہٹہ سردار امبا جی مدارالمہام کے عہدے

اس غزل و نصب کے درمیان بھی بیجا بانی اگرچہ راج محلوں پر حکومت کرتی تھی اور مہاراجہ سندھیا کی دل چسپی کم نہ ہوتی تھی مگر وہ اس امر سے غافل نہ تھی کہ مہاراج کے ارد گرد مرہٹہ دو شیرزاؤں کا جھگڑا سارے دن لگا تھا جن کی خوبصورتی اور سڈول جسموں کی کشش نے اس کے شوہر کے مزاج کو بڑی حد تک بدل دیا تھا۔ اب وہ بیجا بانی کی بجائے ان مرہٹہ لڑکیوں میں زیادہ دل چسپی لینے لگا تھا جو "حسن کا نذرانہ" بن کر مہاراج کی خدمت میں پہنچی تھیں۔ ان ایام میں دولت راؤ سندھیا راج محل کی راجپوت باندیوں پر بھی بہت کم توجہ دیتا کیونکہ ان کی جگہ مرہٹہ باندیاں جن کے حسین بدن ڈھولکیوں اور سازنگیوں کی طرح ہر وقت کئے رہتے تھے، اس کی توجہ کا مرکز بن گئی تھیں۔ سر جی راؤ کو اقتدار سے محروم کرنے میں ان حسین سازشوں کا بڑا دخل تھا۔ بیجا بانی کئی مشیروں کو ذلیل بھی کر چکی تھی جو مرہٹہ حکمران کی زنگین مزاجی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے لیکن دولت راؤ سندھیا کے مزاج کو تبدیل کر دینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ بیجا بانی کی نگرانی کے باعث وہ کسی قدر محتاط ضرور ہو گیا اور اس سے دینے بھی لگا تھا لیکن اپنی عادت ترک نہ کر سکا۔ جہاں کوئی اچھی صورت دکھی وہیں طبیعت چل جاتی۔ اس کی ہی "حسین کمزوسی" بیجا بانی پر قیامت بن کر ٹوٹی تھی۔

سر جی راؤ گھنٹی کی طیندگی اور امبا جی کے برسر اقتدار آتے ہی جو سب سے بڑی مہدی عمل میں آئی وہ یہ تھی کہ مہاراجہ نے منشی کنول مین کو دوبارہ گوالیار میں طلب کر لیا۔ کیونکہ وہ کمپنی سرکار کے ساتھ کوئی نیا معاہدہ کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے منشی کنول مین سے بہتر محرز اور کوئی نہیں تھا مگر انگریزوں کو اصرار تھا کہ مہاراجہ اپنی فوج سے پنڈاروں کو نکال باہر کرے اور ان کی مختلف محکمہ یوں کی بیخ کنی میں جو ادھر ادھر بھری ہوئی تھیں سرکار انگلشیہ کا ہاتھ بٹائے۔

دولت راؤ سندھیا خود بھی پنڈاروں کی تاخت سے پریشان اور ان کی عسکری قوت کو دینا چاہتا تھا جو اسی کے مرہٹہ حریف مہاراجہ جوبنت راؤ ملکر والیے اندور کی شہ پر گوالیار میں لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ منشی کنول مین کی سفارش پر اس نے ایک مرہٹہ سردار راؤ کو

ذری تپتی کے پرچم دے کر پنڈاروں کی سرکوبی پر مامور کر دیا تھا اور کریم خاں روہیلہ اپنی پرچموں کو روندتا ہوا نکل گیا تھا۔

اس خبر نے دربار گوالیار میں ایک تھر تھری سی پیدا کر دی۔ امبا جی اور منشی کنول میں بہاراج کو مرہٹہ لشکر کی ناکامی کا کوئی معقول جواب نہ دے سکے۔ اب بہارانی بیجا بائی کو موقع ملا تھا کہ وہ اپنے باپ کے دشمنوں کو ذلیل کر سکے اور سندھیا کو اس کی غلطیوں کا احساں دلائے گوالیار کے راج محل میں بھی کریم خاں کی سرحدی لوٹ مار اور مرہٹہ لشکر کی شکست و ناکامی پر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ یہ بات سب کے لیے پریشان کن تھی کہ کریم خاں جو ایک چھوٹی سی پنڈارہ ریاست کا نواب ہے۔ مرہٹہ لشکر کو شکست دے کر نکل گیا۔ بہاراجہ دولت راؤ سندھیا جب دربار سے فارغ ہو کر راج محل میں داخل ہوا، تو یہاں بھی سب کے چہروں پر ایک ہی سوالی تھا۔

”کیا مرہٹہ سلطنت اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ پنڈاروں پر قابو پانے کی طاقت بھی نہیں رکھتی؟“

راج محل کے نوکروں اور باندیوں سے لے کر سندھیا خاندان کی راجکماروں تک ہر کوئی اسی فکر میں غلطاں تھا حتیٰ کہ راج محل کی دیواریں بھی یہی پوچھنا چاہتی تھیں کہ مرہٹوں کی طاقت کیا ہوئی مگر بہاراج کے سامنے کسی کو اپنا سوال دہرانے کی جرأت نہ ہو سکی۔ یہ جرأت صرف بہارانی بیجا بائی نے کی۔ جو بہی بہاراجہ سندھیا اپنے کمرہ خاص میں داخل ہوا اس نے بہارانی کو دیکھا جو شاید اسی کے انتظار میں بیٹھی تھی اور کسی قدر پریشان سا ہو گیا..... تم..... یہاں.....؟“

بیجا بائی اس کی حیرت کو نظر انداز کرتی ہوئی آگے بڑھی اور تضحیک آمیز لہجے میں بولی۔ ”سنا ہے کریم خاں نے سرحدی علاقے بڑی طرح لوٹ لیے ہیں اور جلتے جلتے بہاراج کو تین سولاشوں کا تحفہ بھی دے گیا۔“

دولت راؤ سندھیا نے بہارانی کے الفاظ کی چٹھن محسوس کی لیکن کسی بحث کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ بیجا بائی کی جلی کٹی باتوں کا عادی سا ہو گیا تھا اور عام طور پر خاموش ہی رہتا

لیکن کریم خاں کے معاملے نے کچھ ایسی اہمیت اختیار کر لی تھی کہ جواب دینا ہی پڑا۔
 ”ہم لاشوں کا یہ تحفہ بہت جلد اُسے واپس کر دیں گے۔“

اسی قسم کے مواقع پر سندھیا اپنی شخصیت پر شاہی وقار کا غلاف چڑھایا کرتا تھا تاکہ اپنی بات میں وزن اور آواز میں رعب پیدا کر سکے۔ مہارانی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بھی اس نے چہرے پر خٹونت کے آثار طاری کر لیے جس نے بیجا بانی کو چونکا دیا کیونکہ وہ جانتی تھی مہاراج کے لبوں تک آنے والے الفاظ اس کے اپنے نہیں ہوتے۔ اس کے جواب سے مہارانی یہ بھی سمجھ گئی کہ دربار میں کریم خاں کی ریاست کو تباہ و برباد کر دینے کا فیصلہ ہو چکا ہے لیکن جو آگ اس کے دل میں بھڑک رہی تھی۔ وہ شعلہ بن کر لبوں پر آگئی اور بولی۔

”کیا مرہٹہ سردار نارو کو ندی پٹی کا جھنڈا منشی کنول میں کی سفارش پر دیا گیا تھا؟“
 ”ہاں۔“ سندھیا کو اقرار کرنا پڑا۔

”اور سردار نارو کی بیٹی جوان بھی ہے اور سندھ بھی.....“

بیجا بانی نے سندھیا کی کمزور ترین رگ پر انگلی رکھ دی، چاہتی تھی کہ اس کی کسی حسین کمزوری پر سرزنش کر سکے لیکن خلاف توقع سندھیا یہ بات سنتے ہی مشتعل ہو گیا اور بڑے تلخ لہجے میں گرج کر بولا۔

”بیجا بانی! جو کچھ کہہ رہے ہیں غور سے سن لو تاکہ تمہیں دوبارہ کسی شکایت کا موقع نہ مل سکے اور ہم بھی کسی صفائی کی ضرورت محسوس نہ کریں۔ ہم مہاراج ہونے کے ناطے راج نیتی کے سب اچھے بڑے کاموں کے ذمہ دار ہیں اور انسان ہونے کے ناطے اگر سندھ لڑکیوں سے ملتے ہیں۔ تو یہ ہمارا ادھیکار ہے اور تم یہ ادھیکار نہیں چھین سکتیں۔“

مہاراج سندھیا نے زندگی میں پہلی بار ایسی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔ یقیناً کسی دوسرے کی پڑھائی ہوئی پٹی تھی ورنہ وہ خود ایسے الفاظ استعمال کرنے کا عادی نہیں تھا۔ بیجا بانی چند لمحوں کے لیے ”سن“ سی ہو کر رہ گئی، مگر فوراً خیال آیا وہ ایک

کمزور اور ضعیف رائے شخص کے سامنے کھڑی ہے جس کی کئی "کمزوریاں" اس کی اپنی مٹھی میں ہیں۔ ایک دم پلٹ کر بولی "اور پتی ہونے کے نلٹے ہمارا ج کا کیا ادھیکار ہے؟"

ہمارا فی کالجہ ہی کچھ ایسا تھا کہ دولت راؤ سندھیا کانپ گیا۔ بیجا بائی اس کے دل و دماغ پر راج کرتی رہی تھی اور وہ اپنی کمزوریوں کے باعث اس سے دبتا تھا۔ پھر راجوتنی کے شباب میں ابھی بڑی کشش تھی۔ وہ کسی قدر محبوب سا ہو کر کہتے لگا۔

"بیجا بائی! تم آج بھی ہمیں اتنی ہی پیاری ہو جتنی بیاہ کی رات پیاری تھیں بس،

..... ہم اور کیا کہیں.....؟"

بیجا بائی کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تیر گئی۔ سندھیانے جھگڑا کرنے کی بجائے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دینے ہی میں مصالحت سمجھی مگر بیجا بائی جانتی تھی۔ باپ کے دشمنوں سے بدلہ لینے اور ہمارا ج کی رائے کو تبدیل کرنے کا یہی موقع ہے۔ بات کا رخ بدلتی ہوئی بولی "سنا ہے راج دربار میں کریم خاں کے پنڈاروں کی گوشالی کرنے کا فیصلہ ہوا ہے؟ اب پنڈاروں کی گوشالی نہیں۔ خاتمہ ہوگا۔"

اور یہ مشورہ آپ کو مابا جی اور منشی کنول نین نے دیا ہوگا؟

"مشورہ کسی نے بھی دیا ہو ہم پنڈاروں کی تباہی کا فیصلہ کر چکے ہیں۔"

"پنڈاروں کی تباہی کمپنی سرکار کے بھلے کی بات ہو سکتی ہے۔ اس میں ہمارا کوئی بھلا

نہیں....."

"کیا مطلب؟" سندھیانے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"مابا جی اور منشی کنول نین صرف انگریز کے بھلے کی سوچتے ہیں۔ آپ کو اپنے بھلے کی

سوچنی چاہیے۔"

"اور ہمارا بھلا کس میں ہے؟"

"پنڈاروں سے دشمنی مول لینا پڑا ہنگا سو دا ہے ہمارا ج! کریم خاں کو اپنا دشمن

بنانے کی بجائے دوست بنانے کی کوشش کریں۔ انگریز کے خلاف آپ کے کام آئیگا۔"

’ مگر اس نے ہمارے علاقے کو تاخت و تاراج کیا ہے۔‘
 ’ صرف اس لیے وہ آپ سے ناراض ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ آپ کمپنی سرکار سے مل گئے ہیں۔ اسے اپنی دوستی کا یقین دلائیے اور لوہے کی زنجیروں میں جکڑنے کی بجائے پر یہ کی زنجیروں میں باندھ لیجئے۔ اسی میں آپ کا بھلا ہے۔‘
 دولت راؤ سندھیانے غور کیا تو مہارانی کی بات امبا جی اور منشی کنول پن کے مشورے سے زیادہ ذہنی محسوس ہوئی اور اسے یوں لگا جیسے بیجا بائی نے اس کی آدھی پریشانیاں بانٹ لی ہیں۔



مغل سلطنت کے نوال پر ہندوستان میں جو طوائف الملوکی پھیلی، اس نے بہت سے طالع آزا گروہ، بہت سے ہم جو حکمران پیدا کیے تھے۔ ملکی بھی اور غیر ملکی بھی۔ انگریز فرانسیسی، پرتگالی، مرہٹے، روہیلے، پنڈاریے، سکھ، راجاڑے، بھیل، جاٹ سبھی حلقہ در حلقہ قیمت آزمائی میں مصروف تھے جو علاقہ جس کے قبضے میں آیا دبا کر بیٹھ گیا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول پر عمل ہو رہا تھا۔ انسانوں کے اس جنگل میں طاقت ہی سب سے موثر قانون تھا اور حکمرانوں کی اس بھیر میں کمپنی سرکار اور مرہٹے دو ہی غالب طاقتیں تھیں جو اقتدارِ اعلیٰ کے لیے باہم دست و گریباں ہو رہی تھیں۔ دونوں میں سے کسی کو گوارا نہ تھا کہ ان کے سامنے کوئی تیسرا فریق، کوئی تیسری صورت ابھر سکے۔ مغل سلطنت برائے نام رہ گئی تھی۔ ہندوستان کے بیشتر علاقوں پر انگریز کا قبضہ تھا یا مرہٹوں کا لیکن بہت سی ریاستوں کے حکمران بھی اپنی آزادی اور خود مختاری کی جدوجہد کر رہے تھے۔ ہر چھوٹا بڑا گروہ لوٹ مار میں مصروف اور اپنی

لوٹ کا حلقہ وسیع کرنے میں لگا ہوا تھا۔

پنڈاروں کا سردار کریم خاں انگریزوں اور مرہٹوں کے مقابلے میں ایک چھوٹا لیڈر تھا جس نے بندیل کھنڈ کے علاقے میں گیارہ پرگنوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی ریاست قائم کر لی تھی۔ یہ ریاست کسی حکمران، کسی نواب، کسی مہاراجہ کی بخشش نہیں بلکہ کریم خاں نے اپنے زورِ بازو سے پیدا کی تھی۔ ہندوستان میں عورت، زمین اور اقتدار کی جو لوٹ مچ رہی تھی، کریم خاں بھی اس میں اپنا حصہ بنانے کے لیے شریک ہو گیا تھا۔ وہ ذات کا روہیلہ بھٹان، بہت کامرو اور قسمت کا دھنی تھا۔ ایک طرف اس نے جسونت راؤ ہلکر کی ریاست اندور پر تاخت کی۔ دوسری جانب مہاراجہ دولت راؤ سندھیا کی سلطنت گوالیار کے بعض پرگنوں اور تعلقے دبا لیے۔ دس ہزار پنڈارے ہر وقت اس کی کمان میں رہتے تھے۔ پایادہ سپاہ الگ تھی۔ اپنے دارالریاست میں تو وہیں ڈھالنے کا ایک خانہ بھی قائم کر لیا تھا۔ سپاہیوں کو جدید فنونِ حرب کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ ریاست کی آمدنی تو صرف سولہ لاکھ روپے سالانہ تک محدود تھی لیکن دیگر طالع آناؤں کی طرح بہت سے اخراجات، مہم جوئی اور ماروھاڑ سے پورے ہوتے تھے۔

کریم خاں جوانی میں بڑا وجہہ، شکیلی اور پُرکشش رہا تھا۔ شادی بھوپال کے نواب حیات محمد خاں کے گھروں ہوئی تھی اور اس تعلق سے اس کے وقار میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلے وہ آوارہ گرد پنڈاروں کا ایک سردار تھا، اب ایک شہزادی کا خافندہ ایک ریاست کا مالک، اور ایک خود مختار حکمران کی سی شان و شوکت رکھتا تھا۔ آج تک پنڈاروں کے کسی سردار کو یہ مرتبہ و مقام حاصل نہ ہوا تھا۔

پنڈارے شروع ہی سے مرہٹوں کے دست و بازو بنے رہے۔ انہی کی خاطر لڑتے مرتے اور لوٹ مار میں اپنا حصہ وصول کرتے تھے لیکن اب وہ اپنے لیے مرزا، اپنے لیے جینا چاہتے تھے۔ کریم خاں کی سرکردگی میں انہوں نے باقاعدہ ایک ریاست کی واضح بیل ڈال دی۔ ریاست چھوٹی تھی لیکن کریم خاں کے حوصلے بڑے تھے۔ اب وہ انگریزوں کے علاوہ مرہٹوں کی آنکھوں میں بھی کانٹا سا بن کر کھٹکنے لگا تھا۔ انہیں

کریم خاں کے روپ میں دراصل امیر خاں اُبھرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔
 امیر خاں سنبھل مراد آباد کے روہیلہ سرداروں میں سے تھا۔ جب بریلی ،
 مراد آباد اور نجیب آباد تباہ ہوئے اور انگریزوں نے ان پر قبضہ کر لیا تو امیر خاں اپنے
 پنڈاروں کی فوجیں لے کر مالوے چلا گیا اور حسونت راؤ ملکر سے مل گیا۔ وہ ایک عرصہ
 تک کمپنی سرکار کے لیے پیغامِ ہلاکت بنا رہا۔ پنڈاروں میں اس سے بڑا سردار کوئی نہیں
 تھا جس کے نام سے بڑے بڑے حکمران بھی کانپ جاتے تھے۔ پنڈاروں کو بدنام کرنے کے لیے
 کمپنی سرکار انہیں 'ٹھگ' اور 'ٹیرے' مشہور کر رہی تھی مگر پنڈارے زیادہ تر صوبہ
 متحدہ آگرہ و اودھ کے تباہ شدہ پٹھان ، روہیلے اور شریف لوگ تھے جنہیں انگریز
 نے لوٹ کر برباد کر دیا۔ اب وہ خود لوٹ مار میں شریک ہو گئے۔ ان میں جاٹ بھیل
 مرٹھے بھی شامل تھے۔

پنڈاروں کے کچھ حلقے اور بھی تھے جو دیپائے نربدا کے مغربی پہاڑوں اور جنگلوں
 میں پھیلے تھے۔ نربدا اور بندیل کھنڈ کے درمیان ساوا علاقہ انہی 'چیتوں' کا 'جنگل'
 سمجھا جاتا تھا جہاں کسی 'شکاری' کو گھنٹے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ سرہٹوں نے ہر دور میں
 پنڈاروں سے فائدہ اٹھایا اور اپنی مہموں میں انہیں ہمیشہ آگے رکھا تھا لیکن جس طرح
 مرٹھے خود سندھیا اور بلکر خاندانوں میں بٹ گئے اسی طرح پنڈارے بھی سندھیا شاہی
 اور 'بلکر شاہی' گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔

سندھیا شاہی پنڈاروں میں ہیرن اور بورن ڈو نامور سردار تھے جنہیں ناگپور
 کے مرہٹہ راجہ نے تباہ و برباد کیا۔ ہیرن کے ڈو بیٹوں دوست محمد خاں اور واصل محمد
 خاں نے اپنے باپ کے پراگندہ ساتھیوں کو پھراکٹھا کیا اور مالوہ کے جنگلوں میں اپنا
 شکار ڈھونڈنے لگے۔ بورن کے پنڈاروں کی سرداری کا جھنڈا میاں جیتو نے سنبھا لیا جو میو
 قوم کا جاٹ تھا مگر اپنی لیاقت، بہادری اور سپہ گیری سے سردار بن گیا۔ اس کا جتھہ اتنا
 زبردست اور طاقتور تھا کہ ۱۸۰۵ء کی لڑائی میں ہمارا جہ دولت راؤ سندھیا نے کمپنی
 سرکار کے خلاف جیتو کی مدد حاصل کی۔ پھر اسے خلعتِ فاخرہ دی، ایک جاگیر بخشی،

نواب کا لقب دیا اور زری پٹی کے علم عطا کیے جو مرہٹوں میں اعلیٰ اختیار اور افتخار کا نشان سمجھے جاتے تھے۔

چلیوتے نے بہاراجہ سندھیا کا دیا ہوا لقب اپنی مہر پر کندہ کرایا اور نواب چلیوتے بن کر نمار کی جاگیر پر حکومت کرنے لگا۔ جغرافیائی اعتبار سے نمار پنڈاروں کا ایک محفوظ ترین دارالقرار تھا جو بندھیا چل کے دو پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا اور جس کے چاروں طرف وسیع اور گھنے جنگلات کا خطرناک حصار قائم تھا۔

کریم خاں کے بعد نواب چلیوتے پنڈارہ سرداروں میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا اور انگریزوں کا دشمن سمجھا جاتا تھا لیکن کریم خاں کا رعب و دبدبہ ہی کچھ اور تھا۔ اس کے سرخ و سفید جسم میں دوڑتے ہوئے پٹھان لہو کی سرخی نئی نبروں، نئی مہموں، نئی فتوحات کا عنوان بن جانا چاہتی تھیں۔ اس نے بندیل کھنڈ کے جنگلوں میں مختلف ٹکڑیوں کے درمیان بٹے اور بکھرے ہوئے پنڈاروں کو متحد کر کے وسطی ہند میں ایک نئی سلطنت کے قیام کا منصوبہ بنایا مگر جب کمپنی سرکار اور بہاراجہ سندھیا کے کان میں اس خطرناک منصوبہ کی بھنک پڑی، تو ان کی جبینوں پر قہر و غضب کی شکنیں ابھرا آئیں۔ پنڈاروں کو سب زیادہ شکایت مرہٹوں سے تھی جن کے لیے ساری عمر لڑتے مرتے رہے۔ اب وہی ان کی جان کے دشمن ہو رہے تھے کریم خاں نے گوالیار کے سرحدی علاقے کوتا تخت و تاراج کر کے دراصل اسی شکایت کا اظہار کیا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ دولت راؤ سندھیا اس تاخت کا بدلہ لینے کے لیے بندیل کھنڈ کی طرف کوچ کرے گا مگر گوالیار کے راج دربار پر ایک پراسرار خاموشی طاری تھی۔

دربار گوالیار کی پراسرار خاموشی کا طلسم اچانک ایک دھماکے سے ٹوٹا اور مرہٹہ ایچی پیغام لے کر آیا کہ بہاراجہ دولت راؤ سندھیا نواب کریم خاں سے دوستی کا پوچھنے کے لیے نفیس نفیس تشریف لارہے ہیں۔ اس پیغام کے ساتھ وہ مرہٹہ بہاراجہ کی طرف سے کچھ تحفے بھی لے کر آیا جسے وصول کر کے کریم خاں کو محسوس ہونے لگا کہ اس نے بہاراجہ کو جس غلطی کی طرف متوجہ کیا تھا وہ ضرور اس کی سمجھ میں آگئی ہے اور پنڈاروں کو تباہ و برباد کرنے کی بجائے ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا کر اس نے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔

عام خیال تو یہ تھا۔ سرحدی تاخت کے جواب میں مدار المہام امباجی یا خود مہاراجہ سندھیا
بندیل کھنڈ کی طرف کوچ کرے گا اور مرہٹے پنداروں سے لیکھاڑالیں گے مگر صورتِ حال غیر
متوقع طور پر تبدیل ہو گئی تھی اور جنگ کے بدلے دوستی کا پیغام آیا تھا۔ کریم خاں نے ایلچی
کی بڑی آؤ بھگت کی اور کہا۔ ”اگر مہاراج دوست بن کر آ رہے ہیں تو ہم بھی ان کا شاہ
استقبال کریں گے۔“

روہیلہ پٹھان دل کا کھرا اور بہادر آدمی تھا۔ بہادروں کی قدر کرتا بھی جانتا تھا۔
اس نے لومڑیوں کے سے داؤ پیچ سیکھے ہی نہیں تھے۔ مہاراجہ کے لیے بڑے قیمتی تحائف
دے کر ایلچی کو رخصت کیا اور دربار سے نکل کر حرم میں داخل ہوا تو بیگم کو یہ خوشخبری سننے
کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ مگر یہاں کچھ اور ہی سامان نظر آئے اور خود بیگم کو اپنا منتظر پایا۔
سکراتے چہرے اور گونجتی آواز میں بولا۔

بیگم! آج ہم بہت خوش ہیں۔ ہندوستان کے سب سے بڑے حکمران نے ہمیں
دوستی کا پیغام بھیجا ہے۔“

کریم خاں کا خیال تھا۔ بھوپال کی شہزادی یہ خبر سنتے ہی خوشی سے کھل اٹھے گی۔
مگر اس نے بڑی سرد مہری سے جواب دیا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ مہاراجہ دولت راؤ سندھیا
کا ایلچی آیا تھا۔ ہر بار میں ہونے والی گفتگو بھی سن چکے ہیں۔“

”پھر تو آپ کو خوش ہونا چاہیے تھا۔۔۔۔۔“
”اگر دولت راؤ سندھیا کی بجائے یہ پیغام حسونت راؤ مکر نے بھیجا ہوتا تو ہم یقیناً
خوش ہوتے۔“

”ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھتے بیگم!“

”شاید ہم سمجھا بھی نہ سکیں۔“

”مگر وہ بات ضرور معلوم کرنا چاہتے ہیں جس نے آپ کو پریشان کر دیا ہے۔“

بھوپال کے شاہی محلات میں پل کر جوان ہونے والی شہزادی حکمرانوں کے سیاسی

داؤ پیچ بھی جانتی تھی اور کمزور ریاستوں کی مجبوریاں بھی سمجھتی تھی کہنے لگی۔

” ہم اس بات پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے کہ آپ ایک دلیر اور بہادر حکمران ہیں اور اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں کہ آپ ہمارے ستراج ہیں لیکن سیاست اور بہادری میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ آپ بہادر ہیں سیاست دان نہیں۔ دولت راؤ سندھیا صرف سیاستدان ہے، بہادر نہیں۔ آپ کو اس کے پیغام پر اعتماد نہیں کر لینا چاہیے۔“

نواب کریم خاں متحیر نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ ”تو آپ کے خیال میں سندھیا ہمیں دھوکا دے رہا ہے؟“

”یقین نہیں شبہ ضرور ہے.....“

”شبہ کا کوئی سبب؟“

”دولت راؤ سندھیا کا نام ہی کافی ہے۔“

بے اختیار کریم خاں کا تہقہہ بند ہوا۔ ”وہ یہاں آکر ہمارے ساتھ کوئی فریب نہیں کھیل سکتا۔ پنڈارے جب اپنی بندوقیں سیدھی کر لیتے ہیں تو یہ نہیں دیکھتے کہ بارود سے پھٹنے والا سینہ کسی سپاہی کا ہے یا مہاراجہ کا۔“

”ہم صرف آپ کو احتیاط کا مشورہ دیتے ہیں۔ کیونکہ بندوق سے نکلی گولی اور لگی ہوئی عزت واپس نہیں آیا کرتی۔“

ان الفاظ نے کریم خاں جیسے بہادر کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ سینے میں ایک بھل برپا تھی خود کو سنبھالنے کے لیے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بڑے دھیمے لہجے میں بولا۔

”ہم مہاراجہ کا پیغام ملاقات اب بھی مسترد کر سکتے ہیں۔“

”نہیں.....“ بیگم نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”بہادر کسی کی ملاقات کا پیغام قبول کر کے مسترد نہیں کیا کرتے۔ یہ بات آداب کے خلاف ہے۔ بس آپ کو کچھ انتظامات کرنے ہوں گے۔“

”کیسے انتظامات؟“

”سب سے پہلے تو ہمیں یہاں سے رخصت کر دیجئے۔“

کریم خاں کے سینے پر جیسے کسی نے گھونسا مار دیا ہو۔ بیگم کی اس احتیاط کا مطلب سمجھ

گیا تھا۔ اس سے قبل وہ لکھی ہوئی عزت کے الفاظ میں ایک خطرے کا اظہار کر چکی تھی تھی۔ اب اپنی رخصت کا ذکر خیر کر اس نے واضح کر دیا تھا کہ دولت راؤ سندھیا جیسے بدتماش حکمران پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ پھر وہ خود ہی وضاحت کرنے لگی۔

”مرہہ بہاراج کی آمد پر بہار یہاں موجود ہونا مناسب نہیں ہوگا۔ ہم بھوپال چلے جائیں گے اور اس وقت تک وہیں رہیں گے جب تک سندھیالوٹ نہیں جاتا۔“
 کریم خاں نے خون کا گھونٹ نگل لیا اور بولا ”ہمیں منظور ہے۔“

”دوسری بات یہ ہے کہ آپ سندھیا کا استقبال اپنی ریاست میں نہیں بلکہ سرحد پر کریں گے اور وہیں اس سے گفت و شنید ہوگی۔“
 یہ پابندی کیوں؟

”وہ دوست بن کر آئے یا دشمن بن کر آئے اپنی ریاست کے راستے اور گھر کے دروازے نہ دکھائیے۔“

کریم خاں بڑی طرح چونکا ”ہمیں آپ کی یہ بات بہت پسند آئی ہے۔“
 ”تو پھر اس پر عمل کیجیے۔“

”ایسا ہی ہوگا۔ ہم سندھیا سے اپنی ریاست کی سرحد پر ملاقات کریں گے۔“
 ”اب بہار آخری مشورہ بھی سن لیجئے۔ سرحد پر آپ اپنے پورے لشکر کے ساتھ جائیں گے اور اپنی حفاظت سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں رہیں گے۔ ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ چاندبائی کو بھی اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔“

روہیلہ نواب غصے میں کھڑا ہو گیا۔ ”آپ سمجھتی ہیں ہم اتنے بزدل ہیں کہ اپنے لوگوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔“

”بہار یہ مطلب ہرگز نہیں۔ شہزادی بھی ساتھ ہی آٹھی تھی۔ ہم تو فقط آپ کو احتیاط کی تاکید کر رہے ہیں۔“

احتیاط بزدلی کا دوسرا نام ہے۔“

”آپ کو ہماری بات پر ناراض نہیں ہونا چاہیے۔“

”ہم ناراض نہیں۔“ نواب ایک بار مچھر سنبھل گیا۔ آپ نے جس خطرے کی طرف توجہ دلائی ہے ہم اسے اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔“

”مگر ہمارا خیال ہے آپ چاند بانی کے سلسلے میں کوئی احتیاط ضروری نہیں سمجھتے اور ہم نے یہ مشورہ اس لیے دیا تھا کہ جب چاند بانی آپ کو عزیز ہے تو ہمیں بھی عزیز ہے۔“

”آپ جانتی نہیں ہم اسے چھوڑ کر جانا بھی چاہیں گے تو نہیں رگے گی۔ وہ بھی ہماری طرح خطروں سے کھیلنا پسند کرتی ہے۔“

”بس ہمیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے، اب ہماری روانگی کا بندوبست کر دیجئے۔ ہم آج ہی بھوپال روانہ ہو جائیں گے۔“

”اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ بھوپال دور تو نہیں۔“

”مصلحت یہی کہتی ہے۔ ہمیں آج ہی روانہ ہو جانا چاہیے اور اتفاق بھی ایسا ہوا ہے کہ اب ہم رُک بھی نہیں سکتے۔“

”کیسا اتفاق؟“

”آج ہی بھوپال سے پیغام آیا ہے کہ آبا حضور کی طبیعت ٹھیک نہیں آئیوں نے خود ہمیں طلب کیا ہے۔“

نواب کریم خاں یہ خبر سن کر پریشان نظر آنے لگا۔ ”مگر ہمیں کسی نے اطلاع نہیں دی کہ نواب حضور بیمار ہیں۔ اب ہم آپ کو نہیں روک سکتے اور آج ہی روانگی کا انتظام کیے دیتے ہیں۔ دولت راؤ سندھیا کی ملاقات کے بعد خود بھی ان کی عیادت کیلئے بھوپال پہنچ جائیں گے۔“

”ہم آپ کا بے چینی سے انتظار کریں گے۔“

نواب کریم خاں نے اسی وقت خاصہ کے سواروں کو طلب کیا اور ان کی حفاظت میں بیگم کی بالکی بھوپال کی طرف روانہ کر دی۔



ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ خبر آئی۔ مہاراجہ سندھیا اپنے لاؤ لشکر سمیت گویا
سے روانہ ہو چکا اور نواب کریم خاں سے ملاقات کے لیے بندیل کھنڈ کی طرف بڑھتا چلا
آ رہا ہے۔

نواب کریم خاں مہاراجہ کے لاؤ لشکر کی خبر سن کر چونک گیا لیکن جانتا تھا کہ راجے
مہاراجے جب کسی ریاست کے مہمان بنتے ہیں تو لاؤ لشکر بھی ساتھ ہوتا ہے۔ سادہ دل
نواب اُسے بھی ایک اعزاز سمجھا کہ مہاراجہ سندھیا کے ساتھ مرہٹہ لشکروں کی دوستی اور میزبانی
کا فخر بھی حاصل ہو رہا ہے۔

دستہ خاص کے برق اندازوں کے ہمراہ خود بھی علم لہراتا ریاست سے نکلتا کہ بیگم
کے مشورے کے مطابق سرحد پر مہاراجہ کا استقبال کر سکے۔ نامدار خاں کی قیادت میں سوار اور
پیادہ دستے بھی پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ تاکہ مہاراجہ بھی جاں لے کہ اس نے کسی معمولی آدمی
سے دوستی نہیں کی۔ دعوت اور مہمان نوازی کا تمام سامان ایک الگ دستہ کی نگرانی میں
آگے آگے روانہ کر دیا اور اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ مرہٹہ اور راجپوت مہانوں کو ان
کی پسند کے کھانے ملی سکیں۔

دولت راؤ سندھیا کی آمد ایک پر جلال حکمران کی آمد تھی۔ منگلوں اور انگریزوں کے
بعد ہندوستان میں اسی کا سب سے زیادہ دیدہ و دیدہ تھا مگر نواب کریم خاں روزیہ کا انداز استقبال
بھی کسی بلند قبائل حکمران سے کم نہ تھا۔ اگر مرہٹہ اپنی عظمت و شوکت کے اظہار کی خاطر سیاہ
ہاتھی کے ہودے میں بادل کی طرح جھومتا، گر جتا ہوا آیا تو روزیہ بھی اس پ تازی پر سوار
بجلی کی مانند کوندتا، کرکٹا ہوا آگے بڑھا۔ مہاراجہ کی آمد بھی عجیب تھی اور استقبال کا نظارہ
بھی بڑا دل فریب تھا۔ نقاروں پر چوٹ پڑی۔ درجنوں گول ایک ساتھ پھونکے گئے۔ بنیڈ
باجوں کا شور بندھیا چل کی چٹانوں سے ٹکرا کر صدائے بازگشت پیدا کرنے لگا۔

یہ دو حکمرانوں کی دوستانہ ملاقات بھی تھی اور سبیلیوں سے بھرے ہوئے دو باؤلوں کا ٹکراؤ بھی تھا۔ کریم خاں روہیلہ نے اپنے مسلح پنداروں کے علاوہ چتر، علم اور خدم و حشم کے ساتھ جس شان و شوکت سے مرہٹہ حکمران کاغیرمقدم کیا۔ اس سے سندھیا کے ان بدترین اندیشوں کی تصدیق ہو گئی کہ وسطی ہند میں ایک نئی سلطنت کے قیام کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور نواب کریم خاں کے تیور ایک نئے خطرے کا اعلان کر رہے ہیں۔

مہاراجہ سندھیا ہاتھی سے اور کریم خاں گھوڑے سے اُترا۔ مرہٹے اور پندارے نیز تلواروں اور توڑے دار بندوقوں سے مسلح پورے جگے کھڑے تھے۔ مہمان اور میزبان اُن کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب پہنچے اور طوفان کی دو سرکش موجوں کی مانند نفل گیر ہو گئے۔

دولت راؤ سندھیا اور کریم خاں روہیلہ کے روپ میں یہ وصال سیوا جی مرہٹہ اور افضل خاں کی ملاقات تھی مگر سیوا جی کی طرح سندھیا کی آستین میں کوئی خنجر نہیں تھا جسے وہ کریم خاں کی پیٹھ میں گھونپ کر اس ملاقات پر خون کی مہر لگاتا۔ وہ اپنا منصوبہ آستین میں چھپا کر نہیں دل میں بٹھا کر لایا تھا۔ جس پر چہرے کی سلوٹوں نے ایک اور پردہ ڈال دیا تھا۔ اس نے کریم خاں سے جس دوستی کا اظہار کیا اس کا بھرم بھی قائم رکھنا چاہتا تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں اور دوسرے والیان ریاست کے خلاف جنگیں لڑتے اور سیاسی داؤ پیچ کھیلتے ایک عرصہ گزر گیا تھا اور زمانہ کے گرم و سرد حالات نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ عقل و دانش کا کمزور سہی مگر زندگی کے تجربات نے اسے کئی سبق دیئے تھے اور اپنے چہرے پر شاہی حشمت کا سایہ ڈال لینے کے بعد وہ دوسروں کو ایک پُر جلال حکمران دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کریم خاں کو سینے سے لگانے کے بعد ہاتھ ملایا اور محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ میں قوت کی گرمی ہی موجود نہیں بلکہ وہ لوہے کی طرح سخت اور مضبوط بھی ہے۔ شاطر حکمرانوں کا یہ دستور رہا ہے۔ وہ جس ہاتھ کو کاٹ نہیں سکتے اسے چوم لیتے ہیں۔ مہاراجہ نے کریم خاں کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں بھی کوئی اور ہی مضمون نظر آیا اور مسکراتے لہجے میں گویا ہوا۔

کریم خاں ! ہمیں تمہاری قوجی طاقت دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ ہم عنقریب

کمپنی سرکار کے خلاف جنگ کا اشتہار دینے والے ہیں اور تمہیں اس جنگ میں اپنی طاقت آزمانے کا موقع دیں گے۔“

کریم خاں کا سینہ کچھ اور چوڑا ہو گیا۔ ”انگریز ہمارا سا جھاڑمن ہے مہاراجہ جیپ تک وہ ہندوستان میں موجود ہے آپ کو چین سے بیٹھنے دے گا نہ ہمیں۔ اس کے خلاف آپ کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔“

دوبیلے کی بڑھتی ہوئی طاقت اور چڑھتے ہوئے تیور کے ساتھ مرہٹے کو اس کا بدلا ہوا لہجہ بھی بڑا ناگوار گزرا۔ پنڈاروں کا معمولی سردار جو خوبی قسمت سے ایک ریاست کا حکمران بن بیٹھا تھا مہاراجہ دولت راؤ سندھیا کے سامنے بھی حاکمانہ لہجے میں گفتگو کر رہا تھا مگر اس نے اپنی ناگواری کو مسکراہٹ کے خلاف میں لپیٹ لیا اور کہا۔

”کریم خاں! تم بہادر ہو اور بہادری کے ساتھ تمہارے حوصلے بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔ ہم تمہارے حوصلوں کی داد دیتے ہیں مگر ان حوصلوں کو چھوٹی چھوٹی جھڑپوں میں ضائع کرنے کی بجائے کسی بڑے معرکے کے لیے محفوظ رکھو۔“

ملاقات کا دیباچہ ختم ہوا تو مہاراجہ نے اپنا سفری دسارہ آراستہ کیا اور نواب کریم خاں کو حاضری کی اجازت دی۔ دوبیلہ اپنے سرداروں اور افسروں کی معیت میں پورے شاہی فقار کے ساتھ حاضر ہوا۔ دسارہ سندھیا کا تھا لیکن رعب و جلال کریم خاں کا دیکھنے والا تھا۔ دستور کے مطابق بہت سے قیمتی نذرانوں کے علاوہ اس نے سوا لاکھ روپے کی مالیت کا ایک ندیں تخت بھی مہاراجہ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ غالباً اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ اگر سندھیا ہندوستان کا تخت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے کریم خاں سے معاملہ طے کرنا چاہیے۔ مہاراجہ اس اشارے کو سمجھا یا نہیں مگر کریم خاں کے شاہانہ انداز دیکھ کر اتنا ضرور سمجھ گیا کہ منہ زود دوبیلہ اپنی چادر سے برسہ کر پاؤں پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تو یہی تھا کہ بدن سے چادر کھینچ کر اسے ننگا کر دے یا پاؤں کاٹ دے جو چادر سے باہر نکلے پڑے تھے لیکن فی الحال سیاسی مصلحت کچھ اور تقاضا کر رہی تھی۔ اس نے سونے کے تخت کا نطلہ انتہائی گرم چوٹی سے قبول کیا اور خوش ہو کر بولا۔ ”کریم خاں! تم نے

ہمیں تخت تو پیش کر دیا مگر اس کی حفاظت کے لیے ہمیں تمہارے مضبوط بازوؤں کی بھی ضرورت ہے۔“

”آپ ہمیں ہمیشہ اپنے قریب پائیں گے مہاراج! کریم خاں بڑے خوبصورت پیراہ میں دل کی بات زبان پر لایا۔“

”مگر ہماری کچھ شرطیں، کچھ درخواستیں ہیں۔“

سندھیا اس کے آخری الفاظ سن کر تڑپ سا گیا اور اپنی حاکمانہ حیثیت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم تمہاری تمام درخواستیں سننے بغیر ہی منظور کرتے ہیں مگر شرطیں تم خود بیان کرو گے۔ اس پر معلوم تو ہو تم ہم سے کون سی چیز طلب کرتے ہو؟“

”ہمیں اپنی آزادی اور خود مختاری سے اور کوئی شے عزیز نہیں مہاراج! اور ہم اسی شے کی منظوری چاہتے ہیں۔“

سندھیا کے سال خورہ ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تیر گئی۔ اس مسکراہٹ میں مہربانی کی جھلک بھی تھی اور طنز کی کاٹ بھی۔ ”کریم خاں! آزادی مانگی نہیں جاتی حاصل کی جاتی ہے۔ تم اسے دوستی کی شرط قرار دیتے ہو تو ہم غور کریں گے۔ اگر تمہاری خواہش ہے تو ہمیں یہ خواہش بے حد عزیز ہے۔“

سندھیا کے الفاظ سیاست کے گورکھ دھندے کی طرح بڑے پیچیدہ تھے جن کے کہنے ہی معنی نکلتے تھے۔ مرہٹے اور راجپوت سردار ان الفاظ کا مطلب خوب سمجھتے تھے مگر نیت کا صاف رویہ آنادی کا مطلب صرف آزادی قرار دیتا تھا۔ وہ مہاراجہ کے اس بیان پر بے حد خوش تھا کہ اسے ”آزادی کی خواہش“ عزیز ہے پھر بھی اس نے وضاحت ضروری سمجھی۔

”آزادی ہماری خواہش بھی ہے اور دوستی کی شرط بھی کیونکہ دوستی دو برابر کے آدمیوں میں ہوتی ہے۔ آقا اور غلام کے درمیان نہیں۔“

سندھیا نے بات بگڑتی دیکھی تو فوراً جواب دیا۔ ”اس کے لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم گوالیار جاتے ہی تمہاری آزادی کی سند روانہ کر دیں گے۔“

مہاراجہ دولت راؤ سندھیا کی طرف سے پنڈاروں کی آزادی کا اعتراف ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس اعزاز کے بوجھ سے روہیلے نواب کی گردن میں ذرا سا خم پیدا ہوا اور شکر یہ ادا کرتے ہوئے بولا: آپ نے ہماری عزت افزائی کی اور ہماری دوستی کا ہاتھ تھام لیا ہے۔

”ہم یقین دلاتے ہیں کریم خاں! تمہارے داخلی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی مگر اس کے عوض تمہیں بھی کچھ عہد و پیمان کرنے ہوں گے۔“

”کیسے عہد و پیمان؟“

”تم کمپنی سرکار کے خلاف ہر لڑائی میں ہمارا ساتھ دو گے۔“

دولت راؤ سندھیا جانتا تھا کریم خاں انگریزوں کا دشمن ہے اور کمپنی سرکار کے خلاف جنگ کے بھیڑیوں سے بھی سمجھوتہ کر سکتا ہے۔ اس کی توقع کے عین مطابق کمپنی سرکار کا نام سنتے ہی روہیلے نواب کی نبضوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی اور جذبات انگیز بھی میں بولا۔

”مہاراج! ہماری ریاست کے کارخانے میں توہینِ صرف اس لیے ڈھالی جاتی ہیں کہ ہم کمپنی سرکار کا شکار کھیلے۔ آپ جب ہمیں شکار کی دعوت دیں گے ہمیں میدانِ جنگ میں موجود پائیں گے۔ اس کے لیے اگر کسی عہد نامے کی ضرورت ہے تو اس کی تحریر ہم اپنے خون سے لکھ دیتے ہیں۔“

”مردوں کی زبان خون کی تحریروں سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ ہمیں تمہارے قول پر اعتبار ہے۔“

غالباً سندھیا کسی تحریری معاہدہ سے اس لیے بچنا چاہتا تھا کہ اس صورت میں اسے کریم خاں کے پنڈاروں کی آزادی کا معاہدہ بھی معرضِ تحریر میں لانا پڑتا۔ اس کے نزدیک انگریزوں کے خلاف زبانی عہد و پیمان ہی کافی تھے۔ اس طویل ملاقات کے بعد اس نے روہیلے نواب کو دلفریب وعدوں کے ساتھ کچھ قیمتی تحائف دے کر رخصت کر دیا۔ کریم خاں مرہٹہ سپہاؤں سے نکلا تو بے حد خوش تھا۔ اپنی خمیرہ گاہ میں واپس

آتے ہی اس نے ہجیم کے نام خط لکھا اور ایک تیز رفتا رقاصہ بھوپال کی طرف دوڑا دیا اس نے شہزادی کو اطلاع دی تھی کہ ریاست کی آزادی کو تسلیم کر کے مہاراجہ سندھیا نے ہمارے ساتھ دوستی کے عہد و پیمانہ کر لیے ہیں۔ اب ہم مرہٹوں کے خدمت گزار نہیں، ان کے دوست ہیں۔



کریم خاں کی ریاست بھوپال کے جنگلوں سے دور نہ تھی۔ اس کے پٹداروں میں اگرچہ بھیل، بندیل، جاٹ سبھی شامل تھے لیکن غالب تعداد روہیلے پٹھانوں کی تھی جو روہیل کھنڈ پر انگریزوں کے تسلط کے بعد وسطی ہند کی طرف نکل آئے اور کریم خاں کی سرکار میں ملازم ہو گئے تھے۔ یہ چھوٹی سی پٹدار ریاست انہی کی معرکہ آرائیوں اور ترکازیوں سے معرض وجود میں آئی تھی۔ ان لوگوں کو مختلف معرکے مارتے عرصہ ہو گیا تھا اور ریاست کے باقاعدہ قیام کے ساتھ ہی حکمرانی کے انداز بھی سیکھ لیے تھے۔

نواب کریم خاں نے میزبان حکمرانوں کے دستور کے مطابق مہاراجہ سندھیا کی خدمت میں کنیزوں اور باندیوں کا نذرانہ بھی پیش کیا تھا۔ ان میں کچھ کنیزیں پڑھی لکھی تھیں جو شاہی آداب کی بجا آوری کے ساتھ راج محلوں میں خدمت گزار کی سلیقہ بھی جانتی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ ہوشیار بندیل کھنڈ کی گیتی تھی جو بھوپال کے شاہی محل میں بھی خدمت سرانجام دے چکی تھی۔ چند ایسی کنیزیں بھی پیش کی گئیں جو حسن و جمال کے ساتھ رقص و موسیقی میں بھی شہرت رکھتی تھیں۔ کیونکہ کریم خاں سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ دولت راؤ سندھیا ایک زنگین مزاج اور خوشامد پسند حکمران ہے۔ لہذا نواب نے اس کی دل بستگی کا پورا خیال رکھا تھا۔

مہاراجہ سندھیا اور نواب کریم خاں میں دوستانہ ملاقات کے بعد دونوں شکروں

میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور خوشی کی مٹھلیں منعقد ہونے لگی تھیں۔ وہ تمام بانڈیاں اور کنیزیں جو مرہٹہ مہاراج کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ دربار میں قبول ہوئیں۔ خدمت گزار بانڈیاں تو مرہٹہ اور راجپوت سرداروں میں تقسیم کر دی گئیں مگر گیتی کے ساتھ پڑھی لکھی کنیزیں مہاراجہ کے لیے وقف کر دی گئیں۔ البتہ رقص و موسیقی کے جاؤ و جگانے والی حسین و ماہ رخ کنیزوں کے لیے حکم ہوا تھا کہ شام کو ناچ گانے کی محفل آراستہ ہوگی تو مہاراج خود ان کے پاس میں کوئی فیصلہ کریں گے۔

امباہی نے بڑی ہوشیاری سے پچاس ناچنے گانے والیوں سے صرف پندرہ منہ جبینوں کا انتخاب کیا کہ بس مہاراج اپنی کے رقص و نغمہ سے شاد کام ہوں گے۔

ابھی شام نے اپنی زلفیں نہیں کھولی تھیں کہ کنیزوں کی زلفیں کھل گئیں۔ پاؤں میں گنگھرو بجنے لگے۔ ہونٹوں پر نغمے مچلنے لگے۔ یہ ایک عجیب نظارہ تھا کہ پندرہ حسین لڑکیاں ایک ہی سُر مال پر ناچ رہی تھیں۔ ایک ہی لے میں نغمہ سرائتھیں اور آواز کی ہم آہنگی کے ساتھ ان کے بدن کی ہر جنبش بھی کیساں تھی۔ مہاراجہ سندھیار رقص و نغمہ کے اس انداز سے بے حد محظوظ ہوا۔ اگر ملاقات کے دوران کریم خاں سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی تھی تو مرہٹہ حکمران نے اس نذرانہ حسن پر وہ بھی معاف کر دی اور مسکرا کر بولا۔

’ہم یہ ساری کنیزیں اپنے دربار کے لیے قبول کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہ تھا بذیل کھنڈ کے جنگلوں میں کلا کے ایسے سندر پھول بھی کھلتے ہیں۔‘

مرہٹہ سردار شو ویشپ راقن نے کہا۔ ’بے شک نواب کریم خاں نے جنگل کے پھول تو مہاراج کی خدمت میں بھیج دیے مگر بذیل کھنڈ کے آکاش کا چاند اپنے خمیوں میں چھپا رکھا۔‘

’بذیل کھنڈ کے آکاش کا چاند، حسن پرست سندھیانے چونک کر شو ویشپ راؤ کی طرف دیکھا۔‘ کیا مطلب ہے تمہارا؟

’مہاراج! یہ کنیزیں جنگل کے پھول ہیں یا جھیل کے کنول مگر نواب کے پاس بذیل کھنڈ کا ایک چاند بھی ہے اور تم لوگ ہی سمجھتے تھے کہ نواب اس موقع پر وہ چاند حضور کے چروں میں پیش کسے گا۔‘

شویشپ راؤ کی بات سن کر بواہوس سندھیانے گردن موڑ کر اپنے مدارالمہام کی طرف دیکھا اور پوچھا "کیوں امبا جی! کریم خان نے ہم سے کوئی دھوکا کیا ہے؟"

"شویشپ راؤ نے غلط نہیں کہا مہاراج! " لومڑی کی طرح چالاک امبا جی نے فوراً پینتر ابدلا۔ "نواب کے پاس ایک بہت ہی سندر ترکی ہے۔ لوگ اسے بندیل کھنڈ کا چاند کہتے ہیں۔"

یہ بات سنتے ہی مہاراجہ کامزاج یک لخت بگڑ گیا۔ اس نے رقص و نغمہ بند کرنے اور کینزوں کو چلے جانے کا حکم دیا۔ فوراً عیش و نشاط کا رنگ بگڑ گیا اور سندھیانے گرج کر بولا "بندیل کھنڈ کے چاند کو چھوڑ کر نیم جنگل کے پھول قبول نہیں کر سکتے۔ امبا جی! تم اس ترکی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

مہاراجہ اسنا ہے خوب صورتی میں اس کا جواب نہیں۔ ناچ گانے میں اندر کی اسپلاؤ کو شرماتی ہے۔ دیکھنے میں آکاش کا چاند ہے۔ نام بھی چاند بائی ہے۔ نواب اسے جان سے عزیز رکھتا ہے۔"

امبانے تعریف کر کے مہاراجہ کے دل میں بھڑکتی ہوئی آتش شوق پر الفاظ کا تیل ڈال دیا اور دولت راؤ سندھیانے حیرت پاش نظروں سے راج منتری کو دیکھنے لگا۔ "اتنی سندر ہے وہ؟"

"کیا عرض کروں۔ کریم خاں اس کی ایک ادا پر پورا ہندوستان قربان کر سکتا ہے۔ پورا ہندوستان؟" مہاراجہ سندھیانے تڑپ اٹھا۔ "کیا گوالیار بھی؟"

"گوالیار ہندوستان سے باہر تو نہیں مہاراج!"

"پھر تو کریم خاں نے واقعی ہمیں دھوکا دیا ہے۔" سندھیانے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی سب امرائے حاضر باش نے بھی اپنی نشستیں چھوڑ دیں۔ مہاراجہ غصے میں بولا۔ "کریم خاں دوستی ہم سے اور گوالیار سمیت پورا ہندوستان چاند پائی پر قربان کر دینا چاہتا ہے۔ یہ تو ہمارے ساتھ انیائے ہے۔ امبا جی! تم اسی وقت نواب کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو، وہ ہماری خاطر چاند بائی کو چھوڑ سکتا ہے یا نہیں؟ ہم اس کی دوستی

کے ثبوت میں ہندیل کھنڈ کا چاند طلب کرتے ہیں۔
 یہ کہہ کر دولت راؤ سندھیا شراب کے نشے میں لڑکھڑاتا اور خوش و غصہ میں تھڑ
 نیمہ دربار سے بھل گیا اور امبا جی کھڑا سوچنے لگا اگر وہیلے نواب نے چاند بانی کو پیش
 کرنے سے انکار کر دیا تو کیا ہوگا؟



چاند بانی علی گڑھ کی طوائف زاوی تھی۔ ۱۸۰۲ء میں جب روہیل کھنڈ پر انگریزی
 قبضہ ہوا اور روہیلوں کی صدیوں پرانی بساط الٹ گیا تو سینکڑوں خاندان عزت و ناموں
 بچا کر بھاگے۔ اس دور میں ہی ایک دولت ایسی رہ گئی تھی جس کی حفاظت کے لیے بیویوں
 لوگ کٹ مرے۔ چاند کی ماں کو بھی اس قیامت میں علی گڑھ چھوڑنا پڑا۔

طوائف کی کیا عزت، کیا ناموں۔ اس کے لیے مغل، روہیلے، مرہٹے، انگریز سب
 برابر تھے۔ وہ تو ایک بکاڈ مال ہے جس نے دام لگائے خرید لیا۔ ایک جام شراب، جس
 نے ہاتھ بڑھایا، اٹھایا۔ مگر علی گڑھ کی بعض طوائفیں بازار میں نیلام نہ ہوتی تھیں۔ ان
 کے نصیب تو کسی سردار کی حویلی، کسی نواب کے محل، کسی راجہ مہاراجہ کے رنواس میں جاگتے
 تھے۔ چاند کی ماں بھی ایک ایسی ہی طوائف تھی مگر اس وعدہ پر آشوب میں اس پر ایک
 پنڈت سے سردار کو پناہ دینے کا الزام تھا جس نے تنہا کسی انگریز قتل کیے تھے۔ پنڈت سے سردار تو
 صرف ایک رات گزار کر منہ اندھیرے ہی بھل گیا تھا لیکن کسی بدخواہ نے مخبری کر دی جس کی
 وجہ سے ماں بیٹی کو بڑی بے سرو سامانی کی حالت میں علی گڑھ سے بھاگنا پڑا کیونکہ انگریز
 کسی ایسے گھر کو معاف نہ کرتے تھے جہاں ان کے دشمن نے پناہ لی ہو۔ ایک قافلہ بندھیپل
 کی طرف جا رہا تھا۔ ماں بیٹی اس میں شریک ہو گئیں۔

چاند پر بھلتی جوانی کا موسم تھا۔ سولہ سترہ برس کا سن ہو گا شباب کی ہوا غنچوں کی

بند کھڑکیوں پر دستک دے رہی تھی کہ پٹ کھول دو۔ عارضوں پر دودھ ملی شراب کا رنگ تھا۔ گردن صراحی کی طرح سلنچے میں ڈھلی ہوئی، آنکھیں مستی بھرے کٹورے۔ گلے میں آواز کا جادو۔ پاؤں میں رقص کے بجاؤ۔ گاتی تو شعلے سے لپکتے۔ ناچتی تو دھنک کے رنگ بکھر جاتے اور زلفیں اُرتیں تو دیکھنے والوں کے دل اُرتے تھے۔ زمانے کی گردش اس قیامت و نواب کریم خاں کی سرکاریوں نے آئی۔

مُجرا ہوا۔ چاند بائی کے ساتھ اس کی قسمت کے تارے بھی ناچے اور حکم ہوا ب یہ چاند اسی آسمان پر چمکے گا۔

ماں نے زمانے کی ٹھوکریں کھانی تھیں۔ بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور اسی سرکار سے وابستہ ہو گئی۔ ریاست چھوٹی تھی مگر وہیلے نواب کا دل بڑا تھا۔ صرف تین چار سال کے عرصے میں چاند کی جوانی قیامت کے کئی ورق الٹ گئی۔



مرٹوں سے دوستی کی خوشی میں پنڈاروں کے خمیوں میں بھی راگ رنگ کی محفلیں جمی تھیں نواب کریم خاں پنڈارہ سرداروں کی بھیر سے فارغ ہوا تو بعض مصاحبوں نے ناچ گلنے کی فرمائش کی لیکن نجانے کیوں آج اس کا دل رقص و نغمے کے لیے آماہ نہ تھا۔ اپنے خیمے میں داخل ہوا تو نامدار خاں کے ساتھ شطرنج کی بازی لے بیٹھا۔

طہلتی شام تک کئی چالیں ہو گئیں اور نقشہ کچھ ایسا بن گیا تھا کہ کریم خاں کے شاہ کو کشت پڑ رہی تھی اور ایک ہی چال میں بازی مات تھی۔ نواب بساط کے نقشے پر نظریں جمائے سوچ رہا تھا، کون سی چال نکالے کہ کشت بھی بچے اور نامدار خاں کی بازی بھی الٹ دے مگر کوئی تدبیر ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ نواب کا وفادار خادم صفدر بھی

آتے جاتے کسی دار نقشے پر نظر ڈال گیا لیکن شاید کوئی چال اب ایسی رہ ہی نہیں گئی تھی جو بازی کو الٹ سستی۔ اسی سوچ بچار میں وقت گزر رہا تھا کہ اچانک نچوہدار نے مرہٹہ مدارالمہام امبا جی کے آنے کی اطلاع دی۔

کریم خاں کو اس کی بے وقت آمد کا مقصد سمجھ میں نہ آیا۔ پھر بھی بازی چھوڑ کر نایدار خاں کے ساتھ باہر نکلا اور امبا جی کا استقبال کر کے خیمے کے اندر لایا۔ مرہٹہ سلطنت کا وزیر اعظم جب نواب کے قریب مسند پر بیٹھا اور بساط کے نقشے پر نظر پڑی تو حیران سا ہو کر بولا۔

”نواب صاحب! میں نے سنا تھا آپ بہت اچھے شاطر ہیں مگر یہاں تو نقشہ

ہی کچھ اور ہے۔ آپ کا ’شاہ‘ پٹ رہا ہے۔“

نواب نے شطرنج کی بازی کو نظر انداز کر کے امبا جی کے چہرے پر کبھی ہوئی بساط کو دیکھا اور آمد کا مقصد پوچھا۔ امبا جی نے ایک ہوشیار کھلاڑی کی طرح بات کا مہرہ اٹھا کر ایک ایسے خانے میں رکھ دیا کہ یہاں بھی شاہ مات کا نقشہ بن گیا۔ ”کریم خاں! آپ نے جو کنیزیں مہاراج کی خدمت میں بھیجی تھیں ان کا مجرا تک بول نہیں ہوا۔“

نواب حیران و ششدر رہ گیا۔ ”وہ کنیزیں تو علم و فن، رقص و موسیقی اور حسن

و جمال میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔“

”مہاراج کا خیال ہے وہ صرف جنگلی پھول ہیں۔“

”جنگلی پھول تو خوشنما ہوتے ہیں امبا جی!“

”مگر مہاراج آکاش کا کوئی چاند طلب کرتے ہیں۔“

نواب نے چونک کر دیکھا۔ ”مگر ہم مہاراج کے لیے آکاش کا چاند کیسے تو ڈالیں؟“

مرہٹہ مدارالمہام نے بڑی ہوشیاری بڑی مکاری سے بات کا مہرہ آگے بڑھایا۔ معلوم

نہیں کس نے ان کے کان میں چاند بانی کا نام پھونک دیا ہے، کسی پل چپن نہیں کہتے ہیں

کریم خاں نے دل سے ہماری آؤ بھگت نہیں کی۔“

”مگر ہم نے تو مہاراج کے استقبال اور خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔۔۔“

” وہ تو سب درست ہے اور میں مہاراج کو آپ کے خلوص کا یقین بھی دلا چکا ہوں مگر فرماتے ہیں۔ اگر کریم خاص مخلص ہے تو چاند بانی کو ہم سے کیوں چھپا لیا۔ یہ الفاظ نواب کے دل پر بجلی بن کر گرے۔ آنکھوں کے سامنے دھواں سا اٹھنے لگا۔ شمش و پنج میں پڑ گیا اور افسوس سے لہجے میں بولا۔ ” شاید مہاراج نہیں جانتے چاند بانی ہمارے دل کی دھڑکن بن چکی ہے۔“

” مہاراج اتنا ضرور جانتے ہیں کہ بادشاہوں اور مہاراجوں کی آمد پر میرا بے وفائی کے ثبوت میں اپنے دل کی دھڑکنیں ہی پیش کیا کرتے ہیں۔“
 روہیلہ نواب ” وفاداری“ کے لفظ پر تمللا کر رہ گیا مگر خون کی گرمی کو دبا کر کہنے لگا۔
 ” امبا جی! یہ بات بڑھانے کی نہیں سمیٹنے کی ہے۔“
 ” آپ کا مطلب کیا ہے؟“

” روہیلے دل کی دھڑکنوں کو دل سے جدا نہیں کیا کرتے۔“
 ” مگر چاند بانی آپ کی بیگم نہیں صرف دانستہ ہے۔ گھر کی عزت نہیں محض آرائش ہے۔ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔“
 ” ہماری طرف سے مہاراج کی خدمت میں کوئی عذر پیش کر دو۔“
 ” وہ ناراض ہو جائیں گے۔“

” انہیں رام کر دو۔“

” وہ مانیں گے نہیں۔“

” کوئی اور صورت نکالو۔“

” یہ شطرنج کی بازی نہیں کریم خاں! حسن کا کھیل ہے۔ چال بہت پیڑھی ہے۔ بیچنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ مہاراج کا کہا پورا کر دیا جائے۔“
 ” اگر ہم چاند کو تمہارے ساتھ نہ بھیج سکیں تو...؟“
 ” مہاراج بگڑ جائیں گے اور مہاراج بگڑ گئے تو بہت کچھ بگڑ جائے گا۔“ امبا جی کا

لہجہ نرم تھا مگر بات بہت گرم کہہ دی تھی۔ اس نے نواب کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اس وقت آپ چاند کو میرے ساتھ بھیج دیں۔ شاید وہاں پہنچ کر واپسی کی کوئی صورت نکل آئے۔ اگر میں آپ کے خیموں سے خالی ہاتھ گیا تو اچھا نہ ہوگا۔

یہ ایک طلب تھی جو حکم کا درتیر رکھتی تھی۔ ایک درخواست تھی جسے ٹھکرا دینے کی صورت میں بہت کچھ بدل سکتا تھا۔ ایک دھمکی تھی جس کے پیچھے مرہٹہ لشکروں کی طاقت بول رہی تھی اور نواب کریم خاں مات کے نقشے پر کھڑا سوچ رہا تھا، کیا جواب دے کیا غنڈہ پیش کرے۔ کیا تدبیر کرے کہ معاملہ سمیٹ لیا جائے۔ چاند بانی صرف داشتہ نہیں اس کی محبوبہ تھی، اُسے دیکھ کر جیتی تھی۔ طوائف زاوی تھی تو کیا مجھوا، اپنے دامن میں وفا کا جوہر باندھ کر آئی تھی اور یہی ”زہر عشق کریم خان کے کلیجے کو اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا، کہ اُسے مصلحت کی بھینٹ کیسے چڑھاوے۔ وقت کا تقاضا انکار کا حوصلہ نہ رکھتا تھا۔ دل اقرار پر راضی نہ تھا۔ اس کا ذہن ”نہیں“ اور ہاں کے درمیان ایک ویران سے غلامی میں ٹک کر رہ گیا۔

امبا جی کا مطالبہ کچھ اور تھا۔ کریم خاں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ بھلا یہ ناشدنی خبر سنکر چاند زندہ کس طرح رہ سکے گی کہ وہ مہاراجہ بندھیا کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کی جا رہی ہے۔ خبر سننے ہی مثل کھا کر گرے گی۔ اب اُسے بیگم کی نصیحت یاد آئی جس نے چاند بانی کو ساتھ لے جانے سے منع کیا تھا۔ سخت پریشان ہو گیا۔

اسی پریشانی کے عالم میں نواب نے ایک بار پھر سامنے کبھی ہوئی بساط کے نقشے کو دیکھا۔ اُدھر بھی بازی ایک ہی چال میں مات ہونے والی تھی اور ادھر بھی صرف ”ہاں“ یا ”نہیں“ پر محبت کے کھیل کا انحصار ہے۔ وہ کرے تو کیا، جواب دے تو کیا، گھبرا کر اس نے فیصلہ قسمت پر چھوڑ دیا کہ دیکھیں وہ کیا چال نکالتی ہے اور ساتھ ہی اس کے ذہن میں عجیب سی ترکیب آئی۔ مرہٹہ دارالمہام سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

”امبا جی! ہمیں مہاراج کے حکم سے انکار نہیں لیکن چاند بانی نے جانے سے انکار کر دیا تو کیا ہوگا؟“

مرہٹہ جیت کے نقشے پر بیٹھا تھا۔ طنز آلود منسی کے ساتھ جواب دیا۔ ایک
طوائف زادی ہندوستان کے سب سے بڑے مہاراج کے پاس جانے سے انکار کر دے گی۔
یہ بات میری سمجھ سے بہت اونچی ہے۔

’چاند طوائف زادی ضرور ہے مگر خود طوائف نہیں۔ وہ ہم سے محبت کرتی ہے
اور محبت میں انہونی باتیں ہو جاتی ہیں۔‘

امبا جی نے بڑے غور سے نواب کے چہرے کو دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگا۔ وقت
محبت کی داستانوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے کریم خاں! پھر بھی میں وعدہ کرتا ہوں
اگر چاند بانی نے جانے سے انکار کر دیا تو خالی ہاتھ لوٹ جاؤں گا اور آپ کو اس کے روکنے
کا اختیار ہوگا۔ میں مہاراج کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔
’ہمیں یہ شرط منظور ہے۔‘ نواب مطمئن نظر آنے لگا۔ قسمت نے اس کی ہرتی
ہوتی بازی کو سنبھال لیا تھا۔

’مگر میری شرط یہ ہے۔ آپ چاند بانی کو انکار پر مجبور نہیں کریں گے۔‘
’ہرگز نہیں کریں گے، یہ ہم وعدہ کرتے ہیں۔‘ پھر نواب نے صفدر کو آواز دی۔
صفدر خاں اگرچہ دروازے کے باہر کھڑا تھا لیکن اس نے نواب اور مرہٹہ الملہا
کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن لیا تھا۔ انجان سا بن کر بولا۔

’کیا حکم ہے سرکار!‘

’چاند بانی کو جا کر بلا لاؤ۔‘

’کچھ کہنا بھی ہے سرکار!‘

’کچھ نہیں کہنا۔ یہ بتاؤ کہ ہم نے طلب کیا ہے؟‘

صفدر خاں کورنش ادا کرتا ہوا اٹھے قدموں پٹا اور خیمے سے نکل گیا۔



چاند بانی اپنے خیمے میں ہار سنگھار کیے بیٹھی تھی۔ آج خوشی کی رات تھی۔ مرٹوں اور پٹداروں کے درمیان دوستی کے عہد و پیمان ہوئے تھے۔ اس کا خیال تھا۔ اس خوشی میں نواب صاحب اسے بھی حاضری کے لیے بلائیں گے، خلوت کا موقع ملے گا مگر جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی کہ حاضری کا بلاوا کیوں نہیں آیا کہہیں نواب حضور اسے بھول تو نہیں گئے لیکن چاند بانی بھولنے والی چیز تھی کہاں۔ اچانک خیمے کا پردہ اٹھا اور صفر خاں کی شکل نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی خوش ہو گئی اور بولی۔ ”صفر خاں! آنے میں بہت دیر کر دی۔“

”وہاں نقشہ ہی بگڑ گیا ہے چاند بانی!“

”کیا نواب حضور ہم سے ناراض ہیں؟“

”نہیں۔ مہاراجہ سندھیا کا پیغام آیا ہے۔“

”کیسا پیغام؟“

”مہاراجہ نے آپ کا مطالبہ کیا ہے۔“

یہ خبر چاند بانی پر بجلی بن کر گری، دم بخود رہ گئی۔ ہوش سنبھلے تو پوچھا۔ مگر

نواب حضور نے کیا جواب دیا ہے؟

”وہ سخت پریشان ہیں۔ مرہٹہ راج منتری امبا جی نے انہیں دھمکی دی ہے اگر

مہاراجہ کا کہا پورا نہ کیا گیا تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ مہاراجہ کو اپنے لشکر وں کی طاقت پر کھمنڈ

ہے۔ وہ ایک ہی حملے میں پٹداروں کی اس چھوٹی سی ریاست کو نیست و نابود کر سکتے ہیں

نواب حضور سے ان کا جاہ و مرتبہ چھین سکتے ہیں۔ ان کے ایک ہی حملے میں سب کچھ خاک

میں مل سکتا ہے کیونکہ کوئی مرٹوں کو روکنے والا نہیں۔۔۔۔۔“

چاند بانی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”صفر خاں! صرف یہ بتاؤ نواب صاحب

نے کیا کہا ہے؟

گفتگو سن کر چاند بائی کی ماں بھی قریب آگئی تھی۔ صفدر خاں نے جواب دیا۔
”حضور نواب نے معاملہ آپ کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔“

”میری مرضی پر.....“ چاند بائی حیران رہ گئی۔ ”اور خود کچھ نہیں کہا؟“
”فیصلہ اسی بات پر ہوا ہے کہ اگر آپ جانے سے انکار کر دیں گی تو نواب حسب
کو آپ کے روکنے کا اختیار ہوگا اور مرہٹہ دارالمہام خالی ہاتھ لوٹ جائے گا۔“
چاند بائی سوچ میں پڑ گئی اور اس کی ماں سگرا کر کہنے لگی۔ ”جب فیصلہ تیری مرضی
پر ہوگا تو گھبراہٹ کیسی۔ جا کر انکار کر دے۔“

”بات بہت ٹیڑھی ہے ماں! تو نہیں سمجھے گی۔“ چاند بائی جیسے کوئی خواب
دیکھ رہی تھی۔ ”جب دو حکمرانوں کے درمیان ایک عورت کی ذات حائل ہو جاتی ہے
تو بہت سے معاملے بگڑ جاتے ہیں۔“ پھر وہ صفدر خاں سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”چلو
صفدر خاں! اگر بات مجھ پر چھوڑ دی گئی ہے تو میں ہی فیصلہ کروں گی۔“



ادھر نواب کریم خاں کے سامنے بساط بچھی تھی اور نقشہ اگرچہ اب بھی وہی تھا
جو پہلے تھا لیکن نواب کی سب پریشانی دور ہو چکی اور چال بدل گئی تھی۔ قیمت اس کا
ہاتھ پکڑ کر وہاں لے آئی تھی جہاں امبا جی اسے مات نہ دے سکتا تھا کیونکہ چاند بائی کی
روانگی اب اس کی اپنی مرضی پر منحصر تھی اور کریم خاں جانتا تھا وہ سنا انکار کر دے گی۔
چاند بائی نے حاضری میں دیر نہیں لگائی۔ صفدر خاں کی آواز کے ساتھ ہی جس نے

اس کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ سب لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ چاند بانی خیمے میں داخل ہوئی تو اس کے پاؤں کی اسنگلیوں میں چاندی کے بچھوے کی سُرلی چھنک جاؤ و سنا بن کر تیر گئی۔ یہ آواز دلوں کو گھائل کر دینے کے لیے کافی تھی۔ جب اس نے آگے بڑھ کر نواب کو مہرا پیش کیا تو مباحی کو دیکھ کر ٹھٹکی مگر قندیلوں کی روشنی میں اس کی سچ دھج دیکھ کر مر مہرہ دارالمہام اپنے ہوش بھول گیا۔

چاند بانی نواب کے سامنے صورتِ تصویر کھڑی تھی اور مباحی اس چاند کے ٹکڑے کو دیکھ کر تصویر پر حیرت بن گیا تھا۔ بیس اکیس سال کی بھر پور جوانی جس جس و جمال کا پیکر سر سے پاؤں تک کہیں بھی تو نظر ٹھہرتی نہ تھی۔ سوچنے لگا۔ اگر اسی قیامت کا نام چاند بانی ہے تو نواب کا توڑ پنا بالکل بجا ہے۔ ایسی صورتوں پر حکمران سلطنتیں بار دیا کرتے ہیں مگر یہ چاند تو گوالیار کے آسمان پر چمکنا چاہیے۔ مباحی نے کچھ اور بھی سوچا کہ اگر یہ چاند ہاتھ لگے تو گوالیار کے راج محلوں میں بجا بانی کا ستارہ ماند پڑ جائے جو آج بھی مر مہرہ سرداروں کو خاطر میں نہیں لاتی۔

ادھر نواب کریم خاں چپ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اظہارِ طلب کی زبان کہاں سے لائے اور چاند کو کس منہ سے بتائے کہ اس کی حاضری کا مقصد کیا ہے؟ چند لمحوں کی اضطراب انگیز خاموشی کے بعد چاند بانی نے خود ہی پوچھ لیا۔ سکار نے مجھے طلب کیا ہے؟

مباحی کو یوں لگا کسی ستارے نے نغمہ سرائی کی ہے۔ سُرلی آواز میں بھی ایک جاؤ تھا اور یہ جاؤ کریم خاں کے دل کو گھائل کر گیا۔ بے چینی سے پہلہ بدل کر بولا۔

”چاند بانی! مباحی تمہیں لینے آئے ہیں۔“

انجان سی بن کر کہنے لگی۔ مباحی لینے آئے ہیں..... وہ کس لیے؟

نواب نے کسی قدر جرات کا مظاہرہ کیا اور بتایا۔ مہاراج دولت راؤ سندھیا تمہارا نام سن کر آرام کھو بیٹھے ہیں۔ ہمارا خیال ہے تمہیں دیکھیں گے تو اپنے ہوش و حواس بھی کھودیں گے۔

”میں سرکار کا مطلب نہیں سمجھی۔ کچھ وضاحت چاہتی ہوں۔“

”سمجھنے کی کوشش کرو چاند! بہاراج چاہتے ہیں تمہیں ان کے سپرد کر دیا جائے۔“

”مگر حضور کیا چاہتے ہیں؟“

”ہم نے فیصلہ تمہاری مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔“

”زہے نصیب.....“ چاند بانئی کے ہونٹ تھر تھرائے۔ دوسرے ہی لمحے نواب

کریم خاں سے آنکھ چرائی اور مرہٹہ مدارالمہام سے مخاطب ہوئی۔ ”امبا جی! اگر بہاراج نے طلب کیا ہے تو مجھے حاضری سے انکار نہیں لیکن میری ایک شرط ہوگی۔“

امبا جی فرط مسرت سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کریم خاں کو شرمات دے کر بازی

جیت لی تھی۔ بولا ”چاند بانئی! تمہاری شرط سننے بغیر منظور ہے۔“

نواب یوں تڑپا جیسے کسی نے سینے پر بندوق داغ دی ہو۔ ”چاند! یہ تم کیا کر رہی ہو؟“

مرہٹہ ایک قدم آگے بڑھا آیا۔ ”بس، نواب صاحب! اپنے وعدے پر قائم رہیے

اب اگر آپ نے چاند کو روکنے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔“

چاند بانئی نے اس کی طرف دیکھا۔ ”امبا جی! پالکی منگوائیے میں تیار ہوں۔“

”پالکی اور کھار ساتھ لے کر آیا ہوں۔“

نواب کریم خاں جو سمجھتا تھا کہ چاند بانئی اس کی جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکے

گی، اس کے فیصلے پر مبہوت رہ گیا۔ ایک ہی لمحے میں چار سال کا تعلق یوں توڑ دیا تھا جیسے

یہ چار سال کبھی اس کی زندگی میں آئے ہی نہ تھے۔ بادل بے شک نہ گر جا مگر بجلی کر دکھتی ہوئی

نواب کے دل پر گری۔ کبھی برقی آسمانی کو گرتے دیکھا تھا یا نہیں مگر دل پر جو بیت گئی

اس نے نخلِ محبت پر گرنے والی بجلیوں کے ہزاروں افسانے دہرا دیئے اور اب

وہاں خاک اڑ رہی تھی۔

پہلے تو یہ سمجھا شاید سماعت کو دھوکا ہوا ہے مگر چاند بانئی کا ایک ایک لفظ اب

بھی کانوں میں رعد کی طرح کر دکھ رہا تھا۔ محبت کی بازی ختم ہوئی اور تقدیر صرف لپیٹ

رہی تھی اور دھردہ جانِ جاناں پالکی میں سوار ہونے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

روہیلہ نواب چاہتا تھا اس بے وفائی کا سبب پوچھے لیکن چاند بانی نے ایک بار آنکھ پھرائی تو پھر آنکھ نہیں ملانی ۔

چند لمحوں کے بعد نواب کی حسرتوں کا جنازہ پانکی کی صورت میں امبا جی کے آگے آگے مرہٹہ خیموں کی طرف جا رہا تھا اور وہ اپنے خیمے کے دروازے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ چاند کو ہار کر اس نے کیا کچھ ہار دیا ہے ۔ ایک بار خیال آیا ۔ آخر طوائف زادی تھی ۔ بڑی سرکار کی خاطر چھوٹی سرکار کو چھوڑ گئی ۔ مگر کوئی شے دل کو اندر ہی اندر کچوکے دے رہی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ جو کچھ ہو گزرا ہے اس پر یقین کرے ۔



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

امبا جی بازی جیت کر لوٹا تھا ۔ پانکی کے آگے آگے ایک سوار مہاراج کی طرف دوڑا دیا اور خوش خبری بھیجی کہ اس نے بندیل کھنڈ کے آسمان سے چاند توڑ لیا ہے ۔ دولت راؤ سندھیلے نے خبر سنی تو مسرت سے دیوانہ ہو گیا اور اپنے خیمہ خاص میں اس کی آمد کی گھڑیاں گننے لگا ۔

پانکی مرہٹہ سراپردہ کے باہر آتی تو چاند بانی کسی اقبال مند شہزادی کی طرح باہر نکلی اور امبا جی کی پیشوائی میں خیموں کے اس محل میں داخل ہوئی جس پر زری پٹی سے آراستہ پرچموں نے سطوت شاہی کا سایہ ڈال رکھا تھا ۔ پہرے داروں نے فوجی انداز میں استقبال کیا ۔ یہ استقبال امبا جی کا تھا یا چاند بانی کا ؟

وہ معاملے کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھی ۔ پھر بھی یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ مرہٹہ سراپردہ میں صورت حال کچھ غیر معمولی ہے جیسے کی ڈیوڑھی سے گزر کر راج منتری کے پیچھے

پچھے قناتوں کے درمیان ایک چوڑی راہداری میں چلنے لگی۔ مشعلوں کی روشنی میں مرہٹہ چوہدری یہاں بھی لمبے لمبے بھالے سنبھالے چاق و چوبند کھڑے تھے۔ مہاراج تک پہنچنے کے لیے ابھی کچھ اور مرحلے بھی تھے اور ان مرحلوں کا خاص خیال شاید اس لیے رکھا گیا تھا کہ نواب کریم خاں کی چھوٹی سی سرکار سے کٹ کر آنے والی چاندبائی مرہٹہ مہاراج کے جاہ و جلال اور سطوت و حشمت کا اچھی طرح نظارہ کر سکے۔

چوڑی راہداری کے آگے ایک اور کمرہ تھا جہاں مہاراج سندھیا کا افسر بکار خاص چند خفیہ محافظوں کے ساتھ موجود تھا۔ ان لوگوں کی ڈیوٹی یہی تھی کہ کسی ناپسندیدہ آدمی کو کمرہ خاص میں نہ جانے دیں۔ خفیہ محافظوں نے بھی بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا اور بتایا کہ مہاراج نے حاضری کی اجازت دے دی ہے۔

چاندبائی ایک بڑے مہاراج کی شان و شوکت کا نظارہ کرتی امباہی کے ساتھ آگے بڑھی۔ افسر بکار خاص نے خود آگے بڑھ کر خمیے کا پردہ ہٹایا۔ ایک محافظ نے گونگ پر ضرب لگا کر مہاراج کو حسین مہمان کی آمد کی اطلاع دی۔ چاندبائی مدارالمہام کی معیت میں زری کے دروازے سے گزر کر پھووا چھنکاتی ایک وسیع و عریض ہال نامکے میں داخل ہوئی جو بے دود شمعوں کی روشنیوں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔

فرش قالینوں سے آراستہ اور ہال ناخمیے کی دیواریں زری کے پردوں سے مزین جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ ایک طرف مندر پر چاندنی کچھی تھی اور اس پر گاد بکھیہ کے سہارے ادھیر عمر کا ایک مجہول سا آدمی نیم دراز تھا۔ عقب میں ڈونڈ مرہٹہ بانڈیاں مورچھل ہلا رہی تھیں۔ چاندبائی دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ یہی مجہول سا شخص ہندوستان کا سب سے بڑا مہاراج دولت راؤ سندھیہ ہے جس نے نعل بادشاہ شاہ عالم ثانی کو اپنی نگرانی میں لے لیا تھا۔ ہر شیار طوائف نادہی پہلی نظر میں یہ بھی بھانپ گئی کہ عورتوں کا رسیا اور ان کی خلوت کا شوقین ہے۔ چاندبائی کو دیکھ کر مہاراج نے بظاہر بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا مگر دل کے اندر ایک عجیب سی پھل مچ گئی تھی۔ درحقیقت آج تک اس کی خلوتوں کو رنگین بنانے والی حسین عورتیں ماہ رنخ کنیزی اور سندھ بانڈیاں ہی ہمیشہ اس کا انتظار کیا کرتی تھیں لیکن آج پہلا موقع

تھا کہ مرہٹہ سلطنت کا بلند اقبال تاجدار خود کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ سندھیانے اضطراب سے
مسند پر پہلو بدلا۔ امبا جی نے آگے بڑھ کر تین بار کوشش ادا کی اور عرض گزار ہوا۔
” مہاراج ایندیل کھنڈ کا چاند حاضر ہے۔“

سندھیانے نگاہ شوق سے دیکھا اور پلک جھپکنا بھول گیا۔ نظارہ جمال ہی ایسا تھا
کہ ہوش اڑے جاتے تھے۔ چاند بانی آداب شاہی کا ہر سلیقہ، ہر قرینہ جانتی تھی۔ ذرا
جھک کر تین بار مجرا پیش کیا۔

ایک بڑے اور پُر جلال حکمران کی طرح سندھیانے کا فرض تھا کہ جذبات پر قابو رکھنے مگر
وہ مسند چھوڑ کر دیوانہ وار آگے بڑھا۔

چاند بانی کے قریب آیا۔ ایک عجیب سی کیفیت میں اسے سر سے پاؤں تک دیکھا
اور یہ ظاہر کرنے کی خاطر کہ اس قیامت کو دیکھ کر وہ اپنے ہوش و حواس کھو نہیں بیٹھا۔
کہنے لگا۔

”سنا کچھ اور تھا، دیکھ کچھ اور رہے ہیں اور جو کچھ سنا تھا وہ اس نظارے کے
مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ آکاش کی اسپرائیں بھی اتنی سندر نہیں ہو سکتیں۔ کیوں امبا جی!
ہم نے غلط تو نہیں کہا؟“

امبا جی سے پہلے چاند بانی نے حسین گردن میں ذرا سا خم پیدا کر کے خالص لکھنوی
انداز میں سلام کیا اور سر بلی آواز میں بولی۔ ” مہاراج کا حسن نظر ہے۔“
سندھیانے صورت کے ساتھ آواز کے جادو سے بھی مسحور ہو گیا۔ ”خوب صورت
ہی نہیں خوش آواز بھی ہو۔“

اب مدارالمہام کو تعریف کی سوجھی۔ ” مہاراج اس چاند کو دل میں چھپالیں کہیں
اندرویتا کی نظر پڑ گئی تو لڑائی مٹن جائے گی۔“

” چنتا نہ کرو امبا جی! ہم اندرویتا کو اپنے رنواس میں نہیں آنے دیں گے۔“
مدارالمہام چاند بانی کے حصول اور اس کی حاضری کو کچھ اور رنگ دینا چاہتا تھا۔
اس نے کتاب ملاقات کا ایک نیا ورق اُلٹ دیا۔

”میں نے چاندبائی کو چھپالینے کی بات بلاوجہ نہیں کی۔ سرکار یہ سن کر حیران بھی اور خوش بھی ہوں گے کہ چاندبائی اپنے دل میں حضور کی لگن رکھتی ہے۔“

یہ بات واقعی حیران کر دینے والی تھی۔ سندھیا بڑی توجہ سے سُننے لگا اور امبا جی نے بتایا۔ ”نواب کریم خاں تو چاند کو بھینچنے پر تیار نہیں تھا۔ طرح طرح کے حیلے بہانے کرتا رہا مگر میں نے مرہٹہ لشکروں کی طاقت اور حضور کی ناراضی کا خوف دلایا تو آخر فیصلہ چاندبائی کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا کہ یہ جانا چاہے تو نواب روک نہیں سکے گا اور اگر کریم خاں کی سرکار میں رہنا چاہے تو اسے مزاحمت کا اختیار ہوگا۔ نواب کو یقین تھا چاند اسے چھوڑ کر نہیں جائے گی اسی لیے مزاحمت کی شرط لگائی تھی لیکن چاند نے ایک ہی فقرے میں بازی اُلٹ دی اور سرکار کی حاضری پر تیار ہو گئی۔ یہ فیصلہ سن کر کریم خاں کو سکتہ ہو گیا۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا دوسرا جاتا تھا مگر آفرین ہے چاندبائی پر کہ پلٹ کر نواب کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اپنے فیصلے پر قائم رہی اور مہاراج کی خدمت میں حاضر ہو گئی۔“

یہ کہانی حیرت انگیز اور ایک حسین عورت کی لگن اور دل چسپی کی ترجمانی کرتی تھی۔ دولت راؤ سندھیا کے دل کا وہ کوارٹھل گیا جو ابھی تک بند پڑا تھا۔ گردن میں حاکمانہ برتری کا ناؤ پیدا ہوا اور پر جوش آواز میں بولا۔ ”چاندبائی نے کریم خاں کو ہماری خاطر چھوڑ دیا ہے تو ہم بھی اسے بڑا مرتبہ دیں گے.....“

”مہاراج کی ذرہ نوازی ہے۔“ چاندبائی نے امبا جی کے ہموار کیے ہوئے راستہ پر قدم بڑھایا۔ مگر میں نے سرکار کی حاضری کے لیے ایک شرط پیش کی تھی فیصلہ ابھی چاہتی ہوں۔“

”کیسی شرط؟“

بات امبا جی نے پکڑ لی۔ ”چاندبائی نے یہاں آنے کی شرط لگائی تھی مہاراج! پھر کیا ہوا؟“

”میں نے وہ شرط سُننے بغیر ہی منظور کر لی تھی۔“

سندھیا کے چہرے پر کچھ تکتا نہ ہوا۔ اپنے پدارالمہام کو چشم حیرت سے دیکھتا ہوا کہنے لگا۔ ”کسی بات کو قبول کرنے سے پہلے سُننا اور سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ سُننے بغیر

ہی شرط منظور کر لینا جو ہے اور جوئے میں جیت کم ہاں زیادہ ہوتی ہے۔
 ”مہاراج نے ٹھیک فرمایا ہے مگر بعض شرطیں سننے بغیر منظور کی جاتی ہیں اور آدمی ہار
 کر بھی جیت جاتا ہے۔“

مہاراج اپنے راج منتری کا یہ عجیب و غریب فلسفہ ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا اس
 نے وضاحت کی ”جب چاندبائی نے کریم خاں کے مقابلے میں مرہٹہ مہاراج پر اندھا بھروسہ
 کر لیا اور اسے چھوڑ کر حضور کی سرکار میں آنا قبول کیا تو میں نے بھی اس کی شرط سننے بغیر ہی منظور
 کر لینا مناسب سمجھی تاکہ نواب کو معلوم ہو سکے کہ بڑے حکمرانوں کے دل اور حوصلے بھی
 بڑے ہوتے ہیں۔“

اس وضاحت میں انٹخارا اور بڑے پن کا پہلو تھا۔ ایک چھوٹی سی ریاست کے
 مقابلے میں مرہٹہ سلطنت کی عظمت و شوکت کا اظہار تھا۔ خود پسند دنیا کو یہ پہلو اچھا
 لگا۔ طبیعت کا تکتہ فوراً دور ہو گیا اور بولا ”تم نے ٹھیک کیا امبا جی! تمہاری جگہ ہم بھی
 ہوتے تو چاندبائی کی شرط سننے بغیر ہی منظور کر لیتے۔“

”مگر مہاراج نے میری شرط کے بارے میں تو ابھی تک کچھ پوچھا ہی نہیں۔“
 ”اب پوچھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔“ پھر سندھیا کہنے لگا۔

”چاندبائی! ہم راج ہمتی کے معاملے میں تو کوئی غلطی کر سکتے ہیں مگر عورت کو سمجھنے میں
 کبھی غلطی نہیں کرتے۔ تم کیا چاہتی ہو، کیا تمہیں چاہتی اس کے بارے میں کہنے سننے سے کیا
 حاصل پس یہی بہت ہے کہ تم نے ہماری خاطر نواب کریم خاں کو چھوڑ دیا اور ہمارے کندھوں
 پر یہ ذمے داری ڈال دی ہے کہ تمہارا اتان نہ ہونے دیں۔“

چاندبائی کے چہرے پر فکر و تشویش کے سائے کچھ اور گہرے ہو گئے۔ نہ جانے مرہٹہ مہاراج
 اس کی آمد کو کیا معنی پہنارہا تھا اور وہ اسے کیا سمجھانا چاہتی تھی۔ بہر حال دل میں کوئی ایسا ضمنی
 ضرور پہنارہا تھا جس کا اظہار پہلی ہی ملاقات میں ضروری سمجھتی تھی اور سندھیا وہی بات سننے
 سے کترا رہا تھا۔ اس نے پہلی نظر میں جس حکمران کو جہول سا آدمی سمجھ لیا تھا اب ایک چالاک
 شاطر دکھائی دینے لگا اور وہ حیران تھی کہ اپنا مدعا کیسے بیان کرے۔ سندھیا کی طرح عورت

کو سمجھنے کا دعویٰ تو ہر شخص کرتا ہے مگر سمجھ کوئی نہیں پاتا۔ آخر کچھ سوچ کر بول۔
 ”اگر مہاراج سنے بغیر ہی عورت کے دل کا بھید جان لیتے ہیں تو ضرور آپ کے پاس

کوئی جادو ہوگا۔“

سندھیابے ساختہ تہقیر مار کر منہس دیا۔ یہ تہقیر بڑا عجیب اور وحشت انگیز تھا بالکل یوں لگا جیسے کوئی گھوڑا ہنہتا دیا ہو۔ چاند بانی اسے کوئی معنی نہ پہناسکی۔ منہسی تھمی تو ہاتھ لہرا کر کہنے لگا۔ اس بات پر حیران ہو کہ تم نے شرط بیان نہیں کی اور ہم تمہارا مطلب سمجھ گئے ہیں۔ مگر تمہارے دل کی بات تو امبا جی بھی جانتے ہوں گے۔ یہ لفاظی دیکھ کر خط کا مضمون بجا پ لیتے ہیں۔ کیوں امبا جی!

”مہاراج کی دیا ہے جو مجھے اس قابل سمجھتے ہیں۔“

”تو بتا سکتے ہو وہ کون سی شرط ہوگی جسے تم نے سنے بغیر ہی منظور کر لیا تھا؟“

مریٹہ مدار المہام کے ماتھے کی کیریں کپھ اور گہری ہو گئیں۔ اس نے راج دربار میں کئی اچھے ہوئے معاملے سلجھائے تھے۔ کئی مشکلیں حل کی تھیں۔ مگر یہ معاملہ کچھ مختلف ورٹیرھا تھا۔ حسن اور عشق کی آنکھ بھولی تھی اور وہ ڈرتا تھا کہیں زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو مہاراج کو ناراض کر دے۔ سوال کی گروہ بڑی ہوشیاری سے کھولتا ہوا بولا۔

”مہاراج! چاند بانی چھوٹی سرکار سے بڑی سرکار میں آئی ہے مگر لوٹ کا مال بن کر نہیں۔ اگر ہم زبردستی اٹھلاتے یا نواب سے لڑائی ہوتی تو جو سلوک چاہتے کرتے مگر اپنی مرضی سے آئی ہے تو چاہتی ہے کہ سلوک بھی اس کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیے۔“

سندھیابے کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”کیوں چاند بانی! امبا جی نے غلط تو نہیں کہا؟“

”مضمون تو بے شک یہی ہے سرکار! مگر الفاظ کچھ بدل گئے ہیں۔“

”پھر ہم اجازت دیتے ہیں۔ تم اپنا مضمون اپنے ہی الفاظ میں بیان کرو۔“

چاند بانی نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک ادا کے ساتھ تسلیم بجالائی اور بولی۔ ”مٹہ چھوٹا اور بات بڑی ہے ڈرتی ہوں اگر مہاراج ناسا ہو گئے تو میری زندگی تاریک ہو جائے گی۔“

”ہم ناراض نہیں ہوں گے چاند بانی :

اس فقرے سے چاند بانی کا حوصلہ بڑھا اور اپنی شرط کو الفاظ کا جامہ پہنا ہی کہنے لگی۔ مہاراج کو چین دینا ہو گا کہ مذہب، سماج اور اخلاق کی شرط پوری کیے بغیر مجھے کسی تعلق پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ مجھ کو ہر عورت نہیں بیچتی۔ سرکار بدلی ہے بیان نہیں بدلا۔“

ایک طوائف زادی کی زبان سے جو چار سال تک نواب کریم خاں کی تفریح کا کھلونا بنی رہی۔ یہ الفاظ سن کر دولت راؤ سندھی آدم بخود رہ گیا۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا وہ ایسی لڑکی شرط لگائے گی کہ کوئی اسے چھو بھی نہ سکے۔ اس کا خیال تھا زیادہ سے زیادہ انعام طلب کرے گی۔ بڑے سے بڑا مرتبہ چاہے گی جو اس جیسی حسین عورت کو راج رنواس میں مل سکتا ہے۔ مگر چاند بانی نے اپنی شرط بیان کر کے اسے ایک زنجیر میں جکڑ دیا تھا جس میں ہندوستان کی تہذیب بندھی ہوئی تھی۔ یہ پابندی قطعی خلاف توقع تھی۔ مہاراج کا دماغ سننا کر رہ گیا۔ بے دھیانی میں ایک قدم پیچھے ہٹا تو یوں محسوس کیا جیسے گوالیار کا تخت بھی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا ہو۔ مگر دارالمہام امبا جی کے چہرے پر ایک خوشگوار تبدیلی نظر آرہی تھی جیسے من کی مراد برآئی ہو۔ ”وہن باو ہے چاند بانی! تم نے مہاراج کے سامنے ایسی شرط رکھی ہے جس پر ہندوستان کی ہر عورت فخر کر سکتی ہے۔ جھگوان نے تمہیں سند ہی نہیں بتایا۔ بات کرنے کی شکستہ بھی دی ہے۔ تمہیں عورت کی عزت و آبرو کا شواہد ہے۔ مہاراج ضرور تمہارے شواہد کا پالنہ کریں گے۔“

امبا جی چاہتا تھا۔ مہاراج کو اس شرط کا پابند کر دیا جائے۔ مہارانی بیجا بانی کا غرور توڑنے کی فکر میں تھا اور چاند بانی کا حسن و شباب مہاراج سندھی کے دل و دماغ سے اس کی حسین لہروں کو محو کر سکتا تھا۔ اسے یہ علم نہ تھا مرتبہ حکمران کیا سوچ رہا ہے، کس ادھیڑ بکن میں ہے۔ وہ چاند بانی کو ایک کنیر سے بڑھ کر کوئی مرتبہ و مقام دینے پر آمادہ بھی ہو گا یا نہیں مگر امبا جی نے اس کی شرط کو جو معنی پہنائے، ان کا مقصد ہی تھا کہ چاند بانی کے معاملے پر کسی اور پہلو سے غور کیا جائے۔ دوسرے لمحے وہ مہاراج سندھی کا جواب سن کر دنگ رہ

گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”امبا جی! ہم نے چاند بانی کو کسی اور مقصد کے لیے طلب کیا تھا، مگر اس کی شرط سن کر ہمارا وچار بدل گیا ہے۔ گنگا کی سوگند! جس عورت نے نواب کریم خاں کی سرکار چھوڑ کر ہم پر وشواس کر لیا ہے۔ ہم اس کے ساتھ وشواس گھاٹ نہیں کریں گے۔“

یہ جواب امبا جی کی مرضی کے عین مطابق تھا۔ دولت رٹو سندھیا ایسے ہوں پرست مہاراج کی یہ تبدیلی حیرت انگیز تھی۔ محبت کی بساط پر اگر کریم خاں کی بازی پٹ گئی تو بہاں بھی نقشہ بدل گیا تھا اور چاند بانی اپنی شرط کے خانے میں کھڑی سندھیا کو ”شہ مات“ دے رہی تھی۔ مہاراج نے اس کی گرتی ہوئی ذات کو سہارا دیا اور ایسا مرتبہ بخش دیا تھا جس کی شاید وہ خود توقع نہ رکھتی تھی۔ اس نے فرط مسرت میں جھک کر سلام کیا اور پورا اعتماد لہجے میں بتلی۔

”مہاراج نے گنگا کی سوگند کھا کر وچن دیا ہے تو مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“

”نہیں چاند بانی! کوئی اور خواہش بھی ہو تو بیان کرو۔“

”جو کچھ چاہتی تھی مل گیا، البتہ ایک گزارش اور ہے اگر حضور برائے منائیں۔“

تو عرض کر دوں۔“

”ہمارا خیال ہے تم کوئی ایسی بات کر دو گی ہی نہیں جو ہمیں بُری لگے۔“

”صرف یہ چاہتی ہوں مہاراج! نواب کریم خاں کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہ کیا جائے۔ جو ورق اُلٹ آئی ہوں اُسے پلٹنا نہیں چاہتی۔“

”یہ تو تم نے ہمارے مطلب کی بات کہہ دی۔ ہم بھی نواب کا ذکر پسند نہیں کرتے۔“

”نواب میرے لیے کیا حکم ہے؟“

سندھیا نے فوراً مورچھل بردار باتدیوں کی طرف ہاتھ لہرا دیا۔ ”شوہجا، ساوتری! چاند بانی کو آرام گاہ میں پہنچا دو اور اس کے آرام کا خیال رکھو۔ یاد رہے تم نے جو کچھ دیکھا ہے جو کچھ سنا ہے کسی اور سے اس کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔ مہاراجی بیجا بانی سے بھی نہیں۔“

مہاراج کا حکم سنتے ہی دونوں باتدیوں نے سر جھکا دیا اور سندھیا نے چاند بانی

کو اشارہ کیا وہ ان کے ساتھ جائے۔ چاند نے مہاراج کو خیر خیر سلام کیا اور کچھ اچھٹکاتی

باندیوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ سندھیا اور امبا جی کھڑے اُسے جاتے دیکھتے لگے۔ اس کی رفتار میں بھی ایسا وقار تھا کہ شہزادیوں اور راجکمار یوں کو بھی نصیب نہیں ہوا ہوگا۔ پاؤں کی انگلیوں میں چاندی کے پھوسے کی 'چھنک چھنک' جادو جگا رہی تھی۔ پُرقار انداز میں چلتی اور ہر قدم پر جادو پھونکتی وہ خیمہ خاص کے عقبی دروازے سے نکل گئی۔ تھوڑی دُور تک پھوسے کی موسیقی جلت رنگ کی طرح سُنائی دیتی رہی۔ جب یہ آواز بتدریج دُور ہوتی خاموشی میں ڈوب گئی تو سندھیا اس کی رفتار کے جادو سے چونکا اور اپنے مدارالمہام سے مخاطب ہوا۔

’کیوں امبا جی! ہم نے چاند بانی کو وچن دے کر کوئی غلطی تو نہیں کی؟‘
 ’غلطی کیسی مہاراج! آپ نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ آنے والے لوگ آپ کو عزت سے یاد کریں گے۔ کہیں گے چاند بانی کے پاس حُسن تھا اور مہاراجہ سندھیا کے سینے میں عورت کو سمجھنے والا دل۔ آپ نے عورت کا مان رکھا اور اپنی شان بڑھائی ہے۔‘

ان الفاظ نے دولت راؤ سندھیا کو ایک عجیب سی تسکین دی جس کی وہ ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ کہنے لگا: ’ہم کچھ اور بھی سوچ رہے ہیں امبا جی! پھر کہتے کہتے یک بخت خاموش ہو گیا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا اور کہتے ہوئے ہچکچا بھی رہا تھا۔ کیا خبر راج منتری اس کے خیال سے اتفاق کرے یا اس کی بات کو آشفٹہ خیالی سمجھ کر متروک کر دے۔ اس ضمن میں اس نے اچانک چپ سا دھلی۔

’کیا سوچ رہے مہاراج؟‘ راج منتری نے قوجہ دلائی۔

’معلوم نہیں ہمارا خیال درست بھی ہے یا نہیں؟‘

’آپ اظہار تو کریں۔ شاید میں کوئی مشورہ دے سکوں۔‘

سندھیا نے جرات کا مظاہرہ کیا۔ ’ہمیں بہت عرصہ سے ایک ایسی عورت کی تلاش ہے امبا جی! جو مرد کی غیرت اور عورت کی عزت کو سمجھتی ہو۔ ہمیں جیون کا سکھ دے سکے۔ ہم سمجھتے ہیں چاند بانی میں یہ نوعی موجود ہے۔‘

امبا جی مہاراجہ کی زبان سے وہ الفاظ سن کر جن کا اظہار دراصل خود کرنا چاہتا تھا۔
 خوشی سے جھوم اُٹھا۔ یہی تو چاہتا تھا مہاراجہ چاند بانی کو ایسا مرتبہ عطا کر دے کہ گوالیار
 کے راج محلوں میں مہارانی بیجا بانی کا ستارہ غروب ہو جائے۔ تڑپ کا بولا۔ "آپ نے
 میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔ میں خود سرکار کو یہی مشورہ دینے والا تھا کہ حسن کے چاند
 کو اگر بدیل کھنڈ کے آسمان سے توڑا ہے تو اسے گوالیار کے راج محل میں چمکنا چاہیے اور
 مہاراج! عورت بیوی ہوتی ہے یا محبوبہ! اس کی تیسری کوئی حیثیت نہیں۔ اگر ہے تو
 عورت کی ذات کے لیے ذلت اور تنگ ہے۔ نواب کریم خاں نے چاند بانی کو یہی تیسری
 حیثیت دی۔ بیوی کی بجائے داشتہ بنا کر رکھا۔ اسی لیے اس نے نواب سے تعلق توڑ لیا۔ آپ
 نے چاند بانی کو جو دہن دیا ہے اس کے مطابق اسے صرف بیوی اور دھرم پتی بنا سکتے ہیں۔
 محبوبہ یا داشتہ نہیں۔"

سندھیا سوچ کے بھنور سے اُبھرا۔ "اسی بات نے ہمیں پریشان کر دیا ہے امبا جی!
 سوچتے ہیں چاند بانی کو اپنے پاس رکھیں یا واپس کر دیں؟"
 "اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے، آپ بیاہ کر سکتے ہیں۔"
 "راجپوت اور مرہٹہ سردار ہمیں طعنہ دیں گے کہ طوائف زادی کو بیوی بنا لیا۔"
 امبا جی نے لونا گرم دیکھ کر ضرب لگائی۔ "گستاخی کے لیے شہما چاہتا ہوں مہاراج
 ہمارے راج میں کتنے ہی راجپوت اور مرہٹہ سرداروں کی حویلیوں میں طوائفیں آباد ہیں۔ ہندوستان
 کا وہ کون سا راجہ، مہاراجہ اور نواب ہے جس کا دل کسی طوائف کی زلفوں کا اسیر نہیں ہوا۔ پھر
 چاند بانی طوائف نہیں طوائف زادی ہے جسے نواب کریم خاں کی سرکار اور ادھ کی تہذیب
 نے ایک نیا روپ دیا ہے۔ علیگرہ کے مہموں میں پل کر جان ہوئی ہے۔ بدیل کھنڈ کے
 جنگلوں کی ہواؤں نے اس کے حسن کو نکھارا ہے۔ گفتگو کرتی ہے تو دل کٹھی میں بند کر
 لیتی ہے اور کٹھی کھولتی ہے تو دل اڑنے لگتا ہے۔ اس سے بہتر جیون ساتھی کہاں ملے گا؟
 "تو تم بھی یہی چاہتے ہو ہم چاند بانی کو راج رنواس میں شامل کر لیں۔ اُسے
 اپنی دھرم پتی بنا لیں؟"

” مہاراج کی بہت سی پریشانیوں کا یہی علاج ہے۔ چاند بانی رنواس میں نخل ہو گئی تو نت نئی باتیں کرنے والی رانیوں کی زبانیں گنگ ہو جائیں گی جن کی فرمائشیں پوری کرتے کرتے آپ تنگ آجاتے ہیں۔ مہاراجی بیجا بانی چاند کو دیکھے گی تو اپنی چمک دمک بھول جائے گی۔ جو ہر وقت کسی نہ کسی معاملے میں سرکار سے نوک جھونک کرتی رہتی اور کوئی نہ کوئی نیا بکھیرا کھڑا کر دیتی ہے۔“

مہاراج حیران سا ہو کر رہ گیا۔ ”امبا جی! تم یہ سب باتیں جانتے ہو؟“

”یہ باتیں تو راج دربار کے بھی سردار جانتے ہیں اور ان میں عجیب عجیب سرگوشیاں بھی ہوتی ہیں۔ راج منتری ہونے کے ناتے میرا فرض ہے کہ مہاراج کے آرام کا خیال رکھوں تاکہ وہ وقت جو رنواس کے فضول بکھیڑوں میں ضائع ہو جاتا ہے راج ریتی کے کاموں میں صرف ہو اور مرہٹہ سلطنت ایک بار پھر وہی شان و شوکت حاصل کر لے جو اسے پہلے حاصل تھی۔“

”مرہٹہ سلطنت کے بارے میں ہم بھی یہی سوچتے ہیں لیکن رنواس کے جھگڑوں نے ہمیں پریشان کر دیا ہے۔“

”چاند بانی آپ کے جیون کا برا اندھیرا دور کر دے گی۔“

”ہم گویا راجتے ہی پنڈتوں سے مہورت نکلوائیں گے کہ ستاروں کی چال چاند بانی کے بارے میں کیا حکم لگاتی ہے مگر.....! نندھیکے چہرے پر کسی نئی پریشانی نے سایہ ڈال دیا۔“

”ہمیں دو آدمیوں کی طرف سے دھڑکا ہے۔“

”کون سے دو آدمی؟“

مہاراج نے فکر مند لہجے میں بولا۔ ”ایک تو سرجی راؤ گٹھلی ہے۔ بے شک وہ ہمارا مددگار نہیں رہا مگر سسر تو ہے۔ کہیں راجپوت سرداروں کو ہمارے خلاف بغاوت پر آمادہ نہ کر دے۔“

”پتا ہوا مہرہ ہے مہاراج! بیٹی کے سوا کوئی راجپوت سردار اس کا ساتھ نہیں دے گا۔“

”یقین سے کہتے ہو۔“

”اپنے حریف کو کون نہیں جانتا۔ سرجی راؤ کو بھول کر دوسرے آدمی کا نام بتائیں۔“

”دوسرا آدمی ہم سے دور نہیں۔ روہیلہ پٹھان نواب کریم خاں! ہم نے چاند بانی سے بیاہ کر لیا تو کیا خبر افرنگی سے سمجھوتہ کر کے ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر دے۔“

”کریم خاں جنگل کے بھیڑیوں سے دوستی کر سکتا ہے مہاراج! انگریزوں سے کسی حالت میں سمجھوتہ نہیں کرے گا۔“

”مگر انتقام کے جوش میں ہمارے خلاف پنڈاروں کو تو جمع کر سکتا ہے۔ اگر نواب چیتو اپنے لشکر لے کر اس کے جھنڈے تلے آگیا تو پنڈاروں سے نمٹنے کے لیے ہمیں اپنی پوری طاقت استعمال کرنی پڑے گی۔ حالانکہ ہم اپنی پوری طاقت صرف انگریزوں کے مقابلہ کے لیے جمع رکھنا چاہتے ہیں۔“ وہی دولت راؤ سندھیا جو تھوڑی دیر قبل سند پر بیٹھا ہوا ایک مجہول سا آدمی نظر آیا تھا اس وقت سیاسی شاطروں اور فوجی ماہروں کو حیران کر دینے والی فراست کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی ایک انگلی سے جیسے فضا میں ایک لکیر سی کھینچ دی اور کہا۔ ”چیتو کا کریم خاں سے مل جانا قیامت سے کم نہ ہوگا دونوں مل کر ہماری سلطنت پر موت کی لکیر کھینچ دیں گے۔“

”چیتو آپ ہی کا بنایا ہوا نواب ہے کیا وہ بھی مہاراج کے خلاف تلوار اٹھا گا؟“

”لوگوں کی وفاداریاں بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔“

کچھ سوچ کر امبا جی نے ایک نیا پہلو نکالا۔ ”مہاراج نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا۔ چاند بانی نے نواب کریم خاں کو خود چھوڑا ہے اور حیب کوئی عورت کسی مرد کو چھوڑے آئے تو اس کی آدھی بہت ٹوٹ جاتی ہے۔“

”تم بھی شاید بھول گئے، روہیلہ نواب سیاست دان نہ سہی غیرت مند ضرور ہے اپنی ٹوٹی ہوئی بہت کے ساتھ وہ اس وقت تو مرہٹہ لشکروں کے سامنے خاموش رہے گا مگر ہمارے لوٹتے ہی کنچلی اتار کر پھینک دے گا اور پنڈاروں کے لشکر اکٹھے کر کے ہم سے بدلے گا۔ پٹھان کی توہین کی جائے تو کبھی نہیں بھولتا پھر کریم خاں اس وقت پنڈاروں کی امید کا ستارہ ہے وہ اس کی خاطر اپنی جانیں لٹا دیں گے۔“

مدارالمہام نے حالات پر غور کیا تو تسلیم کرنا پڑا کہ مہاراج کے اندیشے بے معنی اور

اور خطرے بے وجہ نہیں۔ سندھیا کو تجربے ہی نے اتنا محتاط بنا دیا تھا کہ ہر قدم پھونک کر اٹھاتا تھا۔ خیمہ خاص میں چند لمحے خاموشی رہی پھر امبا جی کہنے لگا۔ ”ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے مہاراج! جس سے بگڑی بات بن سکتی ہے۔“

”ترکیب بیان کرو، ہم غور کریں گے۔“

”کریم خاں کو اپنی آنا دی سب سے عزیز ہے مہاراج کو یاد ہو گا اس نے اپنی آزادی کو مرٹوں سے دوستی کی شرط قرار دیا تھا۔ کیوں نہ نواب کے زخموں پر مرہم لگانے کے لیے اسے آزادی کا فرمان دے دیا جائے۔ پنڈارے خوش ہو کر چاند بانی کو بھول جائیں گے۔“

سندھیا نے اس تجویز کے ہر پہلو پر غور کیا۔ پنڈاروں کی آزادی کے جس فرمان سے اپنا دامن چھڑانا چاہتا تھا۔ وقت کی مصلحت اسی کے حق میں فیصلہ دے رہی تھی۔ امبا جی نے غلط نہیں سوچا تھا۔ چاند بانی کی جدائی اور بے وفائی کا زخم اٹھانے والا نواب اپنی آزادی کا فرمان حاصل کر کے خوش ہو جاتا کہ اگر مرہم مہاراج نے اس کی محبت چھین لی تو اس کے عوض آنا دی بخش دی ہے۔ اچانک مہاراج نے حکم دیا۔

”امبا جی! نواب کریم خاں کو اسی وقت پیغام بھیج دو کہ آکر آنا دی کا فرمان لے جائے ہمارے راجپوت اور مرہم سرداروں کو بھی طلب کرو۔ ہم ان کی موجودگی میں کریم خاں سے معاملے کریں گے۔“

سندھیا اس وقت ہندوستان کا ایک پُر جلال حکمران نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے کاہلی اور جہالت کے تمام سائے یک لخت غائب ہو گئے تھے جنہیں دیکھ کر بعض آدمی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے تھے کہ وہ حکومت اور محبت کے بارے میں اپنی کوئی رائے نہیں رکھتا اور صرف دوسروں کے مشوروں پر عمل کرتا ہے مگر اس وقت اس کی آنکھوں کے گوشوں سے جھانکنے والی چمک کچھ اور کہہ رہی تھی۔



نواب کریم خاں روہیلہ محبت کی بازی ہار کر، دل کی دنیا لٹا کر اپنے خیمے میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اگر بلگیم کے مشورے پر عمل کرتا اور چاند بانی کو ساتھ لے کر نہ آیا ہوتا تو یہ صورت حال پیش نہ آتی اور دل پر وہ بجلی نہ ٹوٹتی جس نے سب کچھ جلا کر رکھ کر دیا تھا۔ پنڈاروں نے نواب کے خیمہ کے باہر مرہٹہ سواروں کی نگرانی میں ایک پالکی اٹھتی ہوئی ضرور دیکھی تھی، مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا، پالکی کس کی اٹھتی، کون آیا، کون گیا، کچھ جانتے تھے تو نواب کے محافظ سپاہی جو پرے پر متعین تھے۔ خیمہ خاص کے چوہدر اور خادم جنہوں نے چاند بانی کو پالکی میں بیٹھے اور مرہٹہ سواروں کی حفاظت میں خیمہ دُرخ گاہ سے نکلتے دیکھا تھا مگر انہیں بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ کسی سے چاند پر گہن لگ جانے کا ذکر نہ کریں۔ پنڈارے اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ خیمہ خاص سے پالکی نہیں نواب کریم خاں روہیلہ کی حسرتوں کا جنازہ اٹھا ہے۔ اگر جانتے کہ امباہی کی سرکردگی میں مرہٹہ سواروں نے شب خون مارا ہے تو شاید وہ بھی سندھیا کے خیموں سے کچھ ستارے تو ڈلاتے۔ کریم خاں کے پنڈاروں میں روہیلے پٹھانوں کی اکثریت تھی جو ترازو کے پلڑے برابر رکھنا جانتے تھے لیکن نواب نے اپنی تباہی کو چھپانے ہی میں مصلحت سمجھی۔ خیمہ خاص کے اندر نواب کا نائب خاص نامدار خاں اس سے بھی کچھ زیادہ بے چین اور مضطرب نظر آتا تھا۔ شمعوں کی روشنی میں دونوں کے چہروں پر گزرنے والی تحریروں صاف پڑھی جاتی تھیں۔ وہ مسند جہاں کچھ دیر پہلے بساط بچھی تھی۔ شطرنج کے ٹرے پڑے تھے، اب صاف تھی کیونکہ بازی ختم ہو چکی اور نواب خود کو ہار بیٹھا تھا۔ رات کے پہلے پہر ہی اس کی دنیا اُجڑ گئی تھی۔ باہر چاندنی کھیت کر رہی تھی اور اس چاندنی میں پنڈارے راگ رنگ کی محفلیں سجائے بیٹھے تھے۔ کسی جگہوں سے ہاؤ ہو کی آوازیں اُٹھ رہی تھیں مگر نواب کا خیمہ اپنے چاند سے محروم ہو چکا تھا اور خیمہ کے روزنوں سے نظر آنے والی چاندنی اس کے قلب و ذہن کو سانپ بن کر ڈسے جا رہی تھی۔ اس نے سلتے والے روزن سے نظر ہٹائی اور

بے جان سے قدموں سے چلتا کرسی پر آکر ڈھیر ہو گیا۔ نامدار خاں! کچھ نہیں سوچتا، ہم کیا کریں؟ — سوچنے کو تو بہت کچھ سوچتا ہے مگر آپ اجازت نہیں دیں گے۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”غیرت کا تقاضا ہے کہ ہم بھی مرہٹوں کے ساتھ آنے والی عورتوں کو لوٹ کا مال سمجھ لیں۔“

”معاملہ سندھیا کی لوٹ کا نہیں، چاند بائی کی بے وفائی کا ہے۔ اگر وہ جانے سے انکار کر دیتی تو ہمیں مزا سمیت کا حق مل جاتا۔“

”آپ نے چاند بائی کو توبے وفا کہہ دیا مگر خود اس کے ساتھ کون سی وفا کی ہے؟“

”نامدار خاں! نواب غصے میں تڑپ اٹھا، شاید تم اپنے الفاظ کا مطلب خود بھی نہیں سمجھے۔“

”اپنے الفاظ کا مطلب سمجھتا ہوں اور سمجھانا چاہتا ہوں۔“

نواب نے حیرت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ہماری وفا پر الزام دینے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ ہم نے چاند کو بھوپال کی شہزادی سے کم درجہ نہیں دیا تھا۔

”معاف کیجئے نواب صاحب! درجہ توبے شک دیا مگر اسے اپنی عزت نہیں سمجھا اگر سمجھا ہوتا تو امبا جی کو انہی قدموں واپس کر دیتے۔“

”ہم نے تو فیصلہ چاند بائی کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔“

”اس کا یہ مطلب ہے آپ کی اپنی مرضی کوئی نہ تھی۔“

نواب اپنے نائب کا یہ استدلال سن کر دنگ رہ گیا۔ دل کو کوئی شے کاٹتی ہوئی گزر گئی۔ غلطی کا احساس ہوا اور نامدار خاں نے مزید چرکا لگایا۔ عورت کو صرف عزت نہیں دی جاتی، اس کی حفاظت بھی کی جاتی ہے۔ جب چاند کو معلوم ہوا کہ آپ اس کی حفاظت سے دامن بچارہے ہیں، ہمت ہار چکے، مروانگی چھوڑ بیٹھے ہیں تو اس نے بھی ہرے تبدیل کر دیئے اور امبا جی کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ اگر آپ نے مرہٹے کو صاف جواب دے دیا ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ نہ جانے خود چاند بائی کے دل پر کیا بیت رہی

ہوگی۔

نامدار خاں نے جس انداز میں واقعہ کا تجزیہ کیا وہ سراسر نواب کو مجرم قرار دے رہا تھا۔ اگر کسی اور نے گفتگو کا یہ پہلو اختیار کیا ہوتا تو شاید کریم خاں تلوار کی زبان سے جواب دیتا مگر اب خود کٹ کر رہ گیا اور محسوس کر رہا تھا کہ غلطی اسی سے سرزد ہوئی ہے۔ چاند کو اپنی محبوبہ کا درجہ دیا تھا تو اس کی حفاظت بھی خود کو کرنی ضروری تھی۔ پریشان سا ہو کر کرسی سے اٹھا اور نائب کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ نامدار خاں! ہم اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کا تدارک چاہتے ہیں۔ کوئی ترکیب بتاؤ کہ ہم چاند کو واپس لا سکیں۔

ٹھیک اسی وقت سچو بدار نے حاضر ہو کر اطلاع دی کہ مرہٹہ سردار شوویشپ راؤ مہاراجہ سندھیا کا ضروری پیغام لے کر آیا اور حاضری کا طلب گار ہے۔ کریم خاں امباچی کے بعد شوویشپ راؤ کی آمد کا ذکر سن کر پریشان ہو گیا۔ نہ جانے مہاراجہ نے اور کیا فرمائش کر دی ہو۔ نامدار خاں سے کہا وہ مرہٹہ سردار کا استقبال کر کے اپنے ساتھ اندر لے آئے اور خود پلٹ کر کرسی پر آ بیٹھا۔ شوویشپ راؤ حاضر ہو کر ابھی کورنش ہی ادا کر رہا تھا کہ نواب ناگوار سے لہجے میں بولا۔ شوویشپ راؤ! کیا مہاراجہ سندھیا سارے پیغامات آج ہی پہنچانا ضروری سمجھتے ہیں، کوئی پیغام کل کے لیے بھی اٹھا رکھتے۔

”کل مہاراجہ یہاں سے لوٹ جانا چاہتے ہیں۔ شوویشپ راؤ نے وضاحت کی اسی لیے انہوں نے مجھے اس وقت بھیجا اور پیغام دیا ہے کہ آپ خود آ کر آنا دی کا فرمان جائیں مہاراجہ واپسی سے پہلے پنا وعدہ پورا کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے تمام سرداروں کو بھی طلب کر لیا ہے تاکہ آپ کے ساتھ جو معاملہ طے ہو اس کے گواہ رہیں۔“

یہ پیغام سن کر نواب کی نبضوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اسے آزادی سے عشق تھا۔ اسی شرط پر مرہٹوں سے دوستی کا عہد کیا تھا کہ مہاراجہ اسے ایک آزاد و خود مختار حکمران کی حیثیت میں تسلیم کر لے۔ دولت راؤ سندھیا نے اس سے ایک حسین ترین شے چھین لی اور ایک عزیز ترین شے دے رہا تھا۔ نواب نے یہ سوچ کر کہ شاید چاند بانی کے بارے

میں بھی گفتگو کا موقع ملے اور اس کی واپسی کی کوئی صورت نکل آئے۔ مرہٹہ سردار کو جواب دیا
 "شویشپ راؤ ہم خود مہاراج سے ملنے کے لیے بے چین ہیں۔ انہیں جا کر کہہ دو کہ عاضری
 میں دیر نہیں لگائیں گے۔"

شویشپ راؤ سلام کرتا ہوا خیمے سے نکلا اور مرہٹہ سواروں کے ہمراہ جو اس کے
 ساتھ آئے تھے، اپنی لشکرگاہ کو لوٹ گیا۔ نواب نے اسی وقت صفدر خاں کو دوڑایا کہ پندار
 سرداروں کو بلا لائے۔ وہ بھی اپنے سرداروں کی معیت میں شانِ شوکت کے ساتھ مہاراجہ سے
 بلنا چاہتا تھا۔ نامدار خاں نے توجہ دلائی "رات کا بلا واسطہ ہے۔ کہیں مہاراجہ نے کوئی وام نہ
 بچھایا ہو۔"

"بندیل کھنڈ کی سرزمین پر ہمارے لیے وام بچھانا موت کو دعوت دینا ہے۔ ہم
 اپنے سرداروں کو ساتھ لے کر جائیں گے۔"

"مگر میں آپ کے ساتھ نہ جاسکوں گا۔"

"کیوں؟" نواب کی پیشانی پر ناگواری کی شکن پڑ گئی۔

"ممكن ہے چاند بانی بھی مہاراجہ کی عاضری میں ہو۔ میں اسے مرہٹہ خیموں میں
 چھوڑ کر واپس نہیں آسکوں گا۔"

"ہم نے بھی رات کا بلا واسطہ لیے قبول کر لیا ہے کہ آزادی کے فرمان کی بات بعد
 میں اور چاند بانی کی واپسی کی شرط پہلے ہوگی۔"

ابھی نامدار خان کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چند پندارہ سردار ایک سانچہ داخل ہوئے
 اور ان کی گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ نواب اپنے سرداروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر تھوڑے
 تھوڑے وقفہ کے ساتھ مزید لوگ آتے رہے اور چند ہی لمحوں میں کریم خاں کا خیمہ بندیل کھنڈ
 کے چلتیوں سے بھر گیا۔ رات کے وقت عاضری یقیناً کسی اہم واقعے کا پیش خیمہ تھی۔ سب
 لوگ جاننا چاہتے تھے کہ کون سی نئی بات ظہور میں آئی ہے۔ نواب نے بتایا: "مہاراجہ بندوبست
 نے آزادی کا فرمان دینے کے لیے ہمیں رات کو اس لیے طلب کیا ہے کہ صبح وہ گوالیار کی طرف
 کوچ کر جائے گا اور چاہتا ہے کہ جانے سے پہلے ہماری دوستی پر مہر تصدیق ثبت کر دے۔"

صرف ایک واقعہ کے علاوہ جس نے ہمیں تکلیف پہنچائی ہے ہمارے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ رہا ہے اور کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس سے شبہ ہو کہ وہ دھوکا یا فریب کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے ہم نے رات کا بلاوا قبول کر لیا ہے۔ آپ سب لوگ ہمارے ساتھ جائیں گے۔

”نہیں حضور! سب لوگوں کا جانا مناسب نہیں ہوگا۔ ایک سردار نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر ہمارا جہ آزادی کا فرمان دے کر دوستی کا پیمانہ مضبوط کرنا چاہتے ہیں تو بھی کچھ سردار شکرگاہ میں رہنے چاہئیں۔“

سب لوگوں نے اس بات کی تائید کی اور فیصلہ ہوا کہ نامدار خاں نصف سرداروں کے ساتھ شکرگاہ ہی میں موجود رہے گا۔ جنپ نواب کریم خاں مرہٹہ خیموں کی طرف روانہ ہوا تو اس کی معیت میں پندرہ پندارہ سرداروں کے علاوہ خاصہ کے سواروں کا رسالہ بھی مارچ کر رہا تھا۔ جس نے پندارہ ریاست کے قیام میں بہادری کے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے تھے۔



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ دستور شروع ہی سے چلا آتا ہے کہ بڑے حکمران چھوٹے حکمرانوں کو حکومت و فرمانروائی اور خود مختاری کی سند دیتے آئے ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی میں دولت آباد سندھیا وسطی اور شمالی ہند میں بڑی اہم حیثیت کا مالک بلکہ مغلوں اور انگریزوں کے بعد اسی کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ کریم خاں روہیلہ کی بہادری اور خود سزی نے بندیل کھنڈ میں ایک آزاد ریاست توفیر و قائم کر لی تھی لیکن اس وقت تک باقاعدہ حکمران نہ بن سکتا تھا۔ جب تک نعل، انگریز یا مرہٹہ طاقت میں سے کوئی اسے تسلیم نہ کرے۔

کریم خاں کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہی تھا کہ مہاراجہ سندھیا کی خوشنودی اور حکومت و فرمانروائی کی سند حاصل کر لے تاکہ باقاعدہ ہندوستان کے والیان ریاست میں شمار ہو سکے۔

چاندنی رات میں جو روہیلے کے دل کوڈس رہی تھی اور فرمان آزادی کا مژدہ بھی سنا رہی تھی جب وہ اپنے پنتارہ سرداروں اور دستہ خاص کے سواروں کے ہمراہ ایک حکمران کی سی شان کے ساتھ مرہٹہ شکرگاہ میں پہنچا تو مدارالمہام امباہی نے اسی طرح پرتپاک استقبال کیا جیسے خود مختار حکمرانوں کا کیا جاتا ہے۔ مرہٹہ دربار کے باہر جہاں وہ دن کے وقت بھی آچکا تھا شعلیں روشن تھیں اور چاق و چوبند سپاہی بھالے اٹھائے چاروں طرف پہرہ دے رہے تھے۔ امباہی اس کے ساتھ چلتے چلتے بولا۔

”کیسا عجیب اتفاق ہے نواب صاحب! آج ہی رات ہم دوسری بار مل رہے ہیں۔“ مگر اس بار تم ہمیں مات نہ دے سکو گے۔ ہم چاند کو واپس لینے کا فیصلہ کر کے آئے ہیں۔“

چاند نے تو ہم سب کو مات دے دی نواب صاحب! کیا مہا؟“ نواب نے بے چینی سے پوچھا۔ چاند بانی کے بارے میں کچھ جاننے کے لیے بڑا مضطرب ہو رہا تھا۔

”ہوا کیا۔ اس نے ایسی شرط بیان کی کہ مہاراج بھی دم بخود رہ گئے۔“ پھر امباہی چاند بانی کی شرط کے الفاظ دہرانے لگا اور نواب حیران ہو گیا۔

”کیا مہاراج نے شرط مان لی؟“

”نہ صرف شطان لی بلکہ گنگا کی قسم کھا کر وچن دیا کہ اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کریں گے اور اس وقت تک اسے چھوئیں گے بھی نہیں جب تک دھرم اور سماج کی بات پوری نہ کر لیں۔“

”تو کیا مہاراج چاند بانی سے شادی کریں گے؟“

”چاہتے تو یہی ہیں مگر دیکھیں گوا یار جا کر کیا مہورت نکلتی ہے؟“

نواب کے دل پر چوٹ لگی۔ اب چاند گوا لیا رہیں جائے گی؟
 ”آپ اسے کھو چکے نواب صاحب! اور کھوئی ہوئی چیز قسمت سے ملتی ہے۔“
 کریم خاں نے معنی خیز نظروں سے امبا جی کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ وہ اس
 موقع پر امبا جی سے اُلجھنا نہیں چاہتا تھا اور اسے اُلجھنا چاہیے بھی نہیں تھا مگر دل میں
 تہیہ کر چکا تھا کہ مہاراجہ سندھیا سے چاند کے بارے میں بات کرے گا اور اسے لیے بغیر
 واپس نہیں جائے گا۔

دستہ خاص کے سوار خمیہ دربار سے بہت پرے رہ گئے تھے۔ امبا جی کریم خاں
 اور اس کے پٹارہ سرداروں کے ساتھ وسیع و عریض خمیہ میں داخل ہوا تو راجپوت اور
 مرہٹہ سردار پہلے ہی موجود اور کھلی صفوں میں بیٹھے تھے۔ شاید اگلی چند صفیں مہانوں کے
 لیے چھوڑ دی گئی تھیں۔ اس ہال نما دربار میں بے دود مشعلیں روشن تھیں۔ کریم خاں نے
 چلتے چلتے راجپوت اور مرہٹہ سرداروں کے چہرے دیکھے مگر شویشپ راؤ نظر نہ آیا۔ غالباً
 وہ مہاراجہ کی حاضری میں تھا۔ امبا جی کے اشارے پر کریم خاں نے اپنے سرداروں کے
 ساتھ اگلی نشستیں سنبھالیں اور مہاراجہ کا انتظار ہونے لگا۔ سوچتا تھا اس کے آنے کی خبر
 سننے ہی وہ دربار میں آجائے گا مگر جب کافی دیر گزر گئی تو پوچھا، ”امبا جی! مہاراج
 ابھی تک نہیں آئے۔“

”بس آتے ہی ہوں گے۔“

”آدھی رات ہو گئی ہے۔“

”شاید کسی کام میں مصروف ہوں لیکن آپ کی خاطر میں خود جاتا اور انہیں لے

کر آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ عجلت کے ساتھ دربار سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی چند مرہٹے سردار
 بھی اُٹھے اور یہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے کہ نہ جانے مہاراج کب آئیں۔ وہ خمیہ کے باہر ہی
 ان کا انتظار کرتے ہیں لیکن جو لوگ مہانوں کی وجہ سے بیٹھے رہے وہ بھی بیزار دکھائی
 دیتے تھے۔ انتظار پھر شروع ہوا اور انتظار کے یہ لمحے بھی طویل ہونے لگے۔ رات بے

پافل گور رہی تھی۔ جسم منضحل ہو رہے تھے اور اکثر لوگ جمائیاں لے رہے تھے۔
 ابھی تک مدارالمہام بھی لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ کریم خاں اپنی نشست پر بار بار
 پہلو بدل رہا تھا۔ اچانک ایک شخص پیغام لے کر آیا کہ 'مہاراج اپنی قیام گاہ سے چل
 پڑے اور کوئی دم میں یہاں پہنچنے والے ہیں'۔ حاضرین سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ایک لخت
 باہر کھینچو خورساٹھا۔ بندوقیں داغنے کی آوازیں گونجیں۔ پنڈارے مضطرب ہو گئے۔ دربار
 میں کسی شخص نے اظہار خیال کیا۔ 'مہاراج کے استقبال میں بندوقیں داغی جا رہی ہیں'۔
 باہر بکتور شود بپا تھا۔ اسی شور میں شوویشپ راؤ دربار میں داخل ہوا۔
 خیال یہی تھا کہ اس کے پیچھے پیچھے مہاراج سندھیا ہوگا لیکن دربار کے چاروں دروازوں
 سے رچوت اور مرٹھ سپاہی بندوقیں تانے، نیزے تولے، تلواریں سونٹے داخل ہونا شروع
 ہوئے اور چاروں طرف ان کی مسلح دیواریں سی کھڑی ہو گئیں۔ کریم خاں یہ منظر دیکھ کر
 اچھلا اور تلوار کے دتے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ 'شوویشپ راؤ! یہ سب کیا ہے؟
 مہاراج کہاں ہیں؟'

'مہاراج تو اس وقت بندیل کھنڈ کی سرحد بھی پار کر چکے ہوں گے۔ تمہاری
 خدمت کے لیے میں موجود ہوں۔'

'خوب.....! کریم خاں صورت حال کو سمجھ گیا۔ تم کیا چاہتے ہو؟
 اپنے آپ کو گرفتار سمجھو۔'

ایک ہی ساعت میں کریم خاں کی تلوار میان سے باہر آگئی۔ پنڈارہ سرداروں
 کی تلواریں بھی چمکیں، مگر صورت حال بڑی خراب تھی۔ دربار میں مرٹھ سپاہیوں کا جمگٹا
 بڑھ گیا تھا۔ آگے پیچھے کئی دیواریں تھیں اور بیشتر سپاہی بندوقوں سے مسلح تھے۔ شوویشپ
 راؤ نے اعلان کیا۔ 'کریم خاں مزاحمت بیکار ہوگی۔ سواروں میں سے کوئی تمہاری مدد کو
 نہیں آئے گا۔ وہ سب موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔'

'یہ بہادری نہیں، دھوکا اور بے ایمانی ہے۔
 جنگ اور محبت میں سب جہاز ہے۔'

دنگھرائے مہان پر بزدل بھی وار نہیں کرتے۔

رات کو بلانے کا مقصد یہی تھا کہ تمہیں تھوڑی سی سیاست سکھا دی جائے۔

حکمرانی کا دعویٰ کرتے ہو اور یہ نہیں جانتے کہ آدھی رات کو آنا دی کے نہیں صرف موت کے فرمان دیئے جاتے ہیں۔ ہتھیار پھینک دو۔

کریم خاں نے لپک کر ایک سپاہی پر وار کر دیا۔ پٹنارہ سردار بھی تلواریں نہوت کر لپکے مگر اسی لمحے ایک ساتھ کئی بندوقیں دھلاڑیں۔ تمام پٹنارہ سے گھائل پنچپیوں کی طرح تڑپ کر گرے اور خون میں لت پت ہو گئے۔ صرف کریم خاں پر بندوق نہیں مانگی گئی تھی۔ اپنے ساتھیوں کو لوٹتے تڑپتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بندوقوں اور لمبے بھالوں کے ساتھ مرہٹہ سپاہیوں نے چاروں طرف سے حلقہ کچھ اور تنگ کر دیا تھا۔ اسی اثنا میں ایک سپاہی نے اپنے نیزے کا پھل کریم خاں کے ہاتھ میں اتار دیا۔ تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی اور کئی سپاہیوں نے ایک ساتھ پہلے گوبکے نواب کو زخمیر پہنا دی۔ رات کا بلاوا پیام اجل ثابت ہوا تھا۔ مرہٹہ سردار شودیشپ راؤنگے بڑھ آیا۔ اس نے نواب کے عین سامنے آکر مہاراجہ سندھیا کا فرمان کھولا اور شعل کی روشنی میں پڑھ کر سنانے لگا۔

تم کریم خاں روہیلہ ڈاکوئی اور شیروں کے گروہ لے کر گوالیار کی سرحدی بستیاں ٹوٹتے اور مابدولت کی بے گناہ رعایا پر ظلم و ستم ڈھاتے رہے تم بندیل کھنڈ کے علاقے میں ایک خوب ساختہ ریاست قائم کر کے نواب بن بیٹھے اور مابدولت سے یہ توقع کرنے لگے کہ تمہیں حکمرانی کی سند سے کریم حکومت و فرمانروائی کے اصولوں کی توہین کریں۔ ہمارے نزدیک تم سخت ترین سزا کے مستحق ہمارے لیے ہم شودیشپ راؤ کو حکم دیتے ہیں کہ تمہیں گرفتار کر کے پابنخیر ہمارے حضور گوالیار میں پیش کرے۔

(فرمانروائے ہند مہاراج دولت راؤ سندھیا)



کریم خاں نے مہاراجہ کی خوشنودی کے لیے کیا کچھ نہ کیا۔ بندیل کھنڈ کی تاریخ میں ایسا استقبال آج تک کسی شہنشاہ کا بھی نہیں ہوا ہوگا جیسا مہاراجہ سندھیا کا ہوا۔ سوالاکھ روپے کے تختہ نڈی کے علاوہ بہت سے پیش قیمت تحائف کا نذرانہ دیا۔ شاہی دستور کے مطابق سلیقہ شعار بانڈیاں، پڑھی لکھی کنیزیں، رقص و موسیقی میں باکمال حسینائیں پیش کیں۔ مہاراجہ کے سرداروں اور لشکر کی میزبانی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ ایسی ضیافتیں دیں کہ مرہٹے بھی نواب کی دریا ولی کو مان گئے۔ گوالیار کی سرحدی بستیوں سے جو کچھ لوٹا تھا اس سے کہیں زیادہ خرچ کر ڈالا بلکہ سندھیا کے مرہٹہ حریف جسونت راؤ ٹھکر کی ریاست اندور کے مضافات سے لوٹ کر جو دولت جمع کرتا رہا تھا وہ بھی مہاراجہ کی پذیرائی اور مہمان نوازی میں صرف کر دی مگر سندھیا نے اس کی تمام آرزوؤں کا عمل کر ڈالا۔ چاند بانی پھین کر دیل پر گھاؤ لگائے۔ دھوکے سے بلا کر پنڈارہ سرداروں اور سواروں کو موت کے گھاٹ اتارا اور اسے زنجیر پہنا دی۔ کریم خاں روہیلہ ایک بہادر و مہمان نواز آدمی تھا جو دیل میں آزادی کی تڑپ اور حکمرانی کا دلولہ رکھتا تھا لیکن سیاستدان نہ تھا۔ مہاراجہ کی ایک ہی چال میں مات کھا گیا۔

سندھیا جب لاڈلے شکر سمیت گوالیار سے روانہ ہوا تو ممکن ہے کہ کریم خاں کی گرفتاری کی بجائے دوستی ہی کا ارادہ رکھتا ہو۔ روہیلے نواب کی خدمت گزاری اور حسین نڈالوں کے بدلے ہر جرم معاف ہو سکتا تھا۔ بندیل کھنڈ میں کریم خاں کی شان و شوکت حکومت کے رنگ ڈھنگ اور وسطی ہند میں ابھرتی ہوئی ایک نئی مسلم ریاست کے نقشے دیکھ کر اس کے ذہن میں کئی خطرے ریگنے لگے تھے۔ یہ نئی ریاست مستقبل میں مرہٹہ اقتدار کی حریف بھی بن سکتی تھی مگر کمپنی سرکار سے نمٹنے کے لیے مہاراجہ کو کریم خاں جیسے سرکش بہادر کی ضرورت تھی اور مستقبل کے خطروں کو کو نظر انداز کر کے وہ نواب سے صرف دوستی کا پیوند کر کے آئے۔ فرمانِ آزادی کے دھڑے پھر ٹال کر لوٹ جانا چاہتا تھا تا کہ کریم خاں اور

اس کے پنڈاروں کو انگریز کے خلاف استعمال کرنے کے لیے اپنے اعتماد کی مٹھی میں رکھے لیکن بہاراجہ کی سیاست اور وقت کی مصلحت کے ہاتھوں سب کچھ غارت ہو گیا۔

اس نے چاند بانی کو محض اپنی ہوس پرستی کے لیے طلب کیا تھا۔ مگر اُسے دیکھنے اور عجیب و غریب شرط سننے کے بعد کچھ اور فیصلہ کر بیٹھا۔ دنیا کے گرم و سرد حالات سے گزرنے اور زندگی میں سینکڑوں تجربوں سے دوچار ہونے والا مرہٹہ حکمران جانتا تھا۔ کریم خاں روہیلے کی دوستی کسی وقت بھی دشمنی میں بدل سکتی ہے۔ وہ موقع ملتے ہی اپنی محبت کا انتقام لینے پر تڑپ جائے گا۔ اسی خطرہ کے پیش نظر اس نے برباد محبت نواب کو اس قابل ہی نہ چھوڑا کہ انتقام کے نقشے میں رنگِ عمل بھر سکے۔ تمام سیاسی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر پنڈاروں کے استیصال پر آمادہ ہو گیا۔ شوویشپ راؤ کے درپے جو دام سیاست بچھایا۔ کریم خاں کا اس میں پھنس جانا یقینی تھا کیونکہ وہ سیاست دان نہیں تھا۔

”فرمانِ آزادی“ کی خاطر نواب تمام خطروں سے بے نیاز مرہٹہ خیموں میں بھاگا آیا اور توقع کے عین مطابق دام میں پھنس گیا۔ بہاراجہ نے جیسا کہ جو کچھ سوچا، جو کچھ چاہا۔ وہی ہوا مگر سیاستدان سدھیانے بھی ایک عورت کی خاطر زندگی بھر کے تجربے کی فانی کو دشمنی کی آگ میں جھونک دیا تھا۔

بہاراجہ نے ادھر کریم خاں کو بلاوا بھیجا اور چاند بانی کے ہمراہ گوالیار کی طرف روانہ ہو گیا۔ امبا جی اور شوویشپ راؤ کو حکم دیا گیا تھا۔ نواب کو گرفتار کرتے ہی جیسے اٹھالیں اور فوراً کوچ کریں۔ خیال تھا کہ کریم خاں کی گرفتاری کے بعد پنڈاروں کی طاقت بکھر جائے گی۔ پنڈارہ سرداروں کا جدھر منہ اٹھے گا چلے جائیں گے۔ کوئی شخص مرہٹوں سے اٹھنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ مجھول آدمی نے ہر نقشہ سوچ سمجھ کر تیار کیا تھا اور اس نقشے کی کامیابی یقینی تھی مگر مرہٹہ حکمران کریم خاں کے بعد ایک آدمی کو مجھول کیا تھا جس کا نام نامدار خاں روہیلہ تھا۔

نامدار خاں بڑی بے چینی کے ساتھ نواب کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ جون جون دیر ہو رہی تھی وقت گزر رہا تھا اس کے اندیشے جواں ہو رہے تھے۔ ادھی رات گزر گئی، تو

اس نے پنڈارہ سرداروں کو تیاری کا حکم دے دیا۔ اگر بہاراجہ نے نواب کو کسی حال میں پھانس لیا ہے تو پنڈاروں کی بے خبری میں ان پر شب خون ضرور مارے گا مگر مرہٹوں کا استقبال بندو قوں کی نالیوں اور بھالوں کی آنیوں سے ہونا چاہیے۔ ناگہاں لشکر گاہ میں شور اٹھا۔ بھاگتے گھوڑوں کی ٹاپیں ابھریں۔ نواب کے دستہ خاص کے چند سوار خون میں لٹ پٹ دکھائی دیتے ہوئے پہنچ گئے۔ نامدار خاں کے بدترین اندیشوں کی تصدیق ہو گئی۔

بہاراجہ نے واؤ کھیل۔ پنڈارہ سردار اور سوار قتل کر دیئے گئے۔ نواب کو گرفتار کر لیا گیا۔ چند سوار بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگے تھے تاکہ ساتھیوں کو دشمن کی گھات سے آگاہ کریں۔

نامدار خاں الاؤ میں جبنے والی گیلی لکڑی کی طرح مٹخ گیا۔ پنڈارہ سردار دم بخودہ گئے اب کیا کریں؟ ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ مرہٹہ لشکروں سے باقاعدہ جنگ مول لیتے پھر نواب کے ساتھ صرف چھ سات ہزار پنڈاروں کی نفری تھی۔ اکثر آدمی پیچھے ہی رہ گئے تھے۔

بہاراجہ سے دوستی کی ملاقات تھی۔ ایک طرف بہان دوسری جانب میزبان اور یہ چھ ساتھ ہزار پنڈارے بھی محض اس لیے ساتھ ہو لیے تھے کہ مرہٹہ بہاراجہ کے مقابلے میں کہیں

نواب کی شان و شوکت ماند نہ پڑ جائے۔ اس نفری کے ساتھ مرہٹہ سواروں اور پیادوں کے ساتھ مقابلہ جن کی تعداد بیس ہزار کے لگ بھگ تھی جان سے جانے والی بات تھی

نامدار خاں نواب ہی کی طرح بہادر اور سرکش لیکن اندھے فیصلے کرنے کا عادی نہیں تھا۔ سوچنے لگا۔ مرہٹوں نے نواب کو گرفتار کر لیا ہے تو اس کے ادگر و جنگجو سواروں

کی دیواریں کھڑی کر دی ہوں گی کہ کوئی ان دیواروں کو پھلانگ نہ سکے۔ ذہن میں جنگ کی بساط کھولی تو ہر نقشے پر موت کھڑی تھی۔ نواب کو چھڑالانے

اور بازی جیتنے کی بات تو ایک طرف رہی، بازی برابر کرنے کی بھی کوئی چال نہیں سوچ رہی تھی مگر اتنا کم ہمت بھی نہیں تھا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا۔ تلوار کھینچ کر اٹھا اور

بولاً۔ جو موت سے کھیل سکتا ہے وہ میرے ساتھ چلے۔ کسی نے کہا، ہم موت سے نہیں ڈرتے مگر لشکر گاہ کی حفاظت کا انتظام بھی کر لو۔

نامدار خاں نے چھ سرداروں کو منتخب کیا۔ باقی لشکر گاہ کی حفاظت پر مامور کر دیئے

اور تین ہزار سواروں کو لے کر مرہٹوں سے لڑا کھاتا کھولنے کے لیے نکلا۔
 نواب کی گرفتاری کے بعد ماہاجی اور شویشپ راؤ نے روانگی میں دیر نہیں لگائی
 جب تک پنڈاروں کو معاملے کی خبر ہوتی بندیل کھنڈ کی سرحد سے دور نکل جانا چاہتے تھے
 مگر سادہ کے سپاہیوں نے خیمے اکھاڑنے اور ساز و سامان لادنے میں دیر کر دی پھر بھی صبح کا ڈب
 سے پہلے لشکر کا یہ آخری حصہ روانہ ہو گیا لیکن ابھی نصف میل کا سفر کیا تھا کہ نامدار خاں اپنے
 چیتوں کو لے کر بلائے ناگہانی کی طرح سر پر پہنچ گیا۔ دھاتنی بندوقیں موت اُگلنے لگیں پہلے
 وار میں بیسوں سپاہی کھیت رہے۔ لشکر کے سردار نے لڑنے کی بجائے بچ کر نکل جانے ہی میں
 حافیت سمجھی۔

لڑاکا سواروں کے دستے بہت آگے نکل گئے تھے اور ان کا پلٹ کر آنا ممکن
 نہ تھا۔ سب ہی سمجھتے تھے نواب کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی پنڈاروں کے حوصلے ٹوٹ جائیں
 گے اور مرہٹہ لشکروں کی ہیبت کے مارے وہ اپنے خیموں میں کباب کو بیٹھ رہیں گے مگر پنڈارے
 خیموں سے نکل آئے تھے۔ مرہٹہ سردار نے معمولی مزاحمت کے ساتھ سفر جاری رکھا پنڈار
 ملتے نظر نہ آتے تھے۔ موت کی طرح ساتھ ساتھ چلتے اور بندوقیں داغتے رہے۔ یہ سراسر
 نقصان کا سفر تھا۔ سپاہی زخم کھا کر گرتے، تڑپتے اور دم توڑتے رہے۔ لاشیں اٹھانے کی
 بھی فرصت نہ تھی۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے مرہٹہ سردار مقابلے پر مجبور ہو گئے
 یہ مقابلہ صرف جان بچانے کے لیے تھا مگر پنڈارے تو جان لینے آئے تھے، موت کے دامن
 لراتے ہوئے ٹوٹ پڑے۔ ہر حملہ پہلے سے شدید تر تھا۔ چڑھتے سورج کے ساتھ ہی جنگ
 ختم ہو گئی۔ دو ہزار کے لگ بھگ مرہٹے مارے گئے۔ بقیۃ السیف نے بھاگ کر جان بچائی
 پنڈاروں نے سب کچھ لوٹ لیا، شاہی سراپردہ، بڑے بڑے خیمے، قیمتی ساز و سامان،
 مطبخ کی دگیں، پتیل تانبے کے بڑے بڑے دیکھے، ہزاروں ظروف، رسد کا بھاری ذخیرہ بھی
 ہاتھ لگا۔ لشکر کے اس حصے میں کچھ حصین عورتیں بھی تھیں جو مرہٹہ لشکر کا دل بہلانے ساتھ
 آئی تھیں۔ ان میں وہ بانڈیاں اور کنیزیں بھی مل گئیں۔ جنہیں نواب کریم خاں نے ہمارا جہ
 سندھیا کی خوشنودی کے لیے بطور نذرانہ پیش کیا تھا مگر ناچنے گانے والی حسینائیں اور

تعلیم یافتہ کنیزیں جن کی افسرگیتی تھی شاید مہاراجہ کے ساتھ ہی روانہ کر دی گئی تھیں۔
 نامدار خاں نواب کو نہ چھڑا سکا۔ وہ تو مرہٹہ سواروں کی حفاظتی دیواروں کے
 درمیاں بہت آگے جا چکا تھا اور شاید ان دیواروں تک پہنچنا ممکن بھی نہیں تھا مگر اس
 نے مرہٹہ لشکر کے آخری حصے کو لوٹ کر اور دو ہزار سپاہیوں کو آب مرگ پلا کر مہاراجہ بندھیا
 کو خبردار کر دیا تھا کہ اُسے پنڈاروں کی دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔ گوالیار کے راج محل میں
 جب اُسے مرہٹہ لشکر کی تباہی و بربادی کی خبر ملی تو سر پیٹ لیا اور امبا جی بہہ گرنے پر
 لگا کہ وہ سپاہیوں کی حفاظت نہ کر سکا۔ اس خبر کے ساتھ ہی دل کا وہ چین بھی رخصت
 ہو گیا جو نواب کریم خاں کو گرفتار کر کے حاصل ہوا تھا۔

گوالیار میں نواب کی امیری اور دو ہزار مرہٹہ سپاہیوں کی ہلاکت کی خبر ایک ساتھ
 پہنچی تھی۔ مہارانی بیجا بائی نے یہ خبر سنی تو بجلی کی طرح کوندتی، کڑکتی مہاراجہ کے کمرہ خاص
 کی طرف چل دی۔ اس نے تو نواب کے ساتھ دوستی کا پوند کرنے کا مشورہ دیا تھا پھر مہاراج
 نے اُسے گرفتار کیوں کر لیا؟

مگر جب کمرہ خاص میں داخل ہوئی تو جو کچھ دیکھا جو کچھ سنا، وہ اُسے جیتے جی ختم
 کر دینے کے لیے کافی تھا۔

کمرے میں چاند سے کہیں بڑھ کر ایک خوب صورت عورت موجود تھی۔ نام بھی
 چاند بائی تھا اور مہاراجہ اپنے دارالمہام کو ہدایت دے رہا تھا۔ امبا جی! مہاراجہ بہت اود
 راج بولشی سے مل کر بیاہ کی مہورت نکلوانے میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔
 مہارانی بیجا بائی نے یہ الفاظ سنے تو سکتے کی حالت میں کھڑی چاند کے کھڑے کو
 دیکھتی رہ گئی۔



بندیل کھنڈ سے واپسی پر دوسری رات مورچیل بھار باندی ساوتری جس نے مہاراجہ

کے ساتھ سفر کیا مہارانی بیجا بائی کے کمرے میں کھڑی اُسے ساری باتیں تفصیل سے سنارہی تھی۔ جہاں سفر کے دوران پیش آئیں۔ مہارانی کا حکم تھا کوئی بات خواہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو نظر انداز نہ کی جائے۔ ساوتری بھروسے کی باندی تھی اور اُسی کے ذریعے بیجا بائی مہاراجہ کی 'حسین سرگرمیوں سے باخبر رہتی تھی۔

اس نے مہاراجہ، امبا جی اور چاند بائی کے درمیان ہونے والی پوری گفتگو بیان کر دی۔ چاند کی شرط اور مہاراجہ کے دہن کی بات ذرا تفصیل سے سنائی اور بتایا میں نے مہاراج اور امبا جی کے درمیان ہونے والی خفیہ بات چیت بھی سن لی تھی کیونکہ چاند بائی کو آرام گاہ میں پہنچا کر اور شو بھا کے سپرد کر کے پھر خیمہ خاص کی طرف لوٹ آئی اور رات باری میں نڈی کے پردے سے لگ کر ان کی ساری گفتگو سنی رہی تھی تاکہ آپ کو تمام حالات سے آگاہ کر سکوں۔ پھر اس نے بتایا کہ چاند بائی سے بیاہ کی صورت میں مہاراج کو صرف حضور کے پتا سرچی راؤ اور نواب کریم خاں روہیلے سے خطرہ تھا اور نواب اسی لیے گرفتار کیا گیا ہے کہ وہ شادی میں رکاوٹ ڈالنے اور انتقام لینے کے قابل ہی نہ رہ جائے۔ ساوتری نے یہ بھی کہا کہ امبا جی چاند بائی کو اس لیے راج رنو اس میں شامل کرنا چاہتا ہے کہ مہارانی کو اس کے حق و اختیارات سے محروم کر دے اور راج مملوں پر چاند بائی کی حکومت قائم ہو جائے۔

بیجا بائی کو یہ سب باتیں سن کر شدید دکھ ہوا۔ یہ تو ہانتی تھی کہ اس کے باپ سرچی راؤ کی اقتدار سے محروم ہیں امبا جی کا بھی ہاتھ تھا لیکن اب وہ اُسے بھی راج مملوں کی اعلیٰ حیثیت سے محروم کر دینا چاہتا تھا۔ بیجا بائی ناگن کی طرح بل کھا کر رہ گئی۔ سندھیائی ہوس پرستی کے نئے عام تھے۔ راج رنو اس حسین عورتوں کا ایک باڑہ تھا۔ اگر اس باڑے میں چاند بائی کا اضافہ ہو جاتا تو کون سی قیامت آجاتی مگر چاند بائی سے بیاہ کا مقصد ہی بیجا بائی کے اقتدار کو ختم کرنا تھا۔ مہارانی نے دل تمام لیا اور ساوتری کو انعام دے کر بولی۔

’دیکھ! نہ تو کوئی غلط بات مجھے بتانا، نہ کوئی ضروری بات مجھ سے پوشیدہ رکھنا۔ اب یہ بتا چاند بائی کیا چاہتی ہے۔ اگر نواب سے پیار تھا تھی تو مہاراج کے ساتھ کیوں آگئی۔‘ مہارانی صاحبہ! میں نے چاند کے دل میں جھانکنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی اور

پھور معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ ساگر کی طرح گہری ہے اور اپنے دل کا بھید نہیں بتاتی۔ جب سے نواب کی گرفتاری کی خیر سنی ہو وقت چُپ رہتی ہے۔ اس نے مہاراج سے کوئی فرمائش بھی نہیں کی۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آتا ہے۔ ایک بار حضور کا ذکر آیا تو کہنے لگی۔ "میں تو مہارانی بیجا بائی کی خادمہ ہوں۔ کاش کوئی یہ بات مہارانی کو بتادے۔"

یہ سن کر مہارانی کے ذہن میں ایک کھڑکی کھلی۔ ساوتری! میں چاند سے ملنا چاہتی ہوں۔ "مہاراج نہیں چاہتے کہ کوئی رانی چاند سے ملے۔ آپ کے بارے میں تو خاص تاکید کی گئی ہے۔"

"کچھ بھی ہو ملاقات کی کوئی تدبیر نکال۔" پھر کچھ سوچ کر خود ہی بولی۔ "پرانے مند کا باغ اجاڑ پڑا ہے۔ ادھر کوئی نہیں آتا۔ کل چاند کو سیر کے بہانے اس باغ میں لے آ۔ کہنا میں ملنا چاہتی ہوں۔"

"بہت اچھا! کوشش کروں گی۔"

"میں کل تیسرے پہر وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

پھر ساوتری دبے پاؤں کمرے سے نکلی اور راج محل کی نیم تاریک غلام گردش میں فائز ہو گئی۔



پرانے مند کے باغ کی دیواروں کا پلستر اکھڑ گیا تھا۔ دو بڑے جہاں بھی مسمار ہو چکی تھیں۔ کسی وقت یہ باغ گوالیار کی اہم تفریح گاہوں میں شمار ہوتا تھا مگر اب تو تالاب بھی مدت سے خشک پڑا تھا اور کوئی بھولے سے بھی ادھر کا رخ نہ کرتا تھا۔ مہارانی بیجا بائی ایک بانڈی کے ہمراہ تیسرے پہر ہی باغ میں پہنچ گئی اور دیوار کی ٹوٹی برجی کے پاس چاند بائی کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے ملاقات کے لیے ایک شکستہ برجی کو شاید اس لیے منتخب کیا تھا کہ اس کی ذات سے بھلی عتماد کا پلستر اکھڑ چکا اور دل برجی کی طرح ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔

مہارانی کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چاند بائی سادھری کے ہمراہ باغ میں آئی اور
جیابائی کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپکی۔ قریب پہنچ کر اودھ کی غصوں میں تہذیب کے مطابق ہاتھ
پیشانی پر لے جا کر سلام کیا اور پُر غلوں لہجے میں بولی: "مہارانی! میں اپنے آپ کو خوش قسمت
سمجھتی ہوں کہ آپ نے مجھے یاد فرمایا۔"

"چاند! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔" جیابائی نے بھی شفقت کا مظاہرہ کیا
"مجھے خوشی ہے کہ تم میری دعوت پر چلی آئیں۔"
"آپ سے ملنے کی آرزو تھی؟"

"دیکھو چاند! میں ایک مہارانی بھی ہوں اور ایک عورت بھی، ہر عورت پہلے اپنا
بھلا سوچتی ہے مگر میں اپنے ساتھ تمہارا بھلا بھی چاہتی ہوں۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں
لیکن پہلے یہ اطمینان چاہتی ہوں کہ جو کچھ پوچھوں گی اس کا صحیح جواب ملے گا؟"
"فرمائیے، کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟ آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔"

جیابائی ایک لمحوں ٹھہر کر بولی: "کیا تمہیں نواب کریم خاں سے پیار نہیں؟"
چاند بائی نے دل تھام لیا۔ زندگی میں صرف انہی سے پیار کیا ہے۔

"پھر تم نواب کو چھوڑ کر امباچھی کے ساتھ کیوں چلی آئیں۔ میں نے سنا ہے فیصلہ تمہاری
مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اگر تم آنا نہ چاہتیں تو تمہارے ساتھ زیادتی نہ کی جاتی۔"
"اگر میں نہ آتی تو یقیناً مہاراج ناراض ہو جاتے پھر زبردستی بھی کی جاتی جنگ بھی ہوتی۔
اور نواب نے جس مقصد کے لیے مہاراجہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا وہ بھی پورا نہ ہوتا۔ میں
نے اسی مقصد کی خاطر اپنی محبت کی قربانی دی ہے۔"

"کس مقصد کی بات کرتی ہو؟"

"ہر انسان کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے مہارانی، نواب کریم خاں مہاراجہ کی دوستی
اس لیے چاہتے تھے کہ ان سے ریاست کی آزادی اور اپنی فرمانروائی کی سند حاصل کرتے
جب مہاراج نے نواب سے میرا مطالبہ کیا اور فیصلہ میری مرضی پر چھوڑ دیا گیا تو میرے سامنے
دو ہی راستے تھے یا تو انکار کر دیتی۔ یہ انکار مہاراج کو مشتعل کر دیتا اور وہ غصے میں نواب کی فرمائش

آزادی کی خواہش کبھی پوری نہ کرتے۔ ہو سکتا ہے ان کی دوستی دشمنی میں تبدیل ہو جاتی۔ میں نے اس خطرے کو محسوس کیا۔ پنڈارے مرہٹوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری صورت یہ تھی مہاراج کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میں مرہٹہ خیموں کا رخ کرتی اور اس مقصد کو حاصل کرنے میں نواب کا ہاتھ بٹاتی جو انہیں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ میں نے سوچا اگر محبت کی قربانی سے میرے محبوب کا مقصد پورا ہو سکتا ہے تو مجھے اس قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ یہی سوچ کر امبا جی کے ساتھ آنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن میں کتنی بد نصیب ہوں کہ میری یہ قربانی رائیگاں گئی۔ مہاراج نے اپنا وعدہ پورا کرنے کی بجائے نواب کو دھوکے سے ہٹا کر گرفتار کر لیا اور انہیں زنجیر پہنا کر میرے ساتھ ہی گوالیار لے آئے۔ اس کے ساتھ ہی چاند بائی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گریے۔ رخسار بھیک گئے۔ نتھن پھڑکنے لگے اور بے اختیار پلو سے منہ دھانپ کر رونے لگی۔

یہ حالت دیکھ کر مہارانی بیجا بائی کا دل بھی بھر آیا۔ اسے تسلی دیتی ہوئی بولی "حوصلہ رکھو چاند! جو عورتیں حکمرانوں کی زندگی میں آتی ہیں انہیں بعض اوقات کٹھن حالات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔"

"مگر میں تو اپنی بد نصیبی پر رورہی ہوں" چاند نے گلو گیر آواز میں کہا۔ "آپ عورت ہونے کے نالے میرا دکھ سمجھ سکتی ہیں۔ میں نے اپنے محبوب کی خاطر جو قربانی دی تھی وہ کسی کام نہ آئی۔ اٹھے نواب صاحب اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے کہ میں نے ان سے بے وفائی کی۔ یہ سداہ ان کے دل کو کاٹ رہا ہوگا لیکن وہ نہیں جانتے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے؟"

"مگر یہ بھی جانتی ہو۔ مہاراج تم سے بیاہ کی تیاریاں کر رہے ہیں؟"

"بیاہ کی شرط اپنی عزت بچانے کے لیے لگائی تھی۔ میں جانتی تھی نواب یہ بیاہ نہیں ہونے دیں گے مگر وہ گرفتار ہو گئے اور تقدیر نے مجھے مہاراج کے قدموں میں لاپھینکا۔ کاش! مجھے موت آجائے تاکہ اس الزام سے چھوٹ سکوں۔"

"گھبراؤ نہیں چاند! میں تمہاری مدد کروں گی۔ میرے جیتے جی یہ بیاہ نہیں ہو سکتا۔"

"سچی مہارانی؟"

”مجھ پر وشوا اس رکھو“ بیجا بائی نے چاند کو بے اختیار گلے سے لگایا۔ اس کے آنسو پونچھے اور کہا: ”میں اپنے کام نہ آسکی تو تمہارے کام ضرور آؤں گی۔“

”زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی مہارانی!“

”مگر ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے۔ کسی کو اس کا پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ مہاراج کو بھی معلوم نہ ہو کہ تم مجھ سے مل چکی ہو۔“

”آپ بے فکر ہیں۔ میں مہاراج کا صرف اس لیے احترام کرتی ہوں کہ انہوں نے میری مجبوریوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جو دھین دیا تھا“ اس پر قائم ہیں و

”تم نے انہیں شرط کی جو زنجیر پہنا دی ہے وہ ان کے گلے سے نہیں اتر سکے گی۔ یہی ایک عقلمندی کی ہے تم نے۔“

”خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔“

ملاقات ختم ہوئی تو ساد تری چاند بائی کو لے کر راج محل کو لوٹ گئی تاکہ مہاراج جب شام کو اس سے ملنے آئیں تو وہ اپنے کمرے میں موجود ہو لیکن مہارانی بیجا بائی چاند سے ملنے کے بعد بہت زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔



امبا جی نے گوالیار کے مہاراج کو بہت اور راج جو تیشی کو مہاراج کا سنکیں پہنچا دیا اور دونوں کو سوموار کے دن بیاہ کی مہورت نکلوانے کے لیے راج محل میں طلب کر لیا تھا۔ مہاراج بہت کو صبر لگن منڈل میں بیٹھا اور دستور کے مطابق بیاہ کے اخلوک پڑھنے تھے۔ اصل کام راج جو تیشی کا تھا۔ جسے چاند بائی اور مہاراج کے سارے وکیر کر بیاہ کے لیے کوئی شبہ گھڑی نکالنی تھی مگر لگن دھرنے کے لیے جو تیشی کے ساتھ مہاراج بہت کو اس لیے بلا لیا گیا تھا کہ وہ بھی اپنے وچار کا اظہار کر سکے

مہارانی بیجا بائی نے اُن دونوں میں سے راج جوتشی کا انتخاب کیا اور اتوار کو جب شام کا بھٹپٹا لگ رہا تھا ایک سادہ اور معنی میں چھپی اپنی باندی کے ہمراہ راج جوتشی کے آگن میں داخل ہوئی۔ پہلے تو وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ معاملہ کیا ہے لیکن جب اوڑھنی میں مہارانی کی شکل دیکھی تو بوکھلا گیا۔

’سرکار! آپ نے تکلیف کیوں فرمائی۔ باندی کے ہاتھ سندس بھیج دیا ہوتا میں خود حاضر ہو جاتا۔‘

’ہمیشہ پیاسا ہی کنوئیں کے پاس آتا ہے جوتشی مہاراج! کنواں کبھی پیاسے کے پاس نہیں جاتا۔‘

راج جوتشی نے جلدی جلدی ورائڈے میں چوکی بچھائی اور خود مہارانی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ’کیا آگیا ہے میرے لیے۔‘

مہارانی کے اشارے پر باندی نے اشرافیوں کی ایک تھیلی جوتشی کے ہاتھ میں مختما دی۔ وہ پریشان سا ہو کر بولا۔ ’یہ کیا ہے سرکار!‘

’تمہاری دکھنا!‘
’میں سمجھا نہیں۔‘

مہارانی بڑے فیصلہ کن انداز میں کہنے لگی۔ ’مہاراج اور چاند بائی کے بیاہ کی مہورت نہیں نکلنی چاہیے جوتشی جی! چاند بائی علیگڑھ کی ایک طوائف زادی ہے۔ وہاں سے بھاگی تو نواب کریم خاں کی سرکار سے وابستہ ہو گئی۔ اب مہاراج اُسے بندیل کھنڈ سے اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔ سونے کی یہ ایک سو مہریں جو تمہیں بجینٹ کی گئیں، کہتی ہیں کہ چاند بائی کے ستارے مہاراج سے نہیں ملتے۔ اگر بیاہ ہوا تو دونوں پر بڑا کثرت آئے گا۔‘

راج جوتشی یہ آگیا سن کر سکتے میں آگیا۔ اگر میں نے کہہ بھی دیا کہ ستارے نہیں ملتے تو ہو سکتا ہے مہاراج کسی دوسرے جوتشی کو بلا کر پوچھیں۔ اس حالت میں اگر میرا جھوٹ کھل گیا تو مہاراج مجھے کوہو میں پلوادیں گے۔

’تمہیں کسی دوسرے سے نہیں صرف اپنے کام سے مطلب رکھنا چاہیے دوسرے جوتشی سے کچھ کہنا سننا ہمارا کام ہے۔‘

”میں کوشش کروں گا مہارانی!“ راج جوتشی کی ڈوبی ڈوبی آواز تباہی تھی کونٹ کے مارے اس کا دل ابھی سے بیٹھا جا رہا ہے۔
 ”صرف کوشش نہیں۔ یہ کام تمہیں کرنا ہے۔ کامیابی کے بعد تمہاری اور بھی سیوا کی جائے گی۔“

یہ کہہ کر بیجا بائی اٹھی اور بانڈی کے ہمراہ بڑی تیزی کے ساتھ دروازہ پار کر گئی۔ راج جوتشی بھاگتا ہوا اندر گیا۔ اشرفیوں کی تھیلی سنبھالی اور اسی وقت لگن کنڈلی لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے تین بار پانسہ پھینکا اور ہر بار جواب اس کی مرضی کے عین مطابق نکلا۔ دوسرے دن وہ مہاراج کے حکم پر راج محل پہنچا تو پروہت پہلے ہی موجود تھا۔ مہاراجہ سندھیانے اپنا مطلب بیان کیا۔ اور جوتشی سے کہا وہ بیاہ کی تاریخ نکالے۔ راج جوتشی نے کنڈلی پھینکی مہاراج کی جنم پتری دیکھی کچھ لکیریں کھینچیں۔ کچھ حساب لگایا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ شما چاہتا ہوں مہاراج!

”کیا بات ہے؟“

”چاند بائی کے ساتھ مہاراج کے ستارے نہیں ملتے۔“

”کیا جیتے ہو؟“ مہاراجہ سندھیانے غصے میں گرجا۔ ”اگر ستارے نہیں ملتے تو چاند بائی نواب

کو چھوڑ کر ہمارے پاس کیسے آگئی؟“

”سچ عرض کرتا ہوں مہاراج! حضور کا شبہ نام سندھیانے اور رات کے بلنے کے

سے کا نام ہے اور یہ نام بتاتا ہے کہ چاند نام کی کوئی عورت مہاراج کے جیون میں نہیں آ سکتی کیونکہ جب دھرتی اور آکاش ملتے ہیں تو شام ہو جاتی ہے اور دنیا پر اندھیرا چھانے لگتا ہے۔“ راج جوتشی پوری طرح مطمئن تھا کیونکہ اس کے حساب کے مطابق نجوم اور جوتشی اس کے بیان کی تائید کر رہے تھے۔

سندھیانے پریشان سا ہو کر بولا۔ ”پہلی رات کا چاند تو اسی تھے دکھائی دیتا ہے جب دن

اور رات آپس میں مل رہے ہوں پھر چاند بائی ہمارے جیون میں کیوں نہیں آ سکتی؟“

”یہ میں نہیں مہاراج کی جنم پتری کہہ رہی ہے۔ ان دنوں کسی بھی جوتشی کو بلا کر پوچھ

لیں۔ وہ یہی کہے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔“

”مگر چاند بانی سے ہمارا ملاپ ضروری ہے۔“ سندھیا مہا پر وہبت سے مخاطب ہوا
 ”پنڈت جی! آپ ہی کوئی شبھ گھڑی دیکھ کر لگن کی تاریخ طے کر دیں۔ ہم یہ بیاہ ضرور کریں گے۔“
 ”جب چاند بانی کے ستارے ہی مہاراج سے نہیں ملتے تو لگن کی تاریخ کس طرح
 طے ہو سکتی ہے۔ راج جو تیشی نے ٹھیک کہا ہے کہ آپ کا نام سندھیا ہے اور سندھیا کا
 چاند سے ملاپ نہیں ہو سکتا۔“

مہا پر وہبت کا جواب سن کر مہاراجہ سندھیا کا چہرہ یوں تار یک ہو گیا جیسے دن
 اور رات کے ملنے کے سمے سیاہی چھا جاتی ہے اور گھروں کے آنگنوں سے اٹھنے والا دھواں
 اس سیاہی میں کچھ اور سیاہی بھی گھول دیتا ہے۔ راج جو تیشی نے اس کے دل کی مایوسیوں کو
 بھانپ لیا اور کہا۔

”اگر اس سمے مہاراج نے لگن کے بارے میں سوچا بھی تو بڑا کشت آئے گا لیکن تیار
 کی چال بدلتی رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ملاپ کا کوئی راستہ نکل
 آئے۔“ سندھیا کے چہرے پر اُمید کی چمک نمودار ہوئی۔ ”یہ انتظار کتنی دیر کا ہو گا۔ چند
 دن یا چند مہینوں کا؟“

”چند سالوں کا بھی ہو سکتا ہے مہاراج! آکاش کی دنیا میں دن اور مہینے تو ہلکے
 بھینکنے میں گزر جاتے ہیں۔“

سندھیا کے دل پر پھر چھریاں سی چل گئیں۔ ایک سلطنت کا مہاراج ہونے کے ناتے
 مہا پر وہبت اور راج جو تیشی کو بھی ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا اور کچھ
 دل کے ساتھ بولا۔

”ہم انتظار کریں گے مگر تم انتظار کی گھڑیاں مختصر کرنے کی کوشش کرو۔“
 اس کے ساتھ ہی مہا پر وہبت اور راج جو تیشی کو انعام دے کر رخصت کر دیا گیا۔
 راج جو تیشی جانتا تھا۔ مہاراجہ کی زندگی میں چاند بانی سے وصال کا لمحہ بھی نہیں آ سکتا مگر
 اس نے سندھیا کے دل میں اُمید کی ایک ہلکی سی لہر اس لیے روشن کر دی تھی کہ شاید مہاراج

بھی اشرفیوں کے کسی توڑے کا منہ کھول دیں۔



مرہٹہ لشکر پر کامیاب چھا پہ مارنے کے بعد نامدار خاں نے پنڈارہ لشکر گاہ کے خمیے اُکھاڑنے اور ریاست کی طرف واپسی میں دیر نہیں لگائی۔ وہیں سے ایک قاصد بھوپال روانہ کر دیا شہزادی کو مرہٹے کی بد عہدی، فریب دہی اور نواب کی گرفتاری کی اطلاع دینے کے ساتھ یہ درخواست بھی کی تھی کہ بہادر کو فوراً ریاست میں بھیج دیا جائے۔

بہادر نواب کریم خاں کا جوان سال اور جوان ہمت بھتیجا تھا جو بھوپال میں تعلیم و تربیت حاصل کر رہا تھا۔ نام تو کچھ اور تھا لیکن اپنی دلیری، شجاعت اور چھا پہ مار جنگ میں، جو پنڈاروں کا سب سے کامیاب حربہ تھا، بہادر کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اب اصل نام تو لوگوں کے ذہن سے محو ہو گیا مگر 'بہادر' کا لقب نام کے طور پر مقبول تھا۔ اُسے بلانے کا مقصد یہ تھا کہ وہی چچا کا وارث اور اس کی عدم موجودگی میں ریاست پر حکمرانی کا حق و اختیار رکھتا تھا۔ پنڈاروں نے اپنے زورِ بازو سے چھوٹی سی جو ریاست قائم کر لی تھی اس کی حفاظت اور بقاء کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔

نامدار خاں کی عقلمندی نے پنڈاروں کو بکھرنے نہیں دیا۔ ریاست میں لوٹتے ہی بہاراجہ سندھیا کے خلاف انتقام کا نعرہ بلند کیا۔ روہیلے، جاٹ، میو، بھیل سبھی نے بہاراجہ کی بد عہدی پر لعنت پڑھی قتل ہونے والے پنڈارہ سرداروں کے بیٹوں، بھائیوں اور عزیزوں نے قسم کھائی کہ مرہٹوں سے انتقام لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ تیسرے روز بہادر بھی پنڈاروں کے ایک دستہ کے ہمراہ پہنچ گیا۔ نامدار خاں نے اس کا شانہ استقبال کیا۔ بہادر نے بھوپال میں ایک فرانسیسی کمانڈر سے فنونِ سپہ گری کی تربیت حاصل کی تھی۔ نئے عزم اور جوان ارادے لے کر آیا تھا۔ کئی روز تک صلاح مشورے ہوتے رہے

آخر اس بات پر فیصلہ ہوا کہ براہ راست گوالیار پر حملہ کیا جائے۔
 پانچ ہزار برق نفاذ سواروں کو دو سالوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک بہادر کی کمان
 میں دوسرا نامدار کے تحت پھر ایک رات اس لشکر نے چپ چاپ کوچ کیا اور جنتیوں کی طرح
 جنگوں کے درمیان راستہ بناتے، دن کو ٹھہرتے، رات کو سفر کرتے، جھانسی کو مشرق کی
 سمت چھوڑتے سیدھے گوالیار کی سمت بڑھے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی لیکن ایک صبح
 پڑاؤ کے لیے رُکے تو ناگہاں شوپور کی طرف سے ایک مرہٹہ فوجی دستہ نمودار ہوا جو گوالیار
 کی طرف جا رہا تھا۔

مرہٹہ سواروں نے سمجھا کہ مرہٹہ لشکر کسی مہم سے لوٹ رہا ہے۔ گھوڑے بڑھاتے پڑاؤ
 کی طرف بڑھے اور اس طرح نامدار خاں سے تصادم ہو گیا۔ مرہٹہ دستہ صرف تین سو سپاہیوں
 پر مشتمل تھا۔ دوسو کے قریب مارے گئے۔ باقی جان بچا کر بھاگے۔ نامدار خاں نے تعاقب
 کیا۔ چند سوار تعاقب کے دوران بھی ہلاک ہوئے لیکن ایک سو کے لگ بھگ فرار ہونے
 میں کامیاب ہو گئے۔ نامدار پڑاؤ میں پلٹ کر آیا تو بہادر سے مشورہ کرنے کے بعد سارا
 منصوبہ ہی تبدیل کر دیا کیونکہ اب گوالیار پر حملہ جنگی نقطہ نظر سے مناسب نہ تھا۔
 مرہٹہ سپاہیوں نے گوالیار پہنچ کر دم لیا اور پٹناروں کی آمد کا راز فاش کر دیا۔
 مہاراجہ نے شویشپ راؤ کو حکم دیا کہ دشمن کو گوالیار پہنچنے سے پہلے ہی جالے۔
 شویشپ راؤ سواروں اور پیادوں کے جھگڑے کر نکلا مگر ادھر تو بساط جنگ
 کے نقشے ہی بدل گئے تھے۔ گوالیار کا ارادہ ترک کر کے بہادر نے مغرب کا رخ کیا اور
 نامدار خاں نے مشرق کی طرف پلٹتے ہی تباہی مچا دی۔ شویشپ راؤ کو خبر ملی تو اسی کے
 تعاقب میں بڑھا مگر وہ بستیاں لوٹتا۔ آگ لگاتا۔ بجلی کی مانند لپکتا، کڑکتا ایک جگہ سے
 دوسری جگہ پہنچ جانا۔ معلوم ہوتا تھا کہیں ٹھہرنا اور مرہٹوں کا مقابلہ کرنا اس کے پر دو گرام
 میں شامل ہی نہ تھا۔ بس بستیاں لوٹتا اور مرہٹہ لشکر کو اپنے تعاقب میں دوڑاتا رہا مگر
 نامدار خاں اپنے منصوبہ کے مطابق اچانک ادھر سے ادھر جانکلتا۔
 شویشپ راؤ بدستور تعاقب میں تھا۔ کہیں تصادم کی نوبت نہ آ سکی۔ دونوں

آگے پیچھے بھاگتے رہے۔ یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ ایک دن تپہ چلا کہ نامدار
خاں جھانسی کے حاشیے پر گھومتا ہوا بندیل کھنڈ کو لوٹ گیا ہے۔

بہادر نے دریائے جمیل تک تباہی پھیلا دی تھی۔ واپسی پر شوپور کے نزدیک
اس مرہٹہ لشکر سے ٹڈ بھڑ بھی ہوئی جو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا تھا مگر پنڈارے
جووش انتقام میں دیوانے ہو رہے تھے۔ دشمن پر ٹوٹ پڑے۔

بہادر نے فرانسیسی جرنیل سے سیکھے ہوئے داؤ بیچ آزمائے اور مرہٹوں کو تباہ
کن شکست دینے میں کامیاب رہا۔ مرہٹہ لشکر سپاہ ہو کر گوالیار کی طرف بھاگا اور بہادر
بندیل کھنڈ کی طرف ہٹا۔ پندرہ دن کے اندر دونوں رسالے ریاست میں واپس آگئے
لوٹ مار سے اتنا مال ہاتھ لگا کہ کئی سال تک کسی نئی غارت گری کی ضرورت نہ تھی۔ کئی
بستیاں نظر آتش کر دی گئیں۔ چوبے اور پانڈے چن چن کر قتل کیے گئے۔ شویشپ راؤ
بندیل کھنڈ کی سرحد پر بھاؤنی ڈال کر بیٹھ گیا کہ مہاراج کا حکم آئے تو پنڈاروں کی ریاست میں
گھس کر ان کی غارت گری کا بدلہ لے۔

مہاراجہ سندھیا کو لوٹ مار کی خبریں ملیں تو شیشا اٹھا۔ ساتھ ہی بہادر اور نامدار
کا پیغام بھی ملا کہ اگر نواب کریم خاں کو کچھ ہو گیا تو گوالیار کی اینٹ سے اینٹ بھاوی
جائے گی۔ عقلمندی سے کام لیتا تو نواب کو رہا کر کے اپنی غلطی کی تلافی کر سکتا تھا مگر وہ
اس دھمکی کو توہین سمجھا اور شویشپ راؤ کو حکم بھیجا کہ ریاست میں گھس کر پنڈاروں
کو نیست و نابود کر دو۔

اسی روز خبر ملی انگریزی فوج علی گڑھ سے گوالیار کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ہوش
اڑ گئے۔ اصل دشمن انگریز تھا۔ پنڈاروں کو تو کسی دوسرے وقت بھی سزا دے سکتا تھا۔ فوراً
تیز رفتار قاصد شویشپ راؤ کی طرف دوڑایا کہ واپس آجائے۔ وہ لشکر سمیت خون کے
گھونٹ پیتا لوٹا تو اسے انگریزی فوج کو روکنے کے لیے سرحد کی طرف بھیج دیا۔

انگریز کہاں تو مہاراجہ کو تو غیب دے رہا تھا کہ پنڈاروں کو ختم کر دے اور کہاں اب
اس کی سیاست یہ کہہ رہی تھی کہ سندھیا کو انہی 'لیٹروں' سے پٹوایا جائے۔ ایک سال

کے عرصہ میں بہادر و نامدار خاں تین بار مرہٹہ علاقوں میں لوٹ مار مچا کر نکل گئے۔ مگر جوہی مرہٹہ لشکر بندھیل کھنڈ کی طرف رُخ کرتے، ایک طرف لکھنؤ اور دوسری طرف علیگرھ سے انگریز فوجوں کی نقل و حرکت شروع ہو جاتی اور مہاراجہ پنڈتوں پر حملہ کا ارادہ ملتوی کر کے اپنی سلطنت کی حفاظت میں مصروف ہو جاتا۔ انگریزی خطرہ کے علاوہ مرہٹہ حریف جہونت راؤ ہلکر کا دھڑ کا الگ جی کا زیاں بن گیا تھا۔

بندھیل کھنڈ کے جنگلوں میں ایک طرف نواب چیتو کی ریاست نار اور دوسری طرف کریم خاں کی چھوٹی سی آزاد ریاست کے علاوہ پنڈاروں کی بیشتر آبادیاں اسی علاقے میں واقع تھیں جو شمال کی جانب سے سندھیا کی سلطنت گوالیار اور جنوب مغرب کی طرف مہاراجہ جہونت راؤ ہلکر کی سلطنت اندور سے ملتا تھا۔ مغرب میں کوٹہ، اودے پور، لاشکر اور مشرق میں جھانسی، بھوپال، رتلام اور ساگر کی ریاستوں کا جال پھیلا تھا۔

سندھیا کی بے تدبیری نے پنڈاروں کو اپنا دشمن بنا لیا جب کہ ہلکر ان کی دوستی کا دم بھرتا رہا۔ سندھیا شاہی پنڈارے گوالیار سے اپنا تعلق توڑ چکے مگر ہلکر شاہی پنڈارے ابھی تک اندور سے دوستی کا پیوند رکھتے تھے۔

ان حالات میں جب نواب کریم خاں سومپلہ گوالیار کی جیل میں قید تھا اور بہادر و نامدار خاں کے پنڈارے سندھیا کے سرحدی علاقوں کو بار بار تاحت و تاراج کرنے میں مصروف تھے۔ مہاراجہ کے سارے حریف اس کے ساتھ جوہے بی کا کھیل کھیلنے نظر آتے۔ تجربہ کار سیاستدان کی طرح سندھیا کی نظریں چاروں طرف لگی تھیں۔ ہلکر کی بجائے

ستارہ، شعلہ پود اور ناگپور کی مرہٹہ ریاستوں پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ انگریز کے ساتھ نمٹنے کے لیے بھی اس کا ذہن لومڑی کی مانند نئے نئے خاکے بنتا رہتا تھا۔ مگر کریم خاں کو گرفتار کر کے جس مصیبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے زندگی بھر کے تجربات کو ملیا میٹ کر دیا۔ پنڈاروں کو نیست و نابود کر دینے کے تمام ارادے قوت و شوکت کے باوجود پورے ہوتے دکھائی نہ دیتے تھے اور حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ وہ تو کمبل کو چھوڑنا چاہتا تھا لیکن اب کمبل اسے نہیں چھوڑ رہا تھا۔

سندھیا نے ایک سال کے عرصہ میں دوسری بار اپنے قیدی سے ملاقات کی اور اس کے سامنے تجویز پیش کی۔ اگر پنڈار سے سلطنت گوالیار سے وفاداری کی ضمانت دے دیں اور نواب اپنے بھتیجے کو پرغال کے طور پر مہاراجہ کی تولیت میں دینے پر راضی ہو تو اسے رہا کر دیا جائے گا لیکن کریم خاں نے یہ پیشکش پائے استحقار سے ٹھکرا دی۔ بڑے گستاخانہ لہجے میں جواب دیا۔

’مہاراجہ سندھیا! جو حکمران طاقت ور ہونے کے باوجود دوسروں سے فریب کرتا اور اپنے میزبان کو گھر بلا کے دھوکے سے زنجیر بننا دیتا ہے اس کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔‘

سندھیا اس گستاخی پر ہلکا اٹھا مگر غصہ ضبط کر کے سیاست کی زبان میں بولا۔
’تمہیں اپنی ریاست کی آزادی سب سے عزیز ہے اور ہم آزادی و حکمرانی کی سند کے کو تمہاری یہ خواہش پوری کر سکتے ہیں۔‘

’آزادی مانگنے سے کبھی نہیں ملتی۔ صرف قوتِ بازو سے حاصل کی جاتی ہے۔‘
’مگر ایک سال پہلے تم نے مابدولت سے اپنی آزادی کی درخواست کی تھی۔‘
’وہ ہماری بھول تھی، غلطی تھی اور ہم دوبارہ ایسی غلطی کبھی نہیں کریں گے۔‘
’تو تم ہم سے لڑنا چاہتے ہو؟‘

’لڑائی آپ نے چھیڑی ہے مہاراج! اور جب تک اس کا فیصلہ نہیں ہوگا، نہ آپ کو چین آئے گا، نہ ہمیں۔‘

’موت بھولو کریم خاں! تم ہماری قید میں ہو۔‘

’آپ بھی یاد رکھیں، زنجیر بہادروں کا زیور ہے اور جب کشتی ہے تو زمانہ اس کی جھنکار سے گونج اٹھتا ہے۔‘

’عزت زنجیر سے نہیں تاج و تخت سے ملتی ہے۔‘

’کبھی ایسا شخص بھی عزت حاصل کر لیتا ہے جس کے گریبان میں پونڈ لگے ہوتے ہیں۔ اگر ہم آزادی کی زندگی حاصل نہ کر سکے تو عزت کی موت ضرور مریں گے۔‘

’ تو تمہیں ہم سے دوستی منظور نہیں؟‘

’ آپ نے پنڈاروں کو حقیر سمجھ کر جس دشمنی کا آغاز کیا ہے اس کا جواب ہم نہیں

ہماری تلواریں دیں گی۔‘

سندھیا اچانک مشتعل ہو گیا۔ ’ تمہاری یہ جرات کہ ہندوستان کے مہاراج کو لٹکارتے ہو۔ ہم تمہاری رہائی کا جو ارادہ کیا تھا اُسے منسوخ کرتے ہیں۔‘

’ ہمیں بھی بخشی ہوئی آزادی دے کر نہیں۔‘

سندھیا گرجا۔ ’ اسے لے جاؤ۔ اب یہ شخص آزادی کے سونے ہی دیکھتا رہے گا۔‘

اور اس حکم کے ساتھ ہی ملاقات ختم کر دی۔



گوالیار کے حالات روز بروز اُبھتے جا رہے تھے۔ مرہٹہ و ربار جو پہلے ہی سازشوں

کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ اب راجپوت اور مرہٹہ سرداروں میں اس طرح تقسیم ہونے لگا کہ

واضح طور پر دو گروہ بن گئے۔

سردار سرچی راؤ گتھلی نرو سامنے نہیں آیا مگر گوالیار سے دور بیٹھا راجپوتوں کی ہمدردی

حاصل کرنے میں کوشاں تھا۔ حکومت سے اس کے علاوہ ہوتے اور امبا جی کے برسرِ اقتدار

آتے ہی امورِ دربار اور دوسرے انتظامی معاملات میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان میں مرہٹہ

سرداروں کو فوقیت دی گئی تھی۔

’ ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت‘ کی مشہور ضرب المثل کے مطابق امبا جی نے جو

نیا انتظامی ڈھانچہ کھڑا کیا اس پر کسی نے اعتراض نہ کیا تھا لیکن حالات کے ساتھ ساتھ اب

ان تبدیلیوں پر چوکیوں پر شروع ہو گئیں۔ سرکاری عہدوں و منصب سے راجپوتوں کے مفاد

کو جو دھچکا لگاتا تھا۔ اس پر اظہارِ خیال ہونے لگا۔

مہاراجہ سندھیا کی ہوس پرستی کی کہانیاں پہلے ہی مشہور تھیں۔ اب چاند بانی کے حوالہ سے وہ کہانیاں پھر دہرائی جانے لگیں اور سر جی راؤ کو موقع مل گیا کہ راجپوتوں کی حق تلفی کے ساتھ اپنی بیٹی کی منطو مسیت کا مقدمہ بھی پیش کر سکے جسے محلاتی افتداری سے محروم کر دینے کی سازش ہو رہی تھی کیوں کہ امبا جی چاند بانی کو جس طرح راج رنوا میں داخل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد مہارانی بیجا بانی کے حکم و اختیار کو ختم کرنا تھا۔

سر جی راؤ نے راجپوت سرداروں کے ذریعے خفیہ ہی خفیہ جو فیضان تیار کی اس میں اس بات پر خاص زور دیا گیا تھا کہ انگریزوں نے لکھنؤ اور علی گڑھ کی طرف سے گوالیار کو گھیر رکھا ہے۔ جس وقت راؤ ہلکر الگ گھات لگائے بیٹھا ہے۔ اب مہاراجہ کی بوا لہو سی نے چاند بانی سے بیاہ کے شوق میں نواب کریم خاں کو قید کر کے پنڈاروں کی دشمنی بھی بھول لے لی ہے۔

افسر بکارِ خاص نے اس قسم کی کئی رپورٹیں مہاراجہ کے ملاحظہ کی خاطر پیش کیں۔ راجپوتوں میں پیدا ہونے والی بددلی اور پنڈاروں کی دشمنی کے محرکات پر لوگوں میں جو باتیں ہونے لگی تھیں۔ ان کی تفصیل بھی رپورٹوں میں درج ہوتی تھی۔ جس نے سندھیا کو پہلے سے کہیں زیادہ بد مزاج اور چڑچڑا بنا دیا تھا۔

کمپنی سرکار اور مہاراجہ ہلکر پہلے ہی اس کے دشمن تھے۔ اب پنڈاروں کی عداوت اور مار دھاڑنے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ جنہیں اس نے کبھی اہمیت نہ دی تھی لیکن یہ بھی قسمت کا عجیب و غریب کھیل تھا کہ دولت راؤ سندھیا جیسا زبردست حکمران پنڈاروں کی گوشمالی پر بھی قادر نہ رہا تھا کیونکہ جو نہی وہ ان کے خلاف فوج کشی کا ارادہ کرتا ایک طرف انگریزی اور دوسری طرف ہلکری فوجیں حرکت میں آجاتیں۔ حالات کی اس ستم ظریفی نے بھی اُسے بہت پریشان کر دیا تھا۔

ان ساری باتوں کا شاخسانہ چاند بانی تھی جسے اس نے اپنے وقار کا مسلہ بنا لیا تھا۔ سندھیا کی زندگی میں درجنوں عورتیں آئی تھیں۔ کئی عورتوں سے پریم بھی کیا تھا۔

انہی میں ایک بیجا بائی تھی جو اس کے دل و دماغ پر راج کرتی رہی تھی لیکن علی گڑھ کے چاند کے سامنے اب اس کی چمک دمک بھی ماند پڑ گئی تھی اور وہ اس کے حصول کی خاطر دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ جوں جوں چاند بائی کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ سندھیا کے دل میں اس کے پریم کی آگ تیز ہوتی چلی گئی اور وہ اس انتظار میں گھڑیاں گزارنے لگا کہ ایک نہ ایک دن تارے اس کے ملاپ کی خوشخبری دیں گے۔

اس دوران مہاراجہ نے ایک عجیب و غریب سنا بھی دیکھا کہ راج محل میں عیش و عشرت کی محفل برپا ہے۔ وہ چاند بائی کے ساتھ لگن منڈل میں بیٹھا ہے۔ بہا پر وہت اشوک پڑھ رہا ہے پھر شہنائیوں کی مدھر موسیقی میں وہ جملہ عروسی میں داخل ہوتا ہے۔ اس سہنے کی تعبیر تو یہ تھی کہ وہ مشکلوں اور مصیبتوں سے دوچار ہونے والا ہے مگر سینے میں پیش آنے والے مناظر کا دل و دماغ پر اتنا شدید اثر تھا کہ خواب کو حقیقت سمجھ بیٹھا۔ ایک بار پھر راج جو تیشی کو بلایا۔ ستاروں کا حال پوچھا اور جو تیشی نے چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ اپنا سابقہ جواب دہرا دیا۔

”مہاراج! جو تیش دیا کہتی بنے آکاش پر ستارے چال بدل رہے ہیں مگر دھرتی پر حالات بدلنے میں ابھی کچھ سہے باقی ہے۔“

اس بار مہاراجہ نے یہ نہیں پوچھا یہ سہے بہتوں اور مہینوں کا ہے یا سالوں کا، سینے کی کیفیت میں کھو کر جیسے برسوں کا انتظار بھی گراں نہ رہا اور اسی خیال میں لگن تھا کہ لگن ضرور ہوگا۔ چاند کی ولہستگی کے لیے گیتی اور اس کے ساتھ تین پڑھی لکھی کنیزیں جو نواب کریم خاں نے ”حمین نذرانے“ کے طور پر پیش کی تھیں اس محل پر مامور کر دی تھیں جس کا نام بھی چاند محل رکھ دیا گیا تھا، چاہتا تھا وہ گوالیار میں خود کو اجنبی اور تنہا محسوس نہ کرے جب سے گیتی اور دوسری کنیزیں آئی تھیں وہ خوش رہنے لگی اور ان سے باتیں کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی تھی۔

سندھیا شام کے لمحے عموماً چاند محل میں گزارتا۔ چاند بائی کو دیکھ کر اپنی ادھی پریشانیاں

بھول جاتا اور اس سے باتیں کرتا ہوا سینوں میں کھوجاتا تھا۔ دنیا کی نظروں میں کتنا عیاش اور ہوس پرست سہی مگر چاند کو جو وحی دے بیٹھا اس پر پوری طرح قائم تھا کیا مجال کہ کبھی نشے کی حالت میں بھی کوئی " حسین فرمائش " لبوں تک آئی ہو۔ ہمیشہ احتیاط کو ملحوظ رکھتا اور رخصت ہوتے وقت کبھی کبھی پوچھ لیتا تھا۔ چاند! ہم سے کوئی بھول تو نہیں ہو گئی۔ ہم نے تمہیں پریشان تو نہیں کیا؟

یہی عادت چاند کو اچھی لگی اور اس کا بے حد احترام کرتی تھی۔ کبھی کبھی دل چسپی کا کچھ سامان بھی فراہم کر دیتی جس سے خوش ہو کر سندھیا اُسے ہمارا نیوں کے جلاپے کی کہانیاں سنا تا اور اُن کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار بھی کرتا تھا۔ چاند اس کی پریم کتھاسن کر پریشان ضرور ہو جایا کرتی تھی مگر جب سے سندھیا کا سنا سنا تھا ایک عجیب سا سکون محسوس کرنے لگی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا، خوابوں کی تعبیر ہمیشہ نہیں تو اکثر اُلٹ ہوتی ہے۔

گویا میں اسے کوئی تکلیف، کوئی پریشانی نہ تھی۔ اگر پریشانی تھی تو صرف کریم خاں کی قید و اسیری کی۔ دل تڑپتا تھا تو اپنے محبوب کی مصیبت پر جسے ریاست کے دارالقرار سے جیل کی کال کو ٹھٹھری میں بند کر دیا گیا تھا۔ رات کی تنہائی میں یہ خیال سانپ بن کر ڈسنے لگتا کہ نواب پر اسیری کی آفت اسی کے باعث ٹوٹی ہے۔ وہ اسی کی بدولت زنجیر میں جکڑ دیا گیا ہے۔ اس خیال سے تڑپ تڑپ جاتی اور کئی کئی دن شاخ سے ٹوٹے ہوئے پھول کی طرح مڑھائی مڑھائی رہتی تھی۔ یہاں نواب کی خبر دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اندہ ہی اندہ جلتی سکتی رہتی۔ کبھی موچتی کاش.... وہ اُسے قید سے چھڑا سکے۔ کاش.... کوئی ایسا شہید ظہور میں آئے کہ پٹارے یلغار کرتے گویا میں گھس آئیں اور نواب کو جیل سے نکال کر لے جائیں لیکن خود مجبور و بے بس تھی اور پٹارے مرہٹوں کے مقابلے میں بے حد کمزور تھی۔

نواب کی اسیری پر دوسرا سال ختم ہو رہا تھا اور پٹاروں کی سرگرمیاں صرف سرحدی بستیوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان کی لوٹ مار روکنے کے لیے مرہٹے بندیل کھنڈ کے آس پاس چھاؤنیاں ڈال کر بیٹھ گئے تھے۔ جگہ جگہ فوجی چوکیاں قائم ہو گئی تھیں۔ گویا رکو آنے والا

ہر راتہ تلواروں، بھالوں، بندو قوں اور زری کے پرچموں سے گھرا ہوا تھا۔ گوالیار تک بلغار
پنڈاروں کی طاقت سے باہر تھی پھر رہائی کا شعبہ کیسے ظہور میں آتا؛ نواب کریم خاں اونچی
اونچی دیواروں کے قید خانے میں اور وہ خود مہاراجہ سندھیہ کے دل و دماغ کے حصار میں
اسیر تھی۔

اس قید میں اطمینان کا کوئی پہلو تھا تو صرف اس قدر کہ مہارانی بیجا بائی اس کی ہمدرد
وٹنگسار بن گئی تھی۔ ایک ہی درد مشترک نے دو عورتوں کو ایک دوسری سے قریب کر
دیا تھا۔ کبھی چوری چھپے ملاقات بھی ہو جاتی۔ ورنہ ساوتری اور گنتی ان کے درمیان پیغام
رسانی کا فرض ادا کرتی تھیں۔

بیجا بائی نے چاند کے حال پر ایک مہربانی اور کی۔ جیل کے ایک راجپوت سنتری
کے ذریعے نواب کو ہمدردی کا پیغام بھیجا اور چاند بائی کی قربانی کی داستان سے آگاہ کیا
کہ وہ صرف اس لیے امباہی کے ساتھ آنے کا فیصلہ کر بیٹھی تھی کہ کہیں ریاست کی آزادی
کا فرمان معرضِ خطرہ میں نہ پڑ جائے، کہیں مہاراجہ ناراض ہو کر نواب کو حکمرانی کی سند دینے
سے انکار نہ کر دیں۔ بچاری کو کیا خبر تھی کہ یہ قربانی رائیگاں جائے گی اور نواب کے
ساتھ دھوکہ کیا جائے گا۔ مہارانی نے یہ بھی کہلوا بھیجا وہ فاتی طود پر نواب سے ہمدردی
رکھتی اور اس کی رہائی چاہتی ہے مگر خود کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ جیل کی دیواریں مضبوط اور اس
کے ہاتھ کمزور ہیں۔ تاہم اتنا یقین دلایا تھا کہ اس کے چیتے جی چاند کی عزت پر کوئی آنچ
آ سکتی ہے نہ مہاراجہ کا سپنا پورا ہو سکتا ہے۔

روہیلہ نواب چاند کی قربانی اور وفاداری کے اس پہلو سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ
چاند بائی کی 'بے مرضی' کو کوئی معنی نہ پہناسکا تھا۔ یہی سمجھتا رہا کہ طوائف زادی تھی۔
دولت و اقتدار کے لالچ میں آگئی۔ شریف زادی ہوتی تو جان دے دیتی لیکن جانے کا نام
نہ لیتی۔ اس کی 'بے مرضی' کو ترک تعلق اور بے وفائی پر معمول کر کے خود ہی گھائل ہوتا رہا
تھا۔ چاند نے تعلق توڑا تھا سندھیانے زنجیر پہنائی تھی۔ دونوں گھاؤ بڑے گہرے اور جان
لیواتھے۔ بظاہر زنجیر میں جکڑا ہوا بھی گستاخ و شوریدہ سر دکھائی دیتا تھا مگر اصل میں بیٹھے

سے بیزار ہو چکا اور مرنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ اب جو چاند بائی کی قربانی کا حال سنا اس کے تعلق توڑ لینے کی حقیقت کھلی تو قید خانے کی دیواروں سے سر ٹکرانے اور گھائل پچھی کی مانند تڑپنے، پھڑپھڑانے لگا۔ بار بار اپنے آپ کو کوستا اور کال کو ٹھٹھی کی گونگی، بہری دیواروں سے باتیں کرتا تھا۔

کریم خاں نے وہ رات نمدے کے بستر پر کروٹیں بدلتے، غمِ محبت میں جاگتے، تڑپتے اور اپنی رہائی کی تدبیریں سوچتے گزار دی۔ کہاں تو محبت اور سیاست کی بازی ہار دینے کے بعد اس قدر دل شکستہ ہو گیا کہ قید کی زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگا تھا۔ کہاں چاند بائی کی قربانی اور وفا کی حقیقت جان کر یک لحنت بدل گیا۔

دل میں زندہ رہنے کا شعلہ پوری شدت کے ساتھ مہرک اٹھا۔ نبضوں میں خون کی گردش تیز تر ہو گئی مگر اب جینا چاہتا تھا تو صرف اس لیے کہ چاند کو مہاراجہ سندھیائی کی قید سے چھڑا سکے اور اس سے ایسا انتقام لے کہ زمین و آسمان بھی کانپ اٹھیں۔

اس رات کی صبح نئی زندگی کے ولولوں کے ساتھ طلوع ہوئی۔ اب اس نے جیل سے فرار کی ٹھان لی جس کا پہلے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ دروازے کے چھوٹے سے روزن سے بار بار جھانکتا اور اس راجپوت سنتری کو ڈھونڈتا تھا جو مہارانی کا پیغام لے کر آیا تھا۔ وہ یقیناً اس کے کام آسکتا تھا مگر کئی روز کی تانک جھانک کے باوجود اس کی صورت نظر نہ آسکی۔ یہ اُمید بندھ گئی تھی کہ شاید مہارانی کی طرف سے پھر کوئی پیغام آئے لیکن یہ اس بھی پوری نہ ہوئی۔ دن، ہفتے، مہینے گردشِ حالات کی گرد اُڑاتے گزرتے چلے گئے۔ دل میں زندگی کا جو شعلہ بھڑکا اسے وقت کی سرد مہری بچھانے پر تلی ہوئی تھی۔ مہاراجہ سندھیائی کے سلوک سے معلوم ہوتا تھا اسے کبھی رہا نہیں کرے گا۔ اور وہ اسی کال کو ٹھٹھی میں تڑپ تڑپ کر، گھٹ گھٹ کر مر جائے گا مگر کریم خاں اب جیل میں مرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

اسیری پر تیسری برسات گزر رہی تھی۔ کئی دن سے جھٹھی لگی تھی۔ مسلسل بارش سے جیل کے محافظ، پریدار، سنتری سب بھیگی پٹی بنے ادھر ادھر دیکے ہوئے تھے اور کریم خاں

اپنی کوٹھڑی میں کھڑکی کے پاس کھڑا برستے پانی کا نظارہ کر رہا تھا۔ یہ کھڑکی اس نالے کی طرف کھلتی تھی جو اس کی کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ ساتھ بہتا تھا۔

نالہ زیادہ چوڑا تو نہیں تھا البتہ پندرہ سولہ فٹ گہرا تھا۔ دونوں جانب چھوٹی اینٹوں کی مضبوط عمودی دیواریں تھیں۔ عام حالات میں اس کا پانی کناروں سے دس گیارہ فٹ نیچے بہتا اور ایک فرلانگ کے فاصلے پر جیل کی بلند اور مضبوط فصیل سے گزرتا تھا جہاں دو چوڑے درے بنے ہوئے اور ان میں لوہے کے بھاری جنگلے نصب تھے۔ فصیل کے ان دروں کی دونوں جانب ڈو کوٹھڑیاں یا بارکیں تھیں جہاں ہر وقت سنتری موجود رہتے تھے۔

برسات کے موسم میں نالہ کناروں تک بھر جاتا اور پانی کے تیز دھارے سیلاب کی طرح گزرتے تھے۔ ان ایام میں پانی کے اخراج کی خاطر دونوں دروں میں لوہے کے جنگلے اوپر اٹھادیے جاتے تھے تاکہ تیز دھاروں اور پانی کے دباؤ سے فصیل نہ ٹوٹنے پائے۔ کریم خاں نے نالے کو دیکھا اور سوچا اگر وہ کسی طرح اس نالے میں چھلانگ لگا سکے تو پانی میں تیرتا ہوا فصیل پار کر سکتا ہے۔ یوں تو اس عرصے میں فرار کی کتنی ہی تدبیریں سوچی تھیں مگر یہ تدبیر سب سے بہتر تھی اور اس پر صرف برسات کے موسم میں عمل ہو سکتا تھا جب نالہ کناروں تک بھر جاتا تھا۔ ورنہ عام حالات میں اس کا پانی دس گیارہ فٹ نیچے بہتا اور اس میں کودنا موت کو گلے لگانے کے مترادف تھا کیونکہ اتنی بلند عمودی دیوار پر چڑھ کر کنارے تک پہنچنا ناممکن تھا۔ پھر فصیل کے دروں میں آہنی جنگلے بھی نیچے گرے رہتے اور صرف برسات کے دنوں میں اوپر اٹھائے جاتے تھے۔

فرار کی یہ تدبیر خطرناک ضرورت تھی کیونکہ اگر کوئی پہرے دار نالے میں کودتا ہوا دیکھ لے تو اسے بندوق کا نشانہ بنا سکتا تھا لیکن کریم خاں نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ ساون کا مہینہ آدھا گزر چکا تھا اور نالہ صرف ساون بھادوں میں کناروں تک چڑھتا تھا۔ اس کے پاس فرار کے لیے صرف ڈیڑھ مہینہ تھا۔ اگر وہ کسی طرح نالے کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی مضبوط سلاخیں اور اپنے پاؤں کی زنجیر کاٹ سکے تو رہائی ممکن تھی۔

کوٹھڑی کے اندر بھی لوہے کی زنجیر ہر وقت اس کے پاؤں میں رہتی تھی جس

کا مضبوط آہنی کڑا دیوار میں پیوست تھا۔ یہ اہتمام اس لیے ضروری سمجھا گیا تھا کہ کریم خاں فرار کی سوچ بھی نہ سکے۔ اب اس نے کسی ایسی چیز کی تلاش شروع کر دی جس سے پاؤں کی زنجیر اور کھڑکی کی سلاخیں کاٹ سکے لیکن ایسی چیز دستیاب کہاں سے ہوتی ؟

اس کی نظر دیوار میں پیوست لوہے کی ایک سلاخ پر پڑی جو غالباً دوسرا کڑا نصب کرنے کے لیے ٹھونکی گئی اور اسی حالت میں چھوڑ دی گئی تھی۔ کریم خاں اس سلاخ کو اکھاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ کھانے میں اسے ہفتے میں دو بار گوشت بھی دیا جاتا تھا۔ اس نے چند ہڈیاں احتیاطاً چھپالی تھیں۔ انہی کی نوک سے پختہ دیوار کو کریدتا رہا اور کئی روز کی لگاتار کوشش سے آخر سلاخ اکھاڑنے میں کامیاب ہو گیا جو پانچ چھ انچ سے زیادہ طویل نہ تھی۔ اس کامیابی پر تیرہ چودہ دن کی مسلسل محنت اور مشقت بھی بھول گئی۔ اب اس سلاخ سے پاؤں کی زنجیر کی کوئی کڑی یا اس کا قفل توڑنے کی کوشش شروع کر دی مگر کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ اسی جدوجہد میں ساون پیت گیا بلکہ بھادوں کی کئی تاریخیں بھی گزر گئیں لیکن زنجیر اتنی مضبوط ثابت ہوئی کہ کریم خاں کی ہمت جواب دے گئی۔

برکھارت اس کی بد نصیبی پر آنسو بہاتی رحمت ہو گئی۔ نالے کا پانی پھر اترنا شروع ہو گیا تھا۔ کتک کے مہینے میں اس کی سطح میں گیارہ فٹ تک گر گئی۔ کریم خاں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ اب نالے کے رستے فرار کی کوشش ہی بے سود تھی۔ سوچنے لگا شاید قدرت کو اس کی رہائی منظور نہیں۔ ہمت پر مایوسی چھانے لگی۔ حوصلوں کی دیوار گرتی ہوئی نظر آئی مگر چاند کی اسیری اور بھوری کا خیال نبضوں میں آگ سی بھر دیتا تھا۔ دولت راؤ سندھیا سے انتقام لینے کی تڑپ کسی پہلو چین نہ لینے دیتی تھی۔

اب فرار کی نئی تجویزیں، نئی تدبیریں سوچنے لگا۔ اصل مسئلہ پاؤں کی زنجیر تھا۔ جب تک یہ زنجیر نہ ٹوٹے، فرار ممکن نہ تھا۔ نہ جانے کس آہن گرنے پر زنجیر ڈھالی اور اس کا قفل تیار کیا تھا۔ کریم خاں کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ وقت کچھوے کی رفتار سے گزرتا رہا۔ بد نصیبی کے دن کچھ ایسے طویل ہو جاتے ہیں کہ ایک لمحہ ایک ایک صدی محسوس ہونے لگا۔

اسی کش مکش میں اسیری کا چوتھا سال گزرنے لگا اور برسات کا موسم پھر آگیا۔ اب کے ساون کے ساتھ ہی موسلا دھار بارشیں ہونے لگی تھیں۔ کریم خاں اپنی کال کو ٹھٹری میں زنجیر پہنے پھر کھڑکی سے نالے کو دیکھ رہا تھا جس کی سطح چند ہی روز میں بلند ہو گئی اور پانی کنال سے چھوٹا ہوا بہنے لگا تھا۔ دل میں جذبات کی لہریں موجزن تھیں مگر ذہن میں فکر و یاس کے بھنور گردش کر رہے تھے کہ شاید مڑوں کی قید سے رہائی ممکن ہی نہیں کہ ناگہاں کو ٹھٹری کا دروازہ کھلا اور ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

مہارانی بیجا بائی کا کوئی عزیز مر گیا تھا۔ اس کے کربا کریم پر شرادھ تقسیم ہوا اور مہارانی نے مہاراجہ سے اجازت حاصل کر لی تھی کہ جیل کے تمام قیدیوں میں بھی شرادھ بانٹا جائے گا۔ راج محل کی باندیاں کانسی کی بڑی بڑی طشتریوں میں شرادھ کے پراٹھے لے کر خود جیل میں آئیں بھیکتے موسم میں جب دروازہ کھلا تو ایک باندی پراٹھوں کی طشتری لیے نواب کی کوٹھڑی میں بھی داخل ہوئی۔ دروازہ کے مرہٹہ پہرہ دار نے بتایا کہ مہارانی بیجا بائی نے شرادھ کی روٹی بھجی ہے۔ باندی نے نواب کی آنکھوں میں آنکھیں ملائیں۔ کچھ اشارہ کیا اور کریم خاں اُسے دیکھ کر ذنگ رہ گیا۔ وہ گیتی تھی۔

اس نے طشتری نواب کے سامنے رکھی اور ٹھکتے وقت مدھم آواز میں جیسے شاخوں میں ہوا سرسراتی ہے۔ چاند بائی کا سلام عرض کیا۔ پھر تیزی سے مڑی۔ کوٹھڑی کا دروازہ ایک دھمکے سے بند ہوا اور مقفل کر دیا گیا۔

یہ سب کچھ آنا فنا ہو گیا۔ گیتی کی آمد کچھ ایسی اچانک اور واپسی اتنی تیزی سے ہوئی کہ کچھ کہنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ آندھی کی طرح آئی اور گبولے کی مانند لوٹ گئی تھی۔ نواب چشم حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ چاند بائی کا نام اور سلام بادیسیم کی نکہت بدوش لہر کی طرح سماعت سے ٹکرایا تھا۔ دل و دماغ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی اور دروازہ بند ہو جانے کے بعد بھی کئی لمحے اسی کیفیت میں ڈوبا رہا جس میں گیتی اُسے دھکیل گئی تھی۔

یہ خود فستل دور ہوئی تو شرادھ کا خیال آیا۔ مہارانی بیجا بائی کے عزیز کا کربا کریم گیتی کی آمد، چاند کا سلام، سب ایک ہی زنجیر کی کرٹیاں تھیں۔ ایک کے بعد دوسرا پراٹھا اٹھایا

تو ضرورت سے زیادہ بھاری لگا۔ جلدی سے چاک کیا تو اندر سے چھوٹا سا خنجر اور ایک لمبوتری کنبھی برآمد ہوئی۔ حیران رہ گیا۔ ان چیزوں کا مصرف سمجھنا مشکل نہ تھا۔ یہ شرادھ فرار کا پیغام لے کر آیا تھا۔ کنبھی اٹھا کر پاؤں کی زنجیر کے قفل میں گھمائی اور فرط مسرت سے اچھل پڑا۔ وہ قفل جو ڈیڑھ دو سال کے دوران متعدد کوششوں کے باوجود کھلنے کا نام نہ لیتا تھا صرف دوسرے جھکے میں کھل گیا۔ اب وہ کم از کم کوٹھڑی کے اندر آزاد تھا۔ اچانک خیال آیا، فرار کی توری کوشش مناسب نہ ہوگی۔ ممکن ہے شرادھ بانٹنے والی نازک کلاٹیاں مروڑ دی جائیں۔ خنجر آستین میں چھپایا پاؤں میں پھرنے کی بجائے لی اور قفل لگا کر کنبھی شلووار کے نیچے میں محفوظ کر لی۔

زنجیر کھل گئی مگر فرار کے لیے مناسب وقت کا انتظار تھا۔



اب کے برسات کا موسم قیامت کی خبر لے کر آیا تھا۔ برسات اور وہ بھی اُدھ اور بندیل کھنڈ کی ہندوستان میں ہمیشہ مختلف ہوتی ہے لیکن اس مرتبہ تو مضمون ہی کچھ اور تھا۔ جل تھل ایک ہو رہے تھے۔ گھنے گھور بادل گھر گھر کے آتے جیسے مسرت ہاتھیوں کے دل چنگھاڑتے پھنکارتے اور زمین کی چھاتی دہلاتے مہا گے آتے ہوں۔ آن کی آن میں آسمان سیاہ پڑ جاتا۔ چاروں طرف اندھیرے سے چھا جاتے۔ ان اندھیروں میں کوندے لپکتے، بجلی کرطکتی۔ آسمان پر ڈھول بجنے لگتے جیسے دو لشکر میدان میں اتر رہے ہوں۔ پھر وحاد جم، چھماچھم پانی برسنا لگا اور ندی نلے کناروں سے اچھل پڑتے۔ ساون نے آتے ہی جھڑی لگا دی تھی۔ کئی دن سے لوگ گھروں میں دُک کر بیٹھ گئے تھے۔ بازار بند، کاروبار بند اور آمد و رفت کے تمام ذرائع سدود ہو کر رہ گئے تھے۔ چھا جوں پانی برس رہا تھا اور اس کے ساتھ مکانوں کی چھتیں بھی ٹپکنے لگی تھیں۔

فوجی چوکیوں اور چھاؤنیوں میں سپاہیوں کی سرگرمیاں ماند پڑ گئی تھیں لیکن پنڈاریوں

نے برسات کے اسی قیامت خیز موسم میں گوالیار کو تاخت و تاراج کرنے کی ٹھانی تھی۔ بہادر اور نامدار خاں اپنے برق رفتاروں کو لے کر نکلے اور سرحدی چوکیوں کے درمیان سے کوندے کی مانند لپکتے جھپکتے مرہٹہ سلطنت پر ٹوٹ پڑے۔ اس وسیع پیمانے پر لوٹ مار ہوئی کہ بستوں کی بستیاں صاف ہو گئیں۔

پنڈارے تقریباً دو سال کی پٹا مزار غاموشی کے بعد اپنی کچھاروں سے نکلے اور مرہٹہ چوکیوں کو تہس نہن کرتے آگے بڑھے تھے۔ اس زلزلے کے جھٹکوں سے گوالیار ہل گیا۔

یہ بھی خبر ملی تھی کہ پنڈارے اندور کی راجدھانی اُجین میں مہاراجہ جسونت راؤ بھکر کے فوجی مشیروں سے ساز باز کو کے آئے ہیں۔ مہاراجہ سندھیانے اپنے مدارالمہام امباہی کو حکم دیا کہ وہ خود مقابلے کے لیے نکلے اور پنڈاروں کے ساتھ اُن کی ریاست کو بھی تباہ و برباد کر دے۔ امباہی بڑے شکر کے ساتھ زدی کے پرچم لہراتا کر وافر کے ساتھ روانہ ہوا مگر زدی کے پرچموں نے برسات میں لہانے سے انکار کر دیا۔ بھگے پرچم بانسوں سے چمٹ کر رہ گئے۔

ادھر موٹا دھارا پاشوں کی وجہ سے ندی نالے اُچھل رہے تھے۔ تھوڑے مسدود اور لشکر کا سامان لے کر چلنے والی گاڑیاں نقل و حرکت سے معذور تھیں۔ نہ بیل گاڑیاں کھینچتے تھے نہ گدھے اور نہ چرکام دیتے تھے۔ پیتے پانی اور کچھڑ میں دھنس دھنس جاتے۔ امباہی بڑے حملے کی تیاری کر کے نکلا تھا۔ تو ہیں بھی ہمراہ تھیں مگر توپوں کو کھینچنے والے گھوڑے چند قدم کے بعد پانپنے لگ جاتے تھے اور پنڈاروں کی گوشمالی کرنے کے لیے جس تیزی اور تیز رفتاری کی ضرورت تھی اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ یہ فوجی مہم آفاذ ہی میں ناکام ہوتی نظر آنے لگی۔

راہپوت سرداروں کو امباہی کی کمان پر طعنہ زنی کا موقع مل گیا اور سرحدی راؤ گنہکی کی لٹائی ہوئی آگ اندر ہی اندر سکنے لگی۔ امباہی نے بڑے حملے کا منصوبہ ترک کر کے سواروں کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ کر پنڈاروں کے تعاقب میں دوڑایا۔ بہادر اور نامدار خاں بھی اب کے فارت گری کی بساط کے سارے نقشے ذہن میں جما کر حملہ آور ہوئے اور دشمن کی نقل و حرکت کی پوری خبر رکھتے تھے۔

دو دنوں حریف ایک دوسرے کی تاک میں تھے۔ مرہٹوں کا ایک بڑا دستہ جس کی کمان

مہاراجہ سندھیا کی ایک مرہٹہ رانی کا بھائی کر رہا تھا، پنڈاروں کے گھیرے میں آگیا۔ بہادر نے مرہٹہ دستوں سے اس کا ہر تعلق کاٹ کر رکھ دیا۔ نامدار خاں نے امبا جی کو اپنی طرف الجھالیا اور ادھر ادھر سمجھانے لگا۔ اس عرصے میں ایک معمولی سی جھڑپ کے بعد راجہ مارنے ہتھیار پھینک دیئے اور مرہٹوں کو جنگی قیدی بنا لیا گیا

امبا جی گوالیار سے بہادر خاں اور نامدار خاں کو باز دھلانے کا دعویٰ کر کے چلا تھا۔ مرہٹہ دستہ کے ساتھ مہاراج کے سالاجی کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ بہادر کو پیغام بھیجا کہ تاوان لے کر راجہ مار کر چھوڑ دو مگر اس نے بدلے میں نواب کریم خاں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔

امبا جی ادھر تو راجہ مار کر چھڑانے کے لیے بات چیت کی چال کھیل رہا تھا۔ ادھر بہادر کے رسالہ کو گھیرنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اس نے راجہ مار کر چھڑانے اور پنڈاروں پر شب خون مارنے کے لیے اپنی کمان میں ایک دستہ تیار کیا جو صرف مرہٹہ سرداروں اور سواروں پر مشتمل تھا۔ اس میں کسی راجپوت کو شریک نہیں کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اُسے راجپوتوں پر اعتماد نہیں رہا۔ امبا جی کو فوراً ہی اس حماقت کا جواب مل گیا۔ ایک راجپوت سردار نے بہادر کو خفیہ طور پر شیخون کے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔

دوسری مصیبت یہ ٹوٹی کہ جب امبا جی نصف شب کے قریب اپنے مرہٹہ سرداروں کے ہمراہ شیخون مارنے لگا زور کی بارش شروع ہو گئی۔ وہ اس بارش کو اپنے لیے نیک فال سمجھا کہ پنڈارے خمیوں میں دبا کر آرام کر رہے ہوں گے۔ آسانی سے اُنہیں مار لے گا اور اگلا پھلا سارا حساب بے باق کر دے گا مگر نہیں جانتا تھا کہ بہادر نے اس کے استقبال کا کیسا عمدہ انتظام کر رکھا ہے

شیخون کے شوق میں مرہٹہ سوار بارش میں بھگتے اس جنگل میں گھستے چلے گئے جہاں پنڈارے چھاؤنی ڈالے بیٹھے تھے۔ بارش کے ساتھ تیز ہوا سے سارا جنگل ایک پراسرار سی 'شائیں شائیں' اور ہواؤں کی سیٹیوں سے گونج رہا تھا۔

مزاحمت کا کوئی نشان دکھائی نہ دیتا تھا مگر جب مرہٹے جنگل میں کافی دور تک

اگے نکل آئے۔ اُن کا استقبال شروع ہو گیا اور درختوں کی شانوں میں چھپ کر بیٹھے ہوئے پنڈاروں کی بندوقیں دھاڑتے لگیں۔ وہ جنگل میں ہانکا کرنے والوں کی طرح مختلف اطراف سے داخل ہوئے تھے اور بندوقیں بھی مختلف اطراف سے داعی جا رہی تھیں۔ آن کی آن میں بیسیوں ہواؤں خون اور کچھڑ میں لوٹ گئے۔ برتے پانی، ڈھول بجاتے بادلوں اور شوکتی طوفانی ہواؤں میں بندوقوں کی خوفناک آوازوں، گرتے ہوئے سواروں کی ہچکوں اور گھوڑوں کی ہنہناہٹوں کے شور کا اضافہ قیامت کی خبر دینے لگا۔

مرٹوں کی بدقسمتی یہ تھی۔ وہ اندھیرے کی وجہ سے درختوں میں چھپ کر بیٹھے پنڈاروں کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے مگر خود بے تماشا اُن کی بندوقوں کا شکار ہو رہے اور ادھر ادھر بھاگتے پھرتے تھے۔ اچانک بجلی چمکی تو پنڈارہ سوار ایک دیوار کی طرح سامنے کھڑے نظر آئے۔ اسی لمحے بہادر کی آواز گونجی۔

’امبا جی پر گولی نہ چلانا اسے زندہ گرفتار کرنا ہے۔‘

یہ الفاظ سن کر امبا جی کے چمکے چھوٹ گئے۔ فوراً واپسی کا بگل بجایا اور خود سواروں سے کٹ کر ایک طرف بھاگا کہ دھوکہ دے کر نکل جائے۔ بہادر نے اس کا ارادہ بھانپ کر گھوڑا تعاقب میں ڈال دیا اور فوراً سر پر اسپنچا۔ گھوڑا قریب لاکر نیزہ مارا مگر مرٹہ کندھے پر زخم کھا کر نکل گیا۔

ایک گڑھا پھلانگتے ہوئے بہادر کا گھوڑا پھسلا۔ اس کے ساتھ وہ بھی گرا مگر دونوں فوراً سنبھل گئے۔ اس آواز میں امبا جی دودھ نکل گیا تھا۔

اس شبنون میں اڑھائی تین سو بہترین سوار ہلاک اور ایک سو کے لگ بھگ زخمی ہوئے۔ اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کے ساتھ وہ بھی پنڈاروں کے ہاتھ لگے۔ راجپوت سرداروں نے ہرٹ امبا جی کو اس شکست و ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرایا جس نے راجپوتوں پر اٹاؤ نہیں کیا تھا یہ بات بڑھی اور مہاراجہ تک پہنچی جس نے امبا جی کو فوراً گواہیوار میں طلب کر لیا۔ جہاں ویدہ سندھیل نے راجپوت اور مرٹہ سرداروں کی کشمکش کو بڑی ہوشیاری سے ختم کرنے کی کوشش کی۔ راجپوتوں سے پوچھا کہ پنڈاروں کی غارت گری کا کیا علاج کیا جائے؟ انہوں نے

نواب کریم خاں کی رہائی کا مشورہ دیا۔ امبا جی سے تنہائی میں گفتگو ہوئی تو وہ بھی کہنے لگا۔ "مہاراج! جیب تک نواب قید ہے پٹارے لوٹ مار سے باز نہیں آئیں گے۔"

سندھیا چند لمحے سوچتا رہا پھر حکم دیا۔ "امبا جی! تم خود کریم خاں سے جا کر ملو۔ اگر وہ ضمانت دے دے کہ پٹارے آئندہ گوالیار کو تاحت و تاراج نہیں کریں گے تو ہم اُسے رہا کر دیں گے مگر پٹاروں کو بھی تمام مرہٹہ قیدی رہا کرنے ہوں گے۔ بہادر اور نامدار خاں کو بھی سندھین بھیج دو کہ مرہٹہ قیدیوں کے بدلے ہم نواب کو رہا کرنے پر تیار ہیں۔"



دوسرے دن مرہٹہ ملارا المہام نواب کریم خاں سے رہائی کی شرطیں طے کرنے کے لیے صبح سویرے جیل میں پہنچ گیا لیکن یہ خبر سننے ہی پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کہ نواب رات کو قید خانے سے فرار ہو گیا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ کسی کو اس کے فرار کی خبر تک نہ ہو سکی تھی۔ رات وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی سنتری اور پیر پارسب کمروں میں دبک کر سو گئے تھے۔ آدھی رات کے وقت اتفاقاً ایک ملازم یہ دیکھنے کے لیے کہ بارش کتنی ہے یا نہیں۔ جب کمرے سے نکلا تو اس نے اندھیرے میں کسی کے نالے میں گودنے کی آواز سنی اور فصیل کے سنتر لڑنے کو جونا لے کے دڑوں سے ملحقہ بارکوں میں پہرے پر تھے آواز دے کر پوچھا کہ نالے میں کون کھڑا ہے؟ بارش کے شور کی وجہ سے آواز سنتریوں تک نہ پہنچ سکی، غالباً وہ سو رہے تھے تیسیر یا پوچھی آواز پر دشوانا تھ سنتری نے جواب دیا۔ اس موسم میں بھلا کون نالے میں گودے گا۔ تم بھی آرام کرو۔"

مگر صبح دیکھا تو نواب کریم خاں کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تھا اور مرہٹہ پیر پاریوں میں سے ایک دروازے کے باہر اور دوسرا کوٹھڑی کے اندر مرا پڑا تھا۔ داروغہ جیل یہ خبر سننے ہی جو اس باختہ ہو گیا۔ فرار ہونے والا قیدی کوئی معمول آدمی نہیں تھا۔

فورا پچیس تیس سپاہی تلاش میں دوڑا دیئے۔ کھوجی بلوائے انہوں نے کھلا کرہ دیکھا اور زنجیر کا قفل دیکھ کر بتایا کہ کنجی سے کھولا گیا ہے۔ یہ سن کر داروغہ لرز اُٹھا۔ نواب کو پہنائی جانے والی زنجیر بھی خاص تھی اور اس کا قفل بھی الوکھا تھا جو کسی کیل اور آہنی تار سے کھل نہیں سکتا تھا۔ اس کی کنجی ہر وقت داروغہ کی تحویل میں رہتی اور اس وقت بھی اسی کے پاس تھی مگر دوسری کنجی کس نے بنائی اور کس طرح کریم خاں کی کال کو ٹھٹری تک پہنچائی؟ یہی سوچ کر داروغہ جو متھرا کا چوبے تھا کانپ کانپ جاتا کیونکہ مہاراج سندھیا اس قسم کی غلطیاں معاف کرنے کا عادی نہیں تھا۔ کھوجیوں کی تحقیق کے مطابق نواب اپنی کو ٹھٹری کے دونوں محافظوں کو ٹھکانے لگا کر بڑے اطمینان سے صحن میں آیا۔ بارش اور تاریکی نے اس کا ساتھ دیا۔

اس نے نالے میں غوطہ مارا اور پانی کے اندر ہی اندر تیرتا ڈیڑھ فرلانگ دور جا کر جنوبی کنارے پر نکلنا۔ بارش کے باوجود وہاں قدموں کے نشانات موجود تھے کیونکہ گیلی مٹی میں پاؤں دھنس دھنس گئے تھے۔ یہ نشانات جنوب کی طرف تھوڑی دور تک دیکھے جا سکے پھر نابود ہو گئے۔ اندازے کے مطابق صبح کے وقت مندروں میں ناقوس بجتے ہی جب بارش تھم چکی تھی اور لوگ حاجات ضروریہ کے لیے آنے جانے لگے تھے۔ نواب شہر کے جنوبی دروازہ سے باہر نکل گیا۔ داروغہ چاہتا تھا مہاراجہ کو فرار کی خبر ملنے سے پہلے ہی مفروضہ کا کوئی کھوج لگایا جائے تاکہ اس نرزا سے بچ سکے جس کے تصور ہی سے من میں ہول اٹھنے لگے تھے مگر جیل کے سپاہی شہر کے گرد و نواح میں پانچ پانچ چھ چھ میل تک گھوم پھر کے ناکام لوٹ آئے۔ بھلا قفس سے اٹنے والے پیچھی کب ہاتھ آتے ہیں؛

دن چڑھ آیا۔ سورج بکستورہ بادلوں میں روپوش تھا۔ جب مہاراجہ کو نواب کے فرار کی اطلاع دی گئی تو اسے یقین ہی نہ آیا۔ گوالیار کی جیل کی تفصیل بہت اونچی تھی۔ اس کے اندر کال کو ٹھٹری بھی بہت مضبوط تھی جس کے دروازے پر دو مسلح سپاہی چوبیس گھنٹے پہرہ دیتے تھے پھر کو ٹھٹری کے اندر بھی نواب کے پاؤں میں ہر وقت زنجیر بندھی رہتی تھی۔ اتنی پابندیوں کو توڑ کر فرار ہونا کیسے ممکن تھا مگر خبر دینے والا امبا جی خود تھا۔ جو جیل سے

سیدھاراج محل پہنچا۔ اس نے فرار کی تفصیل بیان کی تو سندھیا کے ہوش اٹ گئے۔ فوراً حکم دیا کہ یکے تاز سوار تعاقب میں دوڑائے جائیں اور نواب کو گوالیار کی سرحد عبور کرنے سے پہلے ہی دوبارہ گرفتار کر لیا جائے۔

مہاراجہ کا چین رخصت ہو گیا تھا۔ سارا دن محل میں بیٹھا تعاقب کرنے والے سواروں کی رپورٹیں سنتا رہا۔ جنہیں قاصد ہر تیسرے چوتھے گھنٹے کے بعد راجدھانی میں پہنچا وہے تھے ہر رپورٹ مایوس کن تھی۔ شام تک وہ نواب کی گرفتاری سے بالکل ناامید ہو گیا۔ اس دوران میں ایک اور لرزدہ خیز انکشاف ہوا۔ کمرہ خاص سے مہاراجہ کا چھوٹا سا ذاتی خنجر بھی غائب تھا جسے وہ اہم مواقع پر اپنے لباس کے نیچے پہن کر نکلتا تھا۔ نواب کے فرار کی تفتیش کرنے والے ماہروں نے رپورٹ دی تھی کہ کوٹھڑی کا ایک پیریدار چھوٹے سے تیز خنجر ہی سے ہلاک کیا گیا ہے جس کی نوک اس کے دل تک اتر گئی تھی۔

اس انکشاف نے محل میں تہلکہ ڈال دیا۔ مہاراجہ کے کمرہ خاص سے اس کا ذاتی خنجر اڑنا اور نواب کریم خاں تک پہنچانا کوئی معمولی واقع نہیں تھا نہ کوئی معمولی آدمی اتنی بڑی جرأت کر سکتا تھا۔ مہاراجہ سخت مشتعل اور غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ جیل کا داروغہ اور جیل سے گزرنے والے نالے کی بارکوں میں پہرہ دینے والے سنتری گرفتار کر لیے گئے اور اب تفتیش ہو رہی تھی کہ مہاراجہ کا خنجر چرانے والا کون ہے محل میں کوئی ایسا آدمی ضرور تھا جو نمک سندھیا کا کھاتا اور مہاراجہ کریم خاں سے رکھتا تھا۔ محکمہ خفیہ اسی پر اسرار آدمی کی تلاش میں تھا۔ سندھیا پریشان اور مشتعل تھا۔ دن بھر وقفے وقفے سے پانی برتتا رہا مگر اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہو سکا۔ رات کے وقت منشی کنول نین نے حاضری کی اجازت طلب کی۔ غالباً کلکتے سے ایسٹ انڈیا کمپنی سرکار کا کوئی مراسلہ آیا تھا جسے فوری طور پر مہاراجہ کے ملاحظہ کے لیے پیش کرنا ضروری تھا مگر سندھیا اسے دیکھتے ہی برس پڑا۔

”منشی کنول نین! تمہی وہ آدمی ہو جس نے ہمیں پنڈاروں کی بریادی اور کریم خاں کی گرفتاری کا مشورہ دیا تھا۔“

”مگر مہاراج! یہ مشورہ تو کمپنی سرکار....“

نجانے وہ کیا کہنے والا تھا کہ سندھیانے اس کی بات کاٹ دی اور اتنے
 لہجے میں کہنے لگا۔ "یہ مت سمجھو ہم گوروں کی چالوں سے بے خبر ہیں جو تم جیسے
 ہمارے دربار میں اس لیے اہم منصب دلانے میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ ہمیں اُلٹے سیدھے مشورے
 دیتے رہو....."

منشی مین کنول پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مہاراجہ اتنی صاف
 اور کھری بات کہہ دے گا۔ اب انگریزی مراسلہ پیش کرنے کی سکت بھی نہ رہ گئی اور کانپتے
 ہاتھوں سے اپنی پگڑی اتار کر مہاراجہ کے قدموں میں رکھ دی۔ یہ عزت مہاراجہ ہی نے نجشی
 تھی اور مہاراجہ ہی چرنوں میں بھینٹ کرتا ہوں کیونکہ اب حضور کے دربار میں میری کوئی
 ضرورت کوئی گنجائش باقی نہیں۔"

یہ گویا اس کا استعفیٰ تھا مگر سندھیانے پورے حاکمانہ لہجے میں بولا "منشی مین کنول!
 اگر تم کمپنی سرکار کے خلاف ہماری کوئی خدمت کر سکتے ہو تو پگڑی اپنے سر پر رکھ لو۔"
 دولت راؤ سندھیانے جیسے بعض لوگ مجہول حکمران "سمجھتے تھے" کمال ہوشیاری کے
 کے منشی مین کنول کو اس کی حیثیت سے آگاہ کر دیا۔ اور پوری صاف گوئی سے یہ بھی واضح کر دیا
 تھا کہ اب وہ اسے انگریز کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے۔ کیا وہ یہ خدمت سرانجام دے سکتا
 ہے؟ منشی بڑی مشکل سے دوچار تھا۔ لہجہ جرت اور چالپوسی پماتر آیا۔

"اگر مہاراجہ نے صاف بیانی سے کام لیا ہے تو خادم بھی غرض کرنا چاہتا ہے کہ
 بے شک کمپنی سرکار مجھے اپنا دوست سمجھتی ہے مگر میں ہندوستانی پہلے اور انگریز کا دوست
 بعد میں ہوں۔ اگر ہندوستان اور مہاراجہ سے غداری کروں تو نرگ میں جاؤں۔"

مہاراجہ نے تولنے والی نظروں سے جانچا۔ "پنڈاروں سے دوستی ہمارے بھلے کی بات
 ہے یا دشمنی کی؟"

بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔ منشی مین کنول کو سپنیہ آگیا۔ مہاراجہ! انگریز بدیشی ہیں اور پنڈارے
 اسی دلش کے باسی۔ ان کی رگوں میں دوڑنے والا خون ہندوستانی ہے۔ بے شک سرکشی اور بغاوت
 ان کے ضمیر میں رچی ہوئی ہے لیکن کبھی وقت آیا تو ہزار دشمنی کے باوجود انگریز کے خلاف ان کی

تلواریں آپ ہی کا ساتھ دیں گی۔“

”تم نے اپنے جیون کا پہلا سچ بولا ہے میں کنول! سندھیا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔
اب وہ کچھ متفکر بھی نظر آ رہا تھا۔ ”تمہارے مشورے پر عمل کر کے ہم پنڈاروں کو اپنا دشمن بنا چکے
ہیں۔ اب ان سے دوستی کرنے کی کوئی ترکیب بتا سکتے ہو؟“

”بات بہت گہڑ چکی ہے مہاراج!“

”اسی کو سنبھالنا چاہتے ہیں۔“

”اب تو صرف ہوا میں خاک رکرنے والی بات ہے۔ شاید مہاراج کو پسند نہ آئے۔“
”بیان کرو۔“ سندھیا ہمتن گوش ہو گیا۔

”نامدار خاں کو سندیس بھیجئے کہ ہم نے نواب کو رہا کر دیا ہے۔ جب وہ تمہارے
پاس پہنچ جائے تو اس کے بدلے میں مرہٹہ قیدیوں کو رہا کرو۔“

مہاراج دنگ رہ گیا۔ ”کیا وہ ہماری بات پر یقین کر لے گا؟“

”بہرگز نہیں بلکہ کریم خاں خود یہ حقیقت کھول دے گا کما سے رہا نہیں کیا گیا۔ وہ
جیل سے فرار ہو کر آیا ہے۔“

”پھر اس مشورے کا فائدہ؟“

پنڈاروں کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ گوالیار کی جیل سے فرار ہونا بچوں کا کھیل نہیں
اگر مہاراج نہ چاہتے تو کریم خاں جیل تو کیا اپنی کال کو ٹھٹھی سے بھی باہر نہ نکل سکتا تھا۔“
”مطلب کیا ہے تمہارا؟ مہاراجہ منشی نہیں کنول کی عجیب و غریب تجویز پر حیران ہو

رہا تھا۔

”میری بات ذرا دھیان سے سنئے مہاراج! میں کنول کا شاطر ذہن اپنی تجویز کو الفاظ
کا عملی جامہ پہنانے لگا۔“ انگریز کے ساتھ سمجھوتے کی وجہ سے کریم خاں کی سرکاری طور پر
رہائی سیاسی مصلحت کے خلاف تھی مگر مہاراج نواب کی رہائی اور پنڈاروں سے دوستی
چاہتے تھے۔ لہذا اس کے فرار کے لیے زمین ہموار کی گئی۔ زنجیر کی کٹھی اور ایک عنجریہ دونوں چیزیں
آپ ہی کے حکم پر خفیہ طور سے نواب کو پہنچائی گئیں جن کی مدد سے وہ فرار ہو سکا۔ یہ کہانی عجیب

نہرو ہے مگر مہاراج کا ذاتی خنجر اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ نواب کریم خاں کے فرار میں آپ کے اردوے کا دخل تھا بلکہ سب کچھ آپ ہی کے حکم سے ہوا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے خود کریم خاں بھی یہ کہانی سن کر شک و شبہ میں مبتلا ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے اس کی دشمنی دوستی کا رنج اختیار کر لے۔

سندھیا نے اس تجویز پر غور کیا۔ مین کنول کی عیاری اور سکاری مہاراجہ کی سیاسی مصلحت کے عین مطابق تھی۔ یہ سوچ کر اطمینان محسوس کرنے لگا کہ یہ جو اکھیلنے میں کوئی عوج بھی نہیں۔ اگر یہ عجیب و غریب کہانی پنڈاروں تک پہنچ جائے تو ان کی دشمنی کی شدت ضرور کم ہو سکتی ہے۔ اس نے منشی مین کنول کی پڑی اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دی اور کہا۔ "منشی مین کنول! یہ سندیس لے کر تم ہی تبدیل کھنڈ جاؤ گے۔"

مین کنول نے سر تسلیم خم کر دیا۔ سندھیا سوچ رہا تھا کہ مرہٹہ دربار کو اس جیسے ہوشیار اور شاطر ذہنوں کی بڑی ضرورت ہے۔



کریم خاں کی واپسی پنڈاروں کی مہم جوئی کا ایک نیا باب تھا۔ بہادر اور نامدار خاں چار سال تک مرہٹہ سلطنت میں بھونچال پیدا کرتے رہے اور آخر مہاراجہ سندھیا مرہٹہ قیدیوں کے عوض نواب کریم خاں کو رہا کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا مگر یہاں بھی تقدیر اس کے ساتھ داؤ کھیل گئی اور روہیلہ نواب جیل سے نکل بھاگا تھا۔ پنڈاروں نے اس کی واپسی پر جشن منایا مگر گوالیار سے منشی مین کنول ایک اور ہی پیغام لے کر آ پہنچا۔

پنڈارہ سرداروں نے مہاراجہ سندھیا کا نیا دعویٰ سنا تو قہقہہ مار کر ہنس دیئے اور نواب کریم خاں نے پیغام بھجوایا۔ "اگر ہم نے مہاراجہ کو گرفتار کیا تو ہم بھی اُسے اسی طرح فرار کا موقع دیں گے جس طرح اس نے ہمیں گوالیار کی جیل سے نکلنے کا موقع دیا تھا۔"

اس جواب کا مطلب یہ تھا، مہاراجہ کا دعویٰ مسترد کر دیا گیا ہے۔ پنڈاروں نے مرہٹہ قیدیوں کی رہائی کے لیے بھاری تاوان طلب کیا۔ منشی مین کنول کو اس جواب کے ساتھ خصوصیت کر دیا گیا کہ روپیہ دے جاؤ اور قیدی لے جاؤ۔

نواب کریم خاں امیری کے دوران دُبلّا اور کمزور ہو گیا تھا۔ مگر ہمت پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ بہادری اور شجاعت کے ساتھ اب سیاست کے اسرار و رموز بھی سمجھنے لگا تھا۔ بلگم نے اس کی جدائی میں تڑپ تڑپ کر دن گزارے تھے۔ کہنے لگی۔

”ہمیں آج بھی چاند بانی کا خیال پریشان کر رہا ہے۔ اس نے آپ کی رہائی کا سامان تو کر دیا مگر خود مہاراجہ کی قید میں پڑی ہے۔ آپ نے چاند کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”دنیا بہت جلد دیکھ لے گی کہ مہاراجہ کے تارے اسے کیا دن دکھاتے ہیں۔“

سندھیانے ہم سے جو لیکھا ڈالا ہے اسے بے باق کرنے کا وقت آ گیا ہے۔“

نواب نے اپنے دارالقرار میں لوٹتے ہی بندیل کھنڈ کے جنگلوں میں شکار ڈھونڈنے والے چیتوں کے علاوہ مالوہ، راجستھان اور دوارے علاقوں میں گھومنے والے تمام پنڈارہ سرداروں کو پیغامات بھیجے کہ وہ اس کے جھنڈے تلے جمع ہو کر پنڈاروں کی ایک مضبوط ریاست قائم کریں۔ اس کے ساتھ چند ہوشیار آدمی گوالیار روانہ کر دیے تاکہ وہاں کی خبریں بھیجتے رہیں۔ کریم خان کی دعوت پر پنڈارے سردار اپنے اپنے جتنے لے کر ریاست کے دارالقرار میں پہنچنے لگے۔ ایک دن خبر آئی کہ نواب چیتو بھی اپنے سواروں اور پیادوں کے لشکر لیے چلا آتا ہے۔ کریم خاں نے نواب چیتو کا پرجوش استقبال کیا جو زری کے پرچم لہراتا ہوا آیا تھا۔ اس نے اپنی تلوار نواب کریم خاں رومیہ کی خدمت میں پیش کر دی اور کہا۔

”پنڈاروں کی ایک ریاست اور ایک قیادت کے لیے ہم آپ کو اپنا حکمران تسلیم کرتے ہیں۔ آج سے ہم ہماری ریاست نمار، ہمارے سردار، سوار اور پیادے سب آپ کے حکم کے پابند ہیں۔“

نواب چیتو کی طرح دوسرے پنڈارہ سرداروں نے بھی کریم خاں کو اپنا حکمران تسلیم کیا اور اپنے جتنوں کی کمان اس کے حوالے کر دی۔ پنڈاروں کے اس اجتماع پر کئی روز تک خوشیاں

منائی گئیں۔ کریم خاں کے دارالقرار میں توپیں ڈھالنے اور اسلحہ بنانے کے کارخانے کی پیدوار میں دو تین گنا اضافہ ہو گیا مگر چار سال کی اسیری نے کریم خاں کو بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ پنڈاروں کے اس غیر معمولی اجتماع کو صرف اس کی واپسی کا جشن قرار دیا گیا۔ اُسے مرہٹوں کی قید سے نکلے کئی مہینے ہو گئے تھے اور ابھی تک پنڈاروں نے کسی طرف لوٹ مار نہیں کی تھی۔ یہ صورت حال رومیہ نواب کے فکر و ذہن کی تبدیلی کا پتہ دے رہی تھی۔

مہاراجہ سندھیہا طمن تھا کہ وہ بدل گیا ہے اور پنڈاروں کی طرف سے بے فکر ہو کر اس نے بھی کمپنی سرکار کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ چانک گوالیار سے خبر آئی کہ مہارانی بیجا بائی پھاگن کی پندرہ تاریخ کو چتر گڑھ کی رانی سے ملنے جلے گی اور وسط چیت میں لوٹے گی۔ اس اثنا میں مہاراجہ سندھیانے چاند بائی سے لگن رچانے کا منصوبہ بنا لیا ہے کیوں کہ راج جوشی نے کہہ دیا ہے۔ اب وہ مہاراج کو اس لگن سے نہیں روک سکتا۔

یہ خبر نواب کریم خاں رومیہ کے خرمین دل پر بچلی بن کر گری۔ پنڈارہ لشکروں کو اکٹھا کیا جن کی تعداد اب ۳۵ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ نصف سوار اور نصف پیادے۔ کریم خاں کا اپنا سالہ اسی کی کمان میں تھا۔ بقیہ سواروں اور پیادوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک لشکر کی کمان نواب چیتو کے سپرد کی اور اپنے بھتیجے بہادر کو ساتھ کر دیا۔ دوسرے لشکر کی کمان نامدار خاں کو سونپی اور ۱۵ پھاگن ہی کو ریاست سے کوچ کیا جب مہارانی بیجا بائی گوالیار سے چتر گڑھ کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ پنڈاروں کا اتنا عظیم الشان اجتماع پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ تاریخ میں ان کی متحدہ کمان کی بھی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ وہ پہلی بار نواب کریم خاں رومیہ کی قیادت و حکمرانی پر متفق ہو کر ایک جبراً لشکر کی صورت میں آگے بڑھے۔

۳۵ ہزار سوار اور پیادے تین حصوں میں بٹ کر تین مختلف مقامات کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ عقب میں بعض ریڑھوں سے حکم کے منتظر تھے۔ مہاراجہ سندھیہا کو پنڈاروں کے حملہ کی خبر اس وقت ملی جب مرہٹہ سلطنت کے جنوب مشرقی علاقوں میں قیامتیں لہرائیں اور وسطی ہند کی فضا انتقام انتقام کے نعروں سے گونج اٹھی۔

پنڈاروں کے حملوں کا سارا زور جنوب مشرقی سرحدوں پر تھا جہاں وہ موت کی لکیریں

کھینچ رہے تھے۔ مغربی علاقے کو جان بوجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا کیونکہ مہارانی بیجا بائی جس کے ہمراہ گنتی کے کل تیس سوار تھے اسی علاقے میں سفر کر رہی تھی۔ وہ ۱۵ مارچ کو گوالیار سے روانہ ہوئی۔ ۱۷ مارچ کو شیوپور پہنچی اور وہاں صرف ایک دن قیام کر کے دریائے جمیل کے ساتھ ساتھ کوٹہ کی طرف چل دی تھی۔ کوٹہ سے دیرا عبور کر کے اسے مغرب کی طرف چتر گڑھ کا رخ کرنا تھا۔ شیوپور اور شیوپور کے دونوں شہر دریائے جمیل کے مشرق میں واقع ہیں۔ اگرچہ یہ علاقہ پنڈاروں کی تاخت سے محفوظ تھا مگر تین سال قبل کریم خاں کے بھتیجے نے شیوپور کو لوٹا اور دریائے جمیل تک بلغار کی تھی۔ اس لیے مہاراجہ سندھیانے حفظہ ماتقدم کے طور پر ایک سو یکہ تازہ سواروں کا دستہ مہلاتی کے پیچھے پیچھے روانہ کر دیا تاکہ پنڈارے مہارانی کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ مگر یہ امدادی دستہ بیجا بائی تک نہ پہنچ سکا۔ نہ وہ خود کوٹہ پہنچنے میں کامیاب ہو سکی۔ ابھی کوٹہ سے گیارہ بارہ میل دور تھی کہ ناگہاں پنڈارہ سوار تین اطراف سے گھوڑے دوڑاتے نمودار ہوئے اور مہارانی کی سواری کو دریائے جمیل کے قریب ہی گھیر لیا گیا۔ حملہ آور سواروں کی تعداد اڑھائی تین سو کے درمیان تھی۔ ان کے سردار نے آتے ہی حکم دیا کہ ہتھیار پھینک دو۔

راجپوت سوار جو حفاظت کی خاطر مہارانی کے ہمراہ تھے پریشان ہو گئے کیونکہ صورت حال خطرناک تھی۔ پھر بھی ان کے سردار نے جرات کا مظاہرہ کیا اور کہا۔

”شاید تم نہیں جانتے۔ یہ مہارانی بیجا بائی کی سواری ہے اور مہارانی کی شان میں گستاخی کا انجام اچھا نہیں ہوگا“

پنڈارہ سردار نے بڑے کھڑوے لہجے میں جواب دیا۔ ”صرف مہارانی کے احترام کی خاطر ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ورنہ پنڈاروں کو کسی کی زندگی اور موت سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی“

”چاہتے کیا ہو؟“

”نواب کریم خاں مہارانی سے ملنا چاہتے ہیں۔ مہارانی کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“

کریم خاں کا نام سن کر سب چونک اٹھے۔ گڑبیل میں بیٹھی بیجا بائی نے بھی سر باہر نکالا

اور بولی ”نواب سے کہو خود آکر بیٹے۔“

’وہ یہاں سے بہت دور ہیں۔ آپ ہی کو ان کے پاس چلنا ہوگا۔‘

’اگر جانے سے انکار کر دوں.....؟‘

’انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ آپ نے انکار کیا تو ہم زبردستی پر مجبور ہوں گے۔‘
یہ الفاظ سن کر محافظ دستہ کا سردار جوش میں آ گیا۔ ’تم راجپوتوں کے سامنے کھڑے ہو جو مہارانی کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔‘

’اور تم بھی ایک روہیلے پٹھان سے گفتگو کر رہے ہو۔ اگر موت مانگو گے تو ملے گی۔‘
ایک ہی پل میں راجپوت اور روہیلے کی تلواریں میان سے باہر آ گئیں مگر اس سے پہلے کہ تلواریں ٹکرائیں مہارانی بیجا بائی نے اپنے سواروں کو ہتھیار پھینک دینے کا حکم دیا۔
راجپوت سردار نے ہر تسلیم کر دیا اور اس کے ساتھیوں نے بندوقیں اور تلواریں پھینک دیں۔
لڑائی سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ پٹھارے راجپوت سواروں کو موت کے گھاٹ اتار کر بھی اپنی ضد پوری کر سکتے تھے۔

گردیل کا رخ جنوب کی طرف موڑ دیا گیا۔ نہتے راجپوت سواروں نے مہارانی کی سواری کے ارد گرد جھگڑا کر دیا اور پٹھارے انہیں اپنے گھیرے میں لیے چل دیے۔ وہ بڑی تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ ابھی اڑھائی میل چلے تھے کہ چار پانچ سو پٹھان سواروں کا ایک بڑا دستہ قریباً جھگل سے نکل کر ان کے ساتھ آ ملا۔ مہارانی بیجا بائی اور راجپوت سوار انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔
اس کا یہ مطلب تھا کہ پٹھارے مہارانی کی گرفتاری کا منصوبہ بنا کر اور پوری فوجی تیاری کے ساتھ آئے تھے اور واقعی ان کے سامنے کسی انکار کی گنجائش نہ تھی۔ بیجا بائی کو مجبوراً اپنا سفر اڑا راتہ تبدیل کرنا پڑا تھا۔ اس کا خیال تھا شام تک کسی جگہ نواب سے ملاقات ہوگی لیکن یہ خیال درست ثابت نہ ہو سکا۔

شام کے وقت پٹھارے صرف ایک گھنٹہ کھانے کے لیے رُکے اور سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ رفتار بہت تیز تھی۔ گھنٹوں کی مسافت لمحوں میں طے ہو رہی تھی۔ سفر رات بھر جاری رہا اور دوسرے روز جا کر کہیں پٹھاروں کے خیمے نظر آئے۔

یہ پٹھارے ریاضت کی وہی سرد تھی جہاں نواب کریم خاں نے چار سال قبل مہاراجہ

سندھیا کے استقبال کی خاطر قیام کیا اور خمیے لگوائے تھے۔ اسی مقام پر چاندبائی اس کے خمیے سے رخصت ہوئی اور اب چار سال کے بعد مہارانی بیجا بائی نواب کے خمیے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر بڑے احترام سے مہارانی کا استقبال کیا اور کہا۔ ”ہمیں آپ کی گرفتاری پر خود افسوس ہے مگر آپ اس وقت تک ہماری مہمان رہیں گی جب تک مہاراج چاندبائی کو لوٹا نہیں دیتے۔“

بیجا بائی مہارانیوں کی سی شان کے ساتھ بولی۔ ”کریم خاں بہادر ہو کر ایک عورت کو پرغمال بناتے ہو.....“

”اس لیے کہ ایک عورت کی رہائی چاہتے ہیں اور آپ کو پرغمالی نہیں مہمان بنایا ہے۔“

”مہمان اپنی مرضی سے آتے ہیں مگر تم نے زبردستی کی ہے۔“

”یہ ہماری مجبوری ہے۔ آپ کو میزبانی قبول کرنی چاہیے۔“

”مہاراج کو تمہارا میزبانی لو اور ہوگی۔“

”اس لیے تو یہ جرات کی ہے۔“

”مگر اس میزبانی سے تمہیں کیا مل جائے گا۔“

”شاید آپ نہیں جانتیں آپ کے چتر گروہ پہنچتے ہی مہاراج چاندبائی سے لگن رچانے والے ہیں۔ آپ سے چوری چوری سب تیاریاں ہو چکی ہیں۔“

بیجا بائی دنگ رہ گئی۔ ”نہیں..... وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔“

”اب نہیں کر سکیں گے۔“ کریم خاں مطمئن لہجے میں بولا۔ ”آپ کی گرفتاری کی خبر پہنچے گی تو یقیناً لگن روگ دیں گے۔“

مہارانی نجانے کس سوچ میں کھو گئی تھی۔ نواب کہنے لگا۔ ”ہم آپ سے بلنا چاہتے تھے۔ مگر اس طرح نہیں۔ شاید آپ ہماری مجبور یوں کو سمجھ سکیں۔ ہم زیادہ دیر یہاں نہیں

رک سکتے کیوں کہ محاذ پر سپاہی ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی

جب تک مہاراج کے غرور کا سر نیچا نہیں ہو جاتا۔ اگر آپ ہماری بہن بن کر رہیں گی تو ہمیں خوشی

ہوگی۔ مہمان بن کر رہنا چاہیں تو آپ کی مرضی۔“

یہ کہہ کر کریم خاں نے ملاقات ختم کر دی اور حکم دیا کہ مہارانی کا احترام ملحوظ رکھا جائے اور ہر وہ چیز حاضر کی جائے جس کی وہ خواہش کرے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چند سواروں کے ہمراہ شمال مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

نواب کریم خاں رومیلیہ، نواب چیتو اور نامدار خاں نے تین اطراف سے مہاراجہ سندھیا کی سلطنت کو اپنی تاخت کا نشانہ بنایا تھا۔ یہ محض سرحدی تاخت نہ تھی۔ پنڈارے 'انتقام'۔ انتقام کے نعرے لگاتے زبردست دھاوے کرتے اور مرہٹہ لشکروں میں بھونچال ڈال دیتے تھے۔ یہ پنڈاروں کی توہین کا انتقام تھا جنہیں مہاراجہ سندھیا ختم کر دینا چاہتا تھا اور اس جنگ انتقام میں مہاراجہ اس قیمتی شے سے بھی محروم ہو گیا تھا، جسے 'ناموں' کہتے ہیں۔ مہارانی بیجا بائی کے اغوا و گرفتاری کی خبر بارود کے دھماکے کی طرح دور دور سننی گئی۔ گوالیار میں تو کھرام بپا ہو گیا اور مہارانی بیجا بائی کے چتر گڑھ کی طرف روانہ ہوتے ہی چاند بائی سے لگن کی جو تیاریاں شروع ہو گئی تھیں فوراً روک دی گئیں۔

دولت راؤ سندھیا مشتعل ہو کر گر جھنے لگا اور نواب کریم خاں کو تباہ کر دینے پر تیار ہو گیا۔ نواب نے اس کی عزت اور غیرت کے منہ پر اس زور کا طمانچہ مارا تھا کہ موٹن تک اڑ گئے۔ لوگ جانتے تھے۔ مہاراجہ بھی اس کے ساتھ ہی سلوک کر چکا ہے۔ راجپوت سرداروں کے نزدیک سندھیا چاند بائی کو چھین کر لایا اور اب اس کے ساتھ لگن رچا کر کریم خاں کو ذلیل کرنا چاہتا تھا مگر اس نے بھی گہرا وار کیا اور مہاراجہ کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ چوٹ برابر کی تھی۔

گوالیار میں ہنگامی وید بار منعقد ہوا۔ مرہٹہ، راجپوت، جاٹ سردار اکٹھے ہوئے مہاراجہ کے وزیر، شیر، دبیر بھی پنڈاروں کے خلاف مشتعل اور انہیں نیست و نابود

کر دینا چاہتے تھے۔ کریم خاں اپنی بساط سے بڑھ کر پاؤں پھیلا نا چاہتا تھا اور اب یہی مصلحت کا تقاضا ہی تھا اس کے دست و بازو کاٹ دیئے جائیں۔ اچانک ایک راجپوت سردار نے سوال کیا۔

”پنڈارے ماضی میں مرہٹوں کے دست و بازو بن کر ہر جنگ میں ہمارا ساتھ دیتے رہے۔ آج وہ ہمارے دشمن کیوں بن گئے؟“

سب خاموش ہو گئے۔ کسی کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ اسی سردار نے پھر پوچھا۔ ”مہاراجہ چار سال پہلے پنڈاروں سے دوستی کرنے گئے تھے مگر نواب کریم خاں کو گرفتار کر کے لوٹے۔۔۔۔۔ کیوں۔ کیا دوستی زخمیر ہینا کر کی جاتی ہے؟“

دوبارہ سناٹا چھا گیا۔ صرف ایک آواز گونج رہی تھی۔

”اگر کریم خاں گوالیار کی جیل سے رہا ہونے کے بعد گوالیار پر حملہ نہ کرتا، تو لوگ اس کے خون پر شک کرتے۔ اسے دھوکے سے بلا کر گرفتار کیا گیا تھا مگر اس نے

ہمدردوں کی طرح لٹکا رہا ہے اور اب جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں مگر یہ سوچ لینا چاہیے کہ لڑنے والے دونوں طاقتیں ہندوستانی ہیں۔ ہندوستانی لڑ رہے ہیں، ہندوستانی مر

رہے ہیں اور انگریز تماشہ دیکھ رہا ہے۔ ہم پنڈاروں کے خلاف یہ جنگ ضرور جیت لیں گے مگر یہ جیت بہت مہنگی پڑے گی۔ کریم خاں ہمیں اس قابل نہیں چھوڑے گا

کہ ہم اپنے اصل دشمن انگریز کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ جنگ ہندوستان میں مرہٹہ سلطنت کی تباہی پر ختم ہوگی کیونکہ افرنگی ہماری تاک میں ہے اور جب ہم پنڈاروں سے لڑتے

لڑتے کمزور ہو جائیں گے وہ یک لخت ہم پر ٹوٹ پڑے گا۔“

راجپوت سردار خاموش ہو گیا۔ سب لوگوں کی نظریں مہاراجہ سندھیا پر مرکوز ہو گئیں جس کے چہرے پر افسردگی نے سایہ ڈال دیا تھا۔ اگر چار سال قبل اس نے مہارانی بیجا بائی کے مشورے پر عمل کر کے نواب کریم خاں کو اپنا دوست بنا لیا ہوتا تو آج حالات

کامیاب کچھ اور ہوتا مگر اس نے تو منشی نہیں کنول کی بات مان کر افرنگی کو خوش کرنے کی کوشش کی اور آج واقعات نے اس حقیقت پر برصغیر ثابت کر دی تھی کہ مہاراجہ دولت رائے سندھیا

سیاسی معاملات میں دوسروں کی عقل استعمال کرتا اور نقصان اٹھاتا تھا۔ اس وقت وہ بڑا نڈھال اور مضحک دکھائی دے رہا تھا اور وہ تمام غلطیاں ایک ایک کر کے اس کے تصور سے گزر رہی تھیں جو چار سال کے عرصہ میں سرزد ہوئی تھیں۔ اچانک وہ کھڑا ہو کر اعلان کرنے لگا۔
 ”ہم کریم خاں کی طرف ایک سفارت روانہ کریں گے۔ دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے اس کی آزادی اور خود مختاری کی سند لکھ دیں گے۔“



سندھیا ساری رات بستر پر کھڑی بدلتا رہا۔ کسی پہلو چین نہیں تھا۔ کریم خاں سے دوستی کا مطلب چاند بانی کی واپسی تھی۔ جب تک وہ چاند بانی کو واپس نہیں کرے گا بیچا بانی کی واپسی کا کوئی امکان نہ تھا۔ وہ سارے خوشنما سینے ٹوٹ پھوٹ گئے جو اس کے جیون کی چاندنی بن کر جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ ستاروں کی چال بدل جانے کا انتظار کر رہا تھا مگر یہ چال ایسی گہری تھی کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔ اب تو بیاہ رچانے کی بجائے عزت بچانے کا سوال تھا۔ اس نے چاند بانی کو واپس بھیج دینے کا فیصلہ کر لیا۔ تڑپ کر بستر سے اٹھا اور حکم دیا کہ امبا جی کو اسی وقت حاضر کیا جائے۔

راج منتری کی آمد میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ رات کے بلاوے پر تیراں تھا۔
 سندھیا نے اس کی تیرت میں مزید اضافہ کر دیا۔

”امبا جی! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کل تمہی سفارت لے کر کریم خاں کی طرف جاؤ گے اور تمہارے ساتھ چاند بانی بھی جائے گی۔“

امبا جی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے چاند بانی کو اقتدار دلانے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس کا خاتمہ ہو گیا۔ سمجھ گیا کہ مہارانی بھابھی کی واپسی کے لیے چاند بانی کی واپسی ضروری ہے۔

دوسرے روز جو سفارتی وفد تبدیل کھنڈ کی طرف روانہ ہوا اس کی قیادت مرہٹہ مدارالمہام
 کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک پالکی بھی جا رہی تھی جس میں چاندبائی سوار تھی اور اس پالکی
 کی حفاظت کے لیے ہمارا جو نے خاص کے وہی سوار بھیجے تھے جو چار سال پہلے امبا جی کی قیادت
 میں چاندبائی کی پالکی لے کر آئے تھے۔ جب امبا جی تبدیل کھنڈ کی سرحد پر پہنچا تو یہ دیکھ
 کر حیران رہ گیا کہ نواب کریم خاں کے خیمے ٹھیک اسی مقام پر نصب تھے جہاں چار سال
 پہلے نصب کیے گئے تھے۔ وہی دن تھے، وہی موسم تھا، وہی جگہ تھی، وہی ہمارا جو سندھیا
 اور نواب کریم خاں کی بازی تھی۔

بساط کے سب بہرے وہی تھے۔ وہی امبا جی، وہی چاندبائی، وہی پالکی،
 وہی مرہٹہ سوار، سب کچھ وہی تھا مگر چال بدل گئی، بازی پلٹ گئی تھی۔ چار سال قبل
 کریم خاں مات کے نقشے پر بیٹھا اور ہمارا جو جیت رہا تھا۔ آج ہمارا جو ہار کے خانے
 میں کھڑا اور نواب بہ چال میں اُسے شہ مات دے رہا تھا۔ قدرت نے ایک بار پھر وہی کھیل،
 وہی افسانہ دہرا دیا تھا۔ مگر کسی قدر تبدیلی کے ساتھ، مرہٹہ مدارالمہام چار سال قبل جس
 چاند کو تبدیل کھنڈ کے آسمان سے توڑ کر لے گیا، آج اُسی کو لوٹانے آیا تھا۔

مرہٹہ سفارت اور مدارالمہام امبا جی کی اطلاع ملی تو دستور کے مطابق نواب کا نائب
 نامدار خاں استقبال کے لیے آیا مگر امبا جی کے ساتھ ایک پالکی اور اس پالکی میں چاندبائی کو
 دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ امبا جی نے فوراً صفائی پیش کی۔
 "نامدار خاں! میں گنگا کی قسم کھا کر کہتا ہوں چاندبائی کو جس حالت میں لے گیا تھا
 اُسی حالت میں واپس کرنے آیا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں امبا جی! ہمارا جو سندھیا نے نواب سے عہد شکنی کی مگر چاند کو جو
 وچن دیا تھا وہ نہیں توڑا۔"

پھر نامدار خاں، امبا جی، چاندبائی اور دیگر ارکان وفد کو جن میں اکثریت راجپوتوں
 کی تھی اپنے ہمراہ لے کر نواب کے خیمے میں داخل ہوا۔ جہاں نواب چیتو، بہادر اور دوسرے
 بڑا رہ سردار تمکنت کے ساتھ بیٹھے تھے۔ کریم خاں نے امبا جی کے ساتھ چاند کو دیکھا تو

اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ نواب چیتو بھی اس چاند سی صورت کو دیکھ کر دل تقام کے رہ گیا۔ اس کی محبت، نفا اور قربانی کی داستان سن چکا تھا۔ چہرہ دیکھا تو سوچنے لگا اگر کسی سلطنت کی ملکہ ہوتی تو تاریخ کا ہر ورق اس کے نام سے روشن ہوتا۔

چاند بانی نے اپنے مخصوص انداز میں کورنش ادا کی۔ اس کے ساتھ امبا جی اور دیگر اراکین وفد کی گردنیں بھی جھک گئیں۔ جب امبا جی نے سر اٹھایا تو بولا۔ "نواب حضور اجیت آپ کی ہوئی، مہاراج اراگئے۔ چاند آپ کی امانت تھی آپ کو کوٹا رہا ہوں اور یہ آس لے کر آیا ہوں کہ حضور بھی مہارانی بیجا بانی کو واپس کر دیں گے۔"

"مہارانی بیجا بانی پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔" نواب کریم خاں نے بہت پہلے کہے ہوئے الفاظ پھر دہرائے۔ "اگر تمہارے ساتھ جانا چاہے تو ہم روک نہیں سکیں گے اگر یہاں رہنا چاہے تو بجائی کا گھر اس کے لیے تنگ نہیں۔"

امبا جی اور سارے اراکین وفد نواب کے الفاظ سن کر دنگ رہ گئے۔ ان کا خیال تھا مہارانی قید ہوگی مگر یہاں معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ کریم خاں نے کہا۔ "مہارانی کے ساتھ گوالیار میں اس کی شان کے شایاں سلوک نہیں ہوا اور ہم سمجھتے ہیں جب تک اس سلوک کی تلافی نہیں ہوگی وہ واپس جانے کی بجائے بجائی کے گھر قیام کو ترجیح دے گی۔"

مہارانی کو یہ خبر مل چکی تھی کہ گوالیار سے ایک سفارتی وفد آیا ہے۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ سفیر امبا جی ہو گا اور ساتھ چاند بانی بھی ہوگی۔ جب چاند بانی کے آنے کی خبر ملی اپنے راجپوت محافظوں کے جھگڑے میں جیسے سے بھلی اور ایک مہارانی کی سی شان کے ساتھ پٹارہ دربار میں داخل ہوئی۔ کریم خاں نے خود گئے بڑھ استقبال کیا۔

وہ غصے میں بولی۔ "کریم خاں! تم نے چاند بانی اور امبا جی کے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟"

"بخدا ہمیں بھی ان کے آنے کی خبر نہ تھی۔ امبا جی آپ کو لے آئے ہیں۔"

بیجا بانی نے حیران ہو کر پوچھا۔ "اور تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"ہم نے فیصلہ آپ کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔"

مہارانی مرہٹہ مدارالہمام سے مخاطب ہوئی۔ امبا جی! جا کر مہاراج سے کہہ دو کہ بیجا بانی غیروں میں نہیں اپنے بھائیوں کے گھر ہے۔ انہیں میری عزت عزیز ہے تو خود لینے آئیں۔“

مہارانی کا یہ جواب سُن کر مرہٹے اور راجپوت حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے مہارانی کے الفاظ سے نواب کریم خاں کے اخلاق اور سلوک کا اندازہ لگایا۔ وہ یہاں بھی آزاد بااختیار اور اپنی مرضی کی مالک تھی اور یہ روہیلے پٹھان کی اعلیٰ طرفی کا ایسا مظاہرہ تھا جس نے مرہٹہ وفد کی گردنیں خم کر دیں۔ پھر بیجا بانی آگے بڑھی اور اس نے جہانڈ بانی کو گلے لگایا۔ چاند کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھیگ گئی تھیں اس نے گلہ گیر لہجے میں کریم خاں سے التجا کی۔ نواب حضور! مہاراجہ سندھیا اپنی فطلی پر خود شرمسار ہیں۔ جب میں گوالیار سے رخصت ہوئی انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مہارانی بیجا بانی کے حکم و اختیار میں کوئی فرق نہیں آنے دیں گے۔ وہ مہارانی کو دل سے چاہتے اور ان کے لیے بے حد پریشان ہیں۔ میری التجا ہے کہ مہارانی کو جلد واپس بھیج دیا جائے۔“

”مگر مہارانی نے اپنی واپسی کی جو شرط لگائی ہے۔ ہمیں اسے توڑنے کا اختیار نہیں مہاراج خود آئیں اور مہارانی کو لے جائیں۔“

امبا جی اسی روز خالی ہاتھ لوٹ گیا۔ البتہ مہارانی کے حکم پر خاصہ کے سوار اور وہ سردار جو امبا جی کے ساتھ آئے وہیں رُک گئے تھے۔ پنڈاروں کی جنگ انتقام ختم ہو گئی تھی۔ مہاراجہ سندھیا نے سفارت کے ذریعے شاہی فرمان بھیج دیا تھا کہ وہ نواب کریم خاں کو ایک آزاد و خود مختار حکمران سمجھتے ہیں اور ان کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کریں گے مگر نواب کریم خاں کو شاید اب اس فرمان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

چوتھے روز مہاراجہ سندھیا اپنے خدم و حشم کے ساتھ خود بندیل کھنڈ آیا اور نواب کریم خاں نے مہارانی بیجا بانی کو اس شان سے رخصت کیا کہ مہاراجہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ گوالیار کے راج محلوں میں مہارانی بیجا بانی کا حکم و اختیار پھر بحال ہو گیا تھا۔ اب بیجا بانی کے پیچھے راجپوتوں کے علاوہ پنڈاروں کی طاقت بھی تھی اور مہاراجہ اس حقیقت کو

اچھی طرح سمجھتا تھا کہ بیجا بانی کی ناراضی کا مطلب کیا ہوگا۔

نواب کریم خاں روہیلہ نے پنڈاروں کی آزادی کا پرچم لہرا دیا اور چاند بانی نے اپنے پاؤں میں پھر چاندی کا بچھوا پہن لیا جسے وہ گوالیار کے راج محل میں اتار کر مصینک چکی تھی۔



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

بہارِ عشق

میں

تو

تو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

تاریخی، ادبی، معلوماتی کتب کا مرکز

مکتبہ القریش

ہر قسم کی کتابیں ہم سے طلب فرمائیں

مکتبہ القریش، چوک اردو بازار، لاہور

پہلی



استفادہ

- | | |
|-------------------------------------|-------------------------------------------------|
| ○ <u>تاریخ الاملا</u>
ابن خلدون | ○ <u>قال آت وی دوسن ایسپاٹر</u>
محمد |
| ○ <u>تسطنظیہ</u>
بیاض | ○ <u>سفر نامہ یورپ</u>
نقلی حرب عالم |
| ○ <u>تاریخ سبوریہ</u>
رفعی بیکنش | ○ <u>دولت عثمانیہ تاریخ و حکایہ</u>
کراجناری |

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com



بیکرہ روم کے ایشیائی ساحل ' اناطولی ' پر قبضہ اینڈرونیکیس اعظم کی مشرقی ولایت نیکومیڈیا کا یونانی الاصل حکمران اچانک فوت ہو گیا۔

اس خبر نے قیصر کے دل پر ایک نیا چرکہ لگایا۔ صدیوں کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مرنے والے نے اپنا کئی ولی عہد نہیں چھوڑا تھا صرف ایک نوجوان شہزادی تھی جسے آئینہ بانی باپ کی وصیت کے مطابق حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنی تھیں اور پریشانی کا دوسرا سبب عثمانی ترکوں کا خطرہ تھا جو اناطولیہ کی سرزمین پر نئی فتوحات حاصل کر رہے تھے۔ اس موقع پر کسی بہادر اور جہاں بہمت حکمران کی ضرورت تھی جو بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کر سکتا۔ بوجہ ملک بلا کونی (بلاقونیر) کو اپنے شوہر کی وفات کا گہرا سوچ پہنچا مگر شاہی وصیت کی رو سے ضروری تھا کہ بیٹی کو تخت و تاج سونپ دے۔ تخت نشینی اور تاج پوشی کی تقریب کا اعلان کر دیا گیا مگر بلا کونی نے قیصر کو پیغام بھیجا تھا :-

• شہزادی کی تخت نشینی کی رسم عظیم قیصر کی نگرانی میں ادا ہونی چاہیے۔

اگر قیصر خود تشریف نہ لاسکیں تو اپنے کسی شیر خاص کو روانہ کر دیں مگر اس کے ہمراہ قیصری فوج بھی ہونی چاہئے تاکہ دشمن کو خبر ہو جائے کہ عظیم قیصر نیکو میڈیا کی حفاظت کا عزم رکھتے ہیں اور وہ ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔“

وفات کی خبر کے ساتھ ملکہ بلا کوئی کا یہ مراسلہ بھی قیصر کی خدمت میں پہنچا دیا گیا اور اعیان سلطنت جواب کے منتظر تھے۔

سطح مرتفع اناطولیہ پر پھیلی ہوئی رومی قیصروں کی مشرقی ولایات جن کا سلسلہ کبھی تو نیہ کی سلجوقی سلطنت اور آرمینیا کی سرحدوں تک پھیلا تھا۔ ایک عرصہ سے آل عثمان کی ترک تازیوں کا شکار اور یکے بعد دیگرے قیصری قبضے سے نکلتی جا رہی تھیں۔ ارطغرل اول اس کے فرزند عثمان کے بعد اب ترک سلطان اور خان رومی ولایات کے لیے خطرہ بن گیا تھا، کچھ ہی عرصہ قبل ترکوں نے اناطولیہ کے مرکز صلیب بروصہ پر قبضہ کر لیا اور اس کے حاکم ارنس کی جان بخش دی تھی۔ بروصہ دس سال کے طویل محاصرے کے بعد ہاتھ سے نکلا۔ شہزادہ اینڈرونیکس نکولس کے مشورے پر جوآن دونوں وہاں موجود تھا ارنس نے شہر ترکوں کے حوالے کر دیا اور خود قسطنطنیہ آ گیا تھا۔ سقوط بروصہ کے بعد دین صلیب کے ہزاروں پرستار جن کی قیادت بطریق اور راہب کر رہے تھے عظیم قیصر کے نام کی دہائی دیتے اور نوے پڑھتے قسطنطنیہ میں داخل ہوئے تھے۔

اناطولیہ کے میدانوں میں بہت تھوڑی ریاستیں رہ گئی تھیں جن پر قیصری پرچم لہراتے تھے۔ ان میں رومیلیا اور نیکو میڈیا خاص طور پر قابل ذکر تھیں کیونکہ ان کی حفاظت پر خود قسطنطنیہ اور رومی سلطنت کے دفاع کا انحصار تھا جن پر ترک سواروں کے گھوڑوں کی دھمک سے لرزہ طاری تھا۔ اس حالت میں جب ترک بروصہ پر قبضہ کر چکے اور ان کی پھلتی ہوئی ریاست کے دار الحکومت بتدریج اناطولی ساحل کی طرف بڑھ رہے تھے قیصری عظمت و حشمت کا تقاضا تھا کہ اناطولیہ کی بقیہ رومی ولایات کے دفاع پر خاص توجہ دی جائے اور گستاخ ترکوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے۔

دولت نیکو میڈیا جیسے ترکوں نے "اقلیم توجہ ایلی" کا نام دیا بحیرہ روم کے ایشیائی ساحل پر رومیلیا ہی کی طرح قسطنطنیہ کی "حفاظتی لائن" سمجھی جاتی تھی جس کے یونانی حکمران کی ناگہانی موت نے قیصر کو بے حد غمگین و پریشان کر دیا تھا کیونکہ ابھی بتقانی ریاستوں میں پھیلی ہوئی شورش ختم نہ ہوئی تھی کہ مشرق کی جانب سے بھی اضطراب انگیز خبریں آنے لگیں۔ قیصر اینڈونیکس سوم جس نے محض فتوحات کی خاطر اپنے نام کے ساتھ "عظیم" کے لفظ کا اضافہ کر لیا تھا۔ صورت حال کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے قسطنطنیہ کے قلعے کی بند فیصل سے اناطولی ساحل کو تشویش کی نظروں سے دیکھا اور حکم دیا۔

ہمارے شیر جوزف کو نیکو میڈیا بھیج دیا جائے۔

مگر ملکہ ہلا کونی نے پنس نکولس کو بھیجنے کی سفارش کی ہے۔ آقائے بحر و بر۔ کسی نے قیصر کو توجہ دلائی۔

پنس نکولس؛ اس نے ہر دعوہ کو ترکوں کے حوالے کر کے ہمارا اعتماد کھو دیا۔ کیا تم چاہتے ہو ازمد بھی ہاتھ سے نکل جائے؛ ازمد نیکو میڈیا کی ریاست کا دارالحکومت تھا۔ ملکہ نے فوج بھیجنے کی درخواست بھی کی ہے۔

فوج نہیں جاسکتی۔ عظیم قیصر نے خود و فکر کے بعد جواب دیا۔ "جب تک ہم سرریا اور بلغاریہ کی طرف سے مطمئن نہیں ہو جاتے ایک سپاہی بھی نہیں جائے گا۔ ادھر سے فارغ ہو کر نیکو میڈیا کی حفاظت کا انتظام کر دیں گے۔ فی الحال جو نیت ہماری نیک تمنا میں لے کر رخصت ہو جائے۔"

شہنشاہِ عظیم! نیکو میڈیا کی حفاظت ضروری ہے۔

نہیں! قسطنطنیہ کی حفاظت ضروری ہے۔ قیصر کی آواز دوتک گونجتی چلی گئی۔ زار ووشان سروری اور بلغاریہ فوجوں کو پھر جمع کر رہے اس موقع پر ہم اپنی مشرقی ولایت کی کوئی مدد نہیں کر سکتے مگر ملکہ ہلا کونی اور اس کی بیٹی کو پیغام بھیج دیا جائے کہ ہماری فوجیں ازمد سے صاف نہیں اگر ترکوں نے نیکو میڈیا کا رخ کیا تو ماں بیٹی سدی گھوڑوں کی تھکنا انگیز پاؤں کی آواز سن لیں گی۔

یہ عظیم قبصر کا آخری فیصلہ تھا جس میں ترمیم یا تبدیلی کا کسی کو اختیار نہ تھا چنانچہ اس حکم کے مطابق دربارِ قسطنطنیہ کا مشیر جوزف اپنے مختصر وفد کے ہمراہ آناٹے باسنوزس کو عبور کر کے اناطولی ساحل پر اترتا ہے ترک 'سقوطی' کہتے ہیں اور گھوڑے پر سوار ہو کر نیکومیڈیا کے دارالحکومت ازمید کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ شہزادی کی تقریبِ تخت نشینی میں شریک ہو سکے۔



396

۷۲۶ ہجری مطابق ۱۳۲۶ عیسوی میں عثمان کی وفات کے بعد اُس کے چھوٹے لڑکے اوردخان نے اورنگ سلطانی پر حملوں کیا۔ وہ اپنے باپ کا تابوت بھی جو صفت میں فوت ہوا تھا بروصہ اٹھا لایا۔

صوبہ بھینہ کا صدر مقام بکیرہ مارورا سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع ہے۔ اسک شہر اوریانی یا یگی شہری کے بعد بروصہ ترکوں کا تیسرا دارالحکومت تھا۔ وہ جوں جوں مغرب کی طرف بڑھے اپنے دارالحکومت بھی بدلتے چلے گئے۔ کوئی نہیں جانتا تھا ان کی منزل کہاں ہے۔ ان کے قدم کہاں رکھیں گے؛ جب اوردخان نے بروصہ میں دربار لگایا تو عثمان کا بڑا لڑکا علاوالدین پاشا چھوٹے بھائی کے سامنے اُمرائے سلطنت کی صف میں کھڑا تھا وہ تمام سلجوقی شہزادے اور سردار بھی موجود تھے جو سلجوقیہ کے آخری حکمران رکن الدین روم کی ہلاکت کے بعد عثمان اور آل عثمان کے دربار ہی کو اپنی اُمیدوں کا مرکز سمجھ بیٹھے تھے۔ مولویہ کے شیخ چلیپی آندی نے عثمان کی تلوار اپنے ہاتھ سے نئے سلطان کی کمر میں باندھی اور کہا:-

'تیغ عثمان'۔۔۔۔۔ تیغِ جہاد ہے۔ یہ تلوار تارپوں اور رومیوں کے مقابلے میں بجلی کی طرح چمکتی رہی ہے۔ کہیں اس کی چمک ماند نہ پڑ جائے۔'

اوردخان نے تلوار میان سے نکال کر بحیرہ روم کی طرف اشارہ کیا اور جہاں سال ترک عبدالرحمن غازی کو حکم دیا۔

رومیلیا کی سمت کوچ کرو۔ یہ ارض اناطولیہ میں قیصر کا آخری حصار ہے اس حصار کو توڑ کر گیلی پولی کی طرف بڑھو۔

عبدالرحمن سقوط بروصہ سے قبل آتچہ خواجہ کے پرچم تلے یلیزولا کے میدان میں قیصری فوج کو شکست دے چکا تھا۔ رومیلیا کی فتح کے لیے اودخان نے اسی کا انتخاب کیا۔ اُس نے گھوڑے کی باگ اٹھائی، شکر لے کر بولے کی طرح بروصہ سے نکلا اور آندھی کی طرح لہراتا چلا گیا۔ بحیرہ روم کے کٹے پھٹے ساحل پر رومیلیا اور اُس سے ملحق نیکومیڈیا کی ریاستیں یونانی بہادری سے خالی نہ تھیں۔ جبکہ مضبوط قلعے اور اُن قلعوں کی حفاظت کرنیوالے گراڈیل شہسوار اپنی تلواروں کو موت کی آب داری لگا کر بیٹھے تھے۔ ادھر ترک سپہ سالار کی نبضوں میں بھی جوانی کا گرم خون اور معرکہ آرائی کے دلولوں کی آگ دہک رہی تھی۔ اس دلیری سے آگے بڑھا جیسے موت کے طوفانوں کو چیرتا، کاٹتا ہوا نکل جائے گا۔

قیصر کے یونانی صوبیدار جو "تکفور" کہلاتے تھے۔ ترک بلغار کو روکنے کے لیے قلعوں سے نکل آئے۔ رومیلیا کی فصاحتوں کے نعروں اور یونانیوں کے شور سے گونج اٹھی قسطنطنیہ کی طرف قاصد دوڑائے اور قیصر کو پیغام بھیجا۔ "ترک اپنے جلو میں موت کے ہنگامے لے کر چلتے ہیں۔ ایسی سپاہ بھیجئے جو موت کے فرشتوں سے لڑ سکے۔"

عظیم قیصر نے فلاط کے مینار سے بار بار اناطولیہ کی طرف نگاہ حیرت سے دیکھا قسطنطنیہ کی بوڑھی سلطنت جو اپنی عمر کے ایک ہزار سال پورے کر چکی تھی اور جس کے چہرے کو بڑھاپے کی جھریوں نے بد صورت بھی کر دیا تھا ترکوں کی جوانی اور شہزادی کو دیکھ کر لوزہ برا نام تھی۔ ترک قدم بہ قدم یورپ کی طرف بڑھے آرہے تھے اور کوئی مدافعت انہیں روکنے میں کامیاب نہ ہوئی تھی۔ اُن کی پھول سی سیاست جو ارطغرل اور عثمان کے ایک شجاعانہ معرکے کے نتیجے میں کوہ اولبس کے قریب آرمینیا کی رومی سرحد پر "حفاظتی گارڈ" کی شکل میں قائم ہوئی تھی (تاکہ سلجوقیہ کے زوال پر قیصری فوجیں تونیز تک پیش قدمی نہ کر سکیں) بہت محدود سے رقبے پر مشتمل تھی اور عظیم قیصر کے رومی سرداروں، نانٹوں اور بادشاہوں نے اُسے اتنی بھی اہمیت نہیں دی تھی جتنی ایک معمولی فوجی چوکی کو دی جاتی ہے کیونکہ وہ قوت

کے نشہ میں سرشار اور سمجھتے تھے کہ جب چاہیں گے ان خانماں برباد ترکوں کو اسک شہر سے مار بھگا میں گے۔ مگر حالات ان کی توقعات کے بالکل ہی برعکس ظہور میں آئے تھے اور تیغ عثمان کے مقابلے میں ان کی تلواریں بے کار ثابت ہو چکی تھیں۔ اوغوس کے فرزندوں نے اپنی ریاست سے بچل کر ارمینی بازاری، عیانہ گوپلی اور قندھاری پر قبضہ کر کے یونانی سرداروں کو درباے ستاریہ کے اس بار بھگا دیا تھا۔ پھر چادرلق، لفقہ، کافنگی شہری، فیری حصار، علوباد، قسطنطنیہ، قراقین، بچی، انگو، بجیسی، گونیک، طرقلی، مارطونی، طوس، بازاری، اکاری، تگین، حصار، پگراس، قرہ جیش، ایوی، صفت، قرہ حصار ایسے شہروں اور قلعوں کو زیر کرتے بروصہ تک آئے اور قسطنطنیہ کی بوڑھی کھوسٹ مملکت کو دہلا رہے تھے کیونکہ بروصہ پر تسلط کے بعد ترک مملکت اسکا ر کے ساحلی علاقہ سے آملی اور اس کی سرحدیں اناطولی ساحل کو چھونے لگی تھیں۔

اناطولیہ کے جنوب مغرب میں رومی ولایات کا سلسلہ ابھی قائم تھا مگر ترک لشکر نے عبدالرحمن کی قیادت میں رومیلیا کی جانب جو تاخت شروع کی اس سے بحیرہ روم کے پورے ایشیائی ساحل کو خطرہ لاحق ہو گیا اور قسطنطنیہ میں بیٹھے ہوئے رومی مدبر قیصر کو اتنا باہ کرنے لگے۔

”ترک لشکر رومیلیا کو تاخت و تاراج کر کے گیلی پولی کی طرف بڑھیں گے اور ڈارڈانلز (درہ وانیال) پر قبضہ کر کے قسطنطنیہ پر بھری گھیر ڈال دیں گے۔ ان سرکٹوں کو رومیلیا سے پرے دھکیل دو۔“

اسا قفہ و بطریقہ کے علاوہ ماضی میں جھانکنے والے تاریخ نویسوں نے بھی قیصر کو یاد دلایا کہ قسطنطنیہ کی فتح مسلمانوں کی سب سے بڑی خواہش ہے اور اسلامی لشکر خلیفہ سوئم کے زمانے ہی سے شہر قیصر کو زیر کرنے کے لیے جہاد میں مصروف رہے ہیں۔ امیر معاویہ عبدالملک بن مروان، ولید و سلیمان اور ہشام بن عبدالملک کے بعد عباسی خلیفہ مہدی، اروی، الرشید، مانون، معتصم، معتضد اور مقتدر ایسے حکمرانوں نے ارضِ روم پر معرکے لڑنے اور قسطنطنیہ تک پہنچنے کے لیے لشکر بھیجتے رہے۔ کئی صدیوں تک اس شہر کی خاطر

خونریز جنگیں ہوتی رہی ہیں۔ اب اگرچہ عباسیہ کے ساتھ چنگیز و ہلاکو کے تاتاریوں نے سلجوقیہ کو بھی قبروں کی لحد میں اتا دیا ہے مگر یہ ترک جو کبھی صحرائے ہامان میں گھوڑے چراتے اور مویشی پالتے تھے حکمرانی کئے و لو لے لے کر اٹھے ہیں اور قلعوں کی فصیل میں گراتے قسطنطنیہ کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ عظیم قیصر زمین پر خداوند کا سایہ اور محافظ صلیب ہے۔

اسے ان بے دینوں کے خلاف خود کو "گروسید کا پرچم اٹھانا چاہیے۔"

قیصر اینڈرونیکس اعظم نے یہ سب مشورے سن لیے اور معاملے کی ہر صولت پر غور کر لیا تھا مگر ایسے وقت میں جب بلغاری ریاستوں میں قیصر کے خلاف شورش برپا تھی اور زار شیفن دوشان نے اس کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی وہ اپنے لشکروں کو ایشیائی ولایات کی طرف بھیج کر یورپی حریفوں کا نشانہ بننے پر تیار نہ تھا۔ معاملہ صرف سرریا، بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کی بغاوت کا نہیں تھا۔ قسطنطنیہ کے شاہی محلات اور یونان کی ریاستوں میں بھی اقتدار کی سازشیں ہو رہی تھیں اور ریاست ڈیوٹیکا کا حکمران جونز کا ناکوزین اینڈرونیکس چہارم کی حکومت کے لیے بساط بچھا رہا تھا۔ تخت و دہیہم کی باہمی آویزشوں نے اس عظیم مدنی رومی سلطنت کو نحیف و کمزور کر دیا تھا جس پر کبھی قسطنطنیہ کبیر جینٹین تھوڈوس اور آرکیڈیس جیسے عظیم قیصروں نے اقبال مندی کے پرچم لہرائے اور مشرق و مغرب پر اپنی ہیبت طاری کر دی تھی۔

روم کے عظیم قیصروں اور فتح نصیب ہر قلوں کا وعدہ گورچکا اور اب قسطنطنیہ یونانی الاصل قیصروں کا آخری زمانہ دیکھ رہا تھا جن کے حوصلے پست اور عقل ضعیف تھی۔ وہ اپنے ہرنیلوں، خمیروں اور مذہبی رہنماؤں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح لپکتے اور ناکشی عظمت کا بھرم قائم رکھنے کی خاطر کبھی کبھار میدان جنگ میں نظر آجاتے لیکن شعورِ ملکیت سے بیگانہ تھے۔ قیصر اینڈرونیکس سوم کو بھی یہی فکر دامن گیر تھی کہ جب تک زندہ ہے تاج قیصری سر قائم رہے۔ اس نے ترکوں کی نئی یلغار کے بارے میں مدنی مدبروں، اساقف و بطانق اور دستخ نویسوں کے مشورے مترد کر دیئے کیونکہ جانتا تھا۔ اگر ایشیا کی سرزمین پر نکل گیا تو ہاید پورپ کے ساحل پر بھی واپس نہ آسکے اور اس کے بقیر ایام زندگی کی سرودا ایک

قیدخانے میں گنڈ جابائیں گے، کئی قیصر قید یا جلاوطن ہوتے تھے لیکن یہ کمزوری اُس نے کسی پر ظاہر نہ ہونے دی تھی اور اپنے مشرقی صوبہ داروں کو پیغام بھیجا کہ —

”گھوڑوں اور مویشیوں کے ریوڑ ہانکنے والے ترکوں سے کیوں ڈرتے

ہو، متحد ہو کر ان کا مقابلہ کرو اور قیصر کی عنایات کے منتظر رہو۔“

مگر قیصر کی عنایات کے بدلے اُن پر ترک تلواریں برقی اجل گماتی رہیں جب عبدالرحمن

نے رومیلیا کی سرحد میں داخل ہو کر کئی شہر اور قلعے فتح کر لیے تو ایک دن اچانک خبر ملی کہ

نیکومیڈیا کی ریاست کا والی فوت ہو گیا اور اب اُس کی بیٹی کو اورنگ حکومت پر بٹھایا جا رہا

ہے۔ ساتھ ہی یہ اطلاع بھی پہنچی کہ قیصر اینڈرونیکس کا مشیر جوزف از مید پہنچ گیا مگر اُس کے

بچھے قیصری سپاہ کا کوئی دستہ دکھائی نہیں دیتا کیوں کہ قیصر نے فوج بھجھنے سے انکار کر دیا

اور اصرار ملکہ بلاقونیہ نے شہزادی کی تخت نشینی ملتوی کر دی ہے۔ یہ سب اطلاعات خرمن

تیا کی ریاست کے حکمران مائیکل کیوزہ کا ایک بھتیجا لے کر آیا تھا مائیکل کا پورا خاندان جسے

ترک ”مائیکل اوغلی“ کہتے تھے انتہائی وفادار ثابت ہوا تھا بعد ازاں اس نے اسلام

بھی قبول کر لیا۔

عبدالرحمن نے ان اطلاعات کو پوری توجہ اور دلچسپی سے سنا پھر پوچھا —

”تخت نشینی کیوں ملتوی کر دی؟“

”بیٹی تاجپوشی چاہتی تھی مگر ملکہ راضی نہیں۔ اُس نے قسطنطنیہ کی طرف قاصد ڈرایا

ہے کہ جب تک ریاست کی حفاظت کے لیے عظیم قیصر کی فوج نہیں آئے گی شہزادی

تخت پر جلوس نہیں کر سکتی۔“

”کیا قیصر فوج بھیج دے گا؟“

”منزور بھیج دے گا۔ اُس کے مشیر نے رومیلیا اور نیکومیڈیا کے دفاع کو مایوس

کن قرار دیا اور قیصر کو لکھا ہے کہ مقامی حکمران ترکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر ان یاستوں

کی سلامتی منظور ہے تو مدد روانہ کی جائے۔“

عبدالرحمن کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر اچانک پوچھنے لگا:

’ازمید کی حفاظت کے لیے اس وقت کتنی فوج ہے؟‘

’ترک لشکر سے دو گنی ضرور ہوگی۔‘

عبدالرحمن نے فوراً اپنے باش کاتب کو فوجی شیروں اور سرداروں کی طرف دوڑایا اور مجلس مشاورت طلب کر لی۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ جب ترک سوار سپہ سالار کے نیچے میں اکٹھے ہو گئے۔ عبدالرحمن نے ایک عجیب و غریب تجویز پیش کر کے انہیں حیران کر دیا۔

’ازمید کا والی فوت ہو چکا اور تخت نشینی کی تقریب اُس وقت تک ملتوی کر دی گئی ہے جب تک قیسری فوج نہ پہنچ جائے۔ میں چاہتا ہوں مدد آنے سے پہلے ہی ازمید پر حملہ کر دیا جائے‘

اسی تجویز پر اُس نے رائے طلب کی تھی۔

’مگر یہ ایک اچھی چال ہے اگر قیسری فوج آنے تک ازمید فتح نہ ہو سکا اور محاصرہ کے دوران دیا ست کو مدد پہنچ گئی تو ہم دوسری مصیبت میں پھنس جائیں گے۔‘
 ترک لشکر رومیلیا کے ایک قلعے کا محاصرہ کیے بیٹھا تھا۔ کراخی بک نے بتایا۔
 ’اس وقت محاصرہ اٹھانا بھی خطرناک ہوگا قلعہ سر ہونے والا ہے اگر محاصرہ اٹھا لیا تو دشمن عقب سے ہم پر ٹوٹ پڑے گا۔‘

’ابھی خواجہ کی رائے تھی۔‘ قیسری فوج جلد ازمید نہیں پہنچ سکے گی۔ ہم اس قلعہ کو سر کرنے کے بعد اپنے گھوڑوں کی باگیں نیکومیڈیا کی طرف موڑ لیں گے اور ازمید پر قسمت آزمائی کریں گے؟‘

یہ ایک صائب مشورہ تھا جسے سب نے پسند کیا۔ محاصرہ اٹھانا خلافتِ مصلحت سمجھا گیا مگر عبدالرحمن نے ازمید کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے ’مائیکل اوغلی‘ کے دو سواروں کو نیکومیڈیا کی طرف بھیج دیا۔

اور قلعہ کے محصورین نے بڑی شدید ملافعت کی اور اُس کی تسخیر میں کئی دن لگ گئے۔ اس دوران میں ’مائیکل اوغلی‘ نے یہ حیرت انگیز خبر سنائی کہ رومی فوج ازمید پہنچ گئی

ہے اور ٹھیک سات روز کے بعد ریاست میں جشنِ تخت نشینی منایا جائے گا کیونکہ جب قیصر اینڈرونیکس اعظم تک اپنے مشیر کا پیغام اور ملکہ کا احتجاج پہنچا کہ مشرقی ولایات شدید خطرے سے دوچار ہیں تو اس کے اندر عظیم قیصروں کی روح اچانک بیدار ہو گئی اور اس وقت جب وہ بابِ تہ قیصر کو عبور کر کے قصرِ بلاچرمی کے قریب سے گزر رہا تھا ناگہاں کچھ سوچ کر "سنگِ قسطنطین" کے قریب رک گیا۔ قسطنطین کبیر جس کے نام پر قسطنطینہ کا عظیم شہر آباد ہوا تھا جب کسی نہم پر نکلتا تو اس پتھر پر پاؤں رکھ کر گھوڑے پر سوار ہوتا تھا جو سنگِ قسطنطین کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے پاس کھڑے ہو کر اینڈرونیکس سوم نے بھی اپنے آپ کو "اعظم" محسوس کیا پھر یک لخت پتھر پر پاؤں ٹکا کر حکم دیا تھا کہ "نیکومیڈیا کی حفاظت کے لیے رومی فوج از میدان روانہ کر دی جائے"۔

اس طرح از میدان کے دفاع کا انتظام بھی ہو گیا اور شہزادی کے جشنِ تخت نشینی کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔

عبدالرحمن نے یہ خبر سننے کے بعد بھی ارادہ تبدیل نہیں کیا اور اپنے سرداروں اور سالاروں کو بتایا کہ ترکوں کی ہیبت سے ریاستی فوج کے حوصلے پست ہو چکے اور خود لڑنے کی بجائے وہ قیصری سپاہیوں پر زیادہ اعتماد کرتی ہے۔ اس نے گرج کر کہا۔

"آؤ دیکھیں قیصر کے سپاہی ہماری تلواروں کے زخم سینے پر کھاتے ہیں، یا پشت پر؟"

پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور رومیلیا سے اس کی نگام نیکومیڈیا کی طرف موڑ دی۔ ترک پھر یہ شہبازوں کی طرح ہوا میں پرواز کرنے لگے۔



فلک بدارتی جسے بعض مریخین بلا تو نیہ بھی کہتے ہیں اگر شہزادی کی ماں اور عمر کی

چوالیس بہاریں دیکھ چکی تھی مگر اس کے حسن میں دھلتے سورج کی سی تازت اور سرخی تھی۔
 ملکہ کی حیثیت میں زندگی کے بہترین ایام دوسروں پر حکم چلاتے گزارے تھے اور اگر شوہر
 بیٹی کے حق میں وصیت نہ کو گیا ہوتا تو اس کی بجائے اپنی تخت نشینی اور حکمرانی کا جشن مناتی
 تا جوشی کے بعد حکم و اختیار کا مرکز شہزادی کی ذات بن گئی۔ بلا کوئی چاہتی تھی کہ بیٹی کو
 اپنی ہدایات کے تابع رکھے اور پس پردہ رہ کر حکومت کرتی رہے مگر جوانی حکم دینا جانتی
 ہے حکم سننا اور ماننا اس پر گراں گزرتا ہے۔ شہزادی ماں کی ذاتی مصلحت و حکمت کو
 نظر انداز کر کے صرف نیکو میڈیا کے بہتر مستقبل کی تدبیریں سوچ رہی تھی۔ رستم تخت نشینی
 کے بعد ماں نے اسے سفر قسطنطنیہ اور فرزند قیصر نکولس سے ملاقات کا مشورہ دیا تھا چاہتی
 تھی اگر شہزادی کا حسن نکولس کو عشق کی زنجیر بننا سکے تو قیصر کے معاملات میں اس کا درجہ
 کچھ اور بلند ہو جائے گا مگر بیٹی نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ اسے شہزادہ نکولس سے کوئی
 دلچسپی نہ تھی۔ اپنے اقتدار کے تحفظ کی خاطر ہی وہ لگنے دوسرا مہرہ آگے بڑھایا اور
 شہزادی کو سمجھایا۔

’مرد کے طاقتور بازو ہی تخت و تاج کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اگر تم کہو تو
 میں جنرل ڈونو سے بات پھیڑوں۔ کسی نہ کسی سے تو ہمیں شادی کرنی ہے۔ ڈونو تمہارے
 لیے جان کی بادی بھی لگا سکتا ہے۔‘

شہزادی نے حیرت پاش نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ ’عورت کھیلے
 شادی بے شک ضروری ہے ماں! مگر وطن کی حفاظت اس نکلے بھی ضروری ہے۔‘
 ’اسی لیے تو میں نے تمہارے لیے ڈونو کا انتخاب کیا ہے۔‘
 ’مگر اس انتخاب کا حق آپ کو نہیں مجھے ہے۔‘
 ’کیا تمہارا انتخاب مجھ سے مختلف ہوگا؟‘
 ’شاید۔‘

’میں تمہیں سوچنے کا موقع دوں گی۔ وہ ایک جنرل ہے اور اس کا ہاتھ تمام
 کریم نیکو میڈیا کے دفاع اور اپنے آپ کو مضبوط کر سکتی ہو۔‘

”جنرل کا کام صرف میدانِ جنگ میں لڑنا ہے ماں! ریاست اور اپنے بارے میں سوچنا میری ذمہ داری ہے اور میں یہ ذمہ داری ڈونو کو نہیں سونپ سکتی۔“

یہ کہہ کر شہزادی نے ایک خود مختار ملکہ کی سی شان کے ساتھ قدم اٹھایا اور بلاکونی کو مایوس و متحیر چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب سابق ملکہ نے خود کو پایہ اعتبار سے گرتے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کا اقتدار ختم ہو چکا ہے۔ وہ بیٹی کو اپنی مرضی کی زنجیر نہیں پہنا سکتی۔ جنرل ڈونو کا نام اسی لیے پیش کیا تھا کہ اسے فوج میں سپہ سالار کے عہدے تک پہنچانے میں بلاکونی ہی کا ہاتھ تھا اور سمجھتی تھی اگر اس پر ایک ادا احسان کر دیا جائے تو ڈونو ساری عمر کے لیے اس کا ”غلام“ بن جائے گا۔ اس کے ذریعے وہ بیٹی کو بھی اپنی مرضی کا پابند بنا سکے گی لیکن شہزادی نے جو اب نیکو میڈیا کی خود مختار ملکہ تھی وہ تمام کڑیاں ہی توڑ ڈالیں جو زنجیر بن کر اس کے پاؤں سے لپٹ سکتی تھیں۔

بلاکونی بیٹی کی سرکشی پر دانت پسینے سے گئی۔

”گستاخ لڑکی۔۔۔۔۔ اڑنا سیکھ گئی مگر یہ نہیں جانتی کہ پر کاٹے بھی جاسکتے ہیں۔“ فوراً ہی بلاکونی نے اپنے ذہن میں کبھی ہوئی بساط کے ہرے تبدیل کر دیئے اور جس خانے میں پہلے بیٹی کو کھڑا کر رہی تھی وہاں خود کھڑی ہو کر سونے لگی اگر ڈولومان جائے تو اب بھی جیت اسی کی ہوگی۔ اس نے شہزادی کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا جو اس سے سرکشی پر آتی تھی اور محلات کے تختہ داروغہ کو طلب کیا۔

”جنرل ڈونو کے پاس جاؤ اور کہو میں ملکہ بلاکونی اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“

اس نے یہ حکم بڑی مدہم آواز میں دیا مگر۔۔۔۔۔ ملکہ۔۔۔۔۔ کا لفظ خاص لہجے میں آیا تھا۔ جب داروغہ پلٹنے لگا تو اس کی آواز سرگوشی میں ٹھل گئی۔ اور یاد آئی کہ کسی کو اس ملاقات کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ ڈونو کو ”ٹارس محل“ میں آنے کی دعوت دو اور خیر اس کی رہنمائی کرو۔“

ساتھ ہی سونے کا ایک سیکہ اس کی طرف اچھال دیا۔ ”یہ تمہارا پہلا انعام ہے۔“

داروغہ نے سیکہ دبوچ لیا اور گردن جھکا کر چلا گیا۔ بلاکونی جلدی سے کمرہ آرائش

میں داخل ہو گئی۔ تد آدم آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ جوانی کے ڈھلتے سورج میں ابھی اتنی گرمی اور حسن کے گھٹتے چاند میں ابھی اتنی کشش ضرور باقی تھی کہ اپنے ملاقاتی کو بچپن کر سکے۔ پھر بھی اس نے تھوڑی سی مزید آرائش ضروری سمجھی اور خود کو سنوارنے میں مصروف ہو گئی۔ کوئی پریشانی اور جلدی نہیں تھی۔ جنرل ڈونو پیغام ملاقات پر بھاگا آئے گا۔ اگر اسے کچھ دیر انتظار بھی کرنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ تھوڑا سا انتظار تو اس کے شوقِ ملاقات کو اور بڑھا دے گا۔

یہی سوچ کر اس نے آرائشِ جمال اور تبدیلیِ لباس میں کافی وقت صرف کر دیا اور جب مختلث داروغہ نے آکر اطلاع دی کہ وہ جنرل ڈونو کو ٹارن محل میں چھوڑ آیا ہے تو بلا کوئی نے اسے ہاتھ کھولنے کا حکم دیا اور اس کی تحصیل پر سونے کی دوسری مہر رکھ دی یہ تمہارا دوسرا انعام ہے۔ اب میرے ساتھ چلو۔

دونوں آگے پیچھے چلتے قصرِ شاہی کے عقبی دروازے سے ٹارن محل میں داخل ہوئے۔ اس نے داروغہ کو اسی دروازے کے پاس ٹھہرنے کا حکم دیا اور اس کے ہاتھ میں سونے کا تیسرا سکہ تھا کر آگے بڑھ گئی۔

جنرل ڈونو کمرہ ملاقات میں منتظر تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے ملکہ کا استقبال کیا اور سوچنے لگا کہ بادشاہ کی وفات کے بعد وہ کچھ اور جوان، پرکشش اور خوبصورت ہو گئی ہے۔ بہر حال وہ اسکی محسنہ اور سابق ملکہ تھی جس کا احترام اس پر فرض تھا مگر خود بلا کوئی کچھ بے تکلفی چاہتی تھی۔ جب وہ بیٹھ گئے تو ملکہ نے کہا۔۔۔ جنرل ڈونو! ذرا قریب آ جاؤ میں تم سے کچھ راز کی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

ڈونو قریب آ بیٹھا تو بلا کوئی نے گفتگو کی کتاب اسرا رکھولی۔

تخت نشینی ہو چکی اور قیصر کا شیر شہزادی کے سر پر تاجِ شاہی رکھ کر قسطنطنیہ لوٹ گیا۔ مجھے خوشی ہے مرنے والے کی وصیت پوری ہو گئی مگر شہزادی نوجوان بھی ہے اور نا سمجھ بھی۔ اندیشہ ہے کہ میں ایسی غلطی نہ کر بیٹھے جو ہمارے مستقبل کے لیے خطرہ بن جائے۔ جنرل ڈونو الفاظ کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا مگر کچھ پلے ہنہ پڑا کہ سابق ملکہ

چاہتی کیا ہے؛ گول مول سا جواب دیا۔ ”لوجوانی نادان ضرور ہوتی ہے مگر آپ کی بیٹی آپ کی نگرانی میں غلطی کیوں کرنے لگی؟“

”وہ نادان ہی نہیں گستاخ بھی ہے ڈونو۔۔۔۔۔ کیا تم نے جشنِ تختِ شینی کے روز نہیں دیکھا کہ اس نے عظیم قیصر کے مشیرِ خاص جو زنت اور ددی جرنیل کی ذرا بھی پردا نہیں کی تھی؟“

”کیوں نہیں؛ قیصر کے نمائندوں کے ساتھ شہزادی صاحبہ کا سلوک واقعی تو بین آ میز تھا۔۔۔۔۔“ شاید ڈونو اب اس کی بات کا مطلب سمجھنے لگا تھا۔ ”میں تو ڈر گیا تھا کہ میں معزز سفیرِ ناراض نہ ہو جائیں مگر آپ نے بگڑے ہوئے معاملے کو سنبھال لیا۔ بلا کوئی نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور نیا پانسہ پھینکا۔ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں میں نے بیٹی کے لیے تخت چھوڑ کر غلطی کی ہے مگر میں کیا کرتی۔ بادشاہ نے میرے حقوق کا خیال نہیں رکھا اور صرف بیٹی کے لیے وصیت کی تھی۔“

”یہ بات تو میں بھی کہوں گا، تخت پر جلوس آپ ہی کو زیب دیتا تھا۔“

”اگر میں بادشاہ کی وصیت مناع کر دیتی جس کا علم صرف چند لوگوں کو تھا تو کیا تم میری خاطر ان لوگوں پر قابو نہیں پاسکتے تھے؟“

”مگر آپ نے مجھے اس خدمت کا موقع ہی کب دیا؟“

بلا کوئی نے بے اختیار جنرل کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”ڈونو۔۔۔۔۔ میں اب بھی تمہیں یہ موقع دے سکتی ہوں۔“

ملکہ کے نرم و گداز ہاتھ کی گرمی نے جنرل ڈونو کی نبضوں میں آگ سی بھری۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قیصر اس طرح بھی بہریان ہو سکتی ہے۔ وہ بلا کوئی کی باتوں کے ساتھ اب اس کے جسم میں بھی ایک عجیب سی کشش محسوس کر رہا تھا۔ اچانک بلا کوئی نے اسے نئے تحیر سے دوچار کر دیا اور ساتھ لگ کر اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ ”ڈونو۔۔۔۔۔ تمہیں صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ تخت پر میرے ساتھ بیٹھنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔“

ملکہ کے اس سلوک اور ان الفاظ نے ”کاک ٹیل“ سے بھی بڑھ کر کام دیا۔ عورت

کے جسم کی گداز حرارت اور اقدار کا نشہ - بلا کوئی نے دونوں منتر بیک وقت پھونکے تھے -
جنرل ڈونو ریوانہ ہو گیا اور اس کا بازو ملکہ کی کمر کے گرد سخت ہوتا چلا گیا - " میں آپ کے ہر
حکم کی تعمیل کروں گا -"

بلا کوئی نے خود رشتگی کی حالت میں اپنے تپتے ہوئے سرخ ہونٹوں سے ہونٹوں سے
قرب کر دیے اور جنرل ڈونو نے اس کے پہلے حکم کی تعمیل کی - ملکہ کا قریب اور جسم تو اسے مل
گیا تھا مگر نہیں جانتا تھا تخت کس طرح ملے گا کیونکہ ان کے درمیان شہزادی حامل تھی اور اسے
تخت سے الگ کرنا آسان نہ تھا - شہزادی کی تخت نشینی کی تقریب عظیم قیصر کے مشیر
خاص اور دوسری فوج کے سپہ سالار کی نگرانی میں منعقد ہوئی تھی اور شہزادی کے خلاف کوئی
قدم اٹھانے کا مطلب قیصر سے بغاوت تھی - جنرل ڈونو اس خیال سے پریشان ہو رہا تھا -
کیا بلا کوئی قیصر کے خلاف بغاوت چاہتی ہے - مگر چالاک عورت اس کے ذہن میں ابھرنے والے
خیالات کو بھانپ گئی تھی - بولی :

" پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ڈونو! شہزادی ایک دن اچانک از میدان
فائب ہو جائے گی اور کچھ عرصہ بحیرہ انجیسیٹن کے کسی جزیرے پر قید تنہائی میں رہے گی - ہم
قیصر کو یقین دلا دیں گے اسے تو کون نے اغوا کر لیا یا قتل کر دیا ہے - پھر نیکو بیڈیا کا تخت
خود بخود ہمارے قدموں تک پہنچ جائے گا -"

ڈونو کی ساری پریشانی ختم ہو گئی - بلا کوئی کی تجویز نے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا
— اب وہ اس کی قربت سے مسرور و مطمئن نظر آ رہا تھا کہنے لگا — " حکومت
کرنے کے لیے آپ جیسا باغ ہونا چاہیے -"

" مگر باغ کے ساتھ عودت کو مرو کے مضبوط بازوؤں کی ضرورت بھی ہوتی ہے -"
" آج سے میرے بازو آپ کے ہیں اور آپ کا یہ خوب عودت مجھ میرا ہے -"
" پھر مجھے اپنے بازوؤں میں لے لو -"

جنرل ڈونو نے اس کے دوسرے حکم کی تعمیل کی اور حسین و گداز شہیں بدن کو اپنے
بازوؤں میں جکڑ لیا - پھر ہیکار بلا کوئی محسوس کر رہی تھی کہ ڈونو کا جسم بڑا سخت بازو مضبوط

اور عورت کو اپنی گرفت میں لینے کا انداز بڑا پرجوش اور وحشیانہ ہے۔ وہ بے حد مطمئن تھی کہ اس نے اپنے مقصد کے لیے ایک صحیح آدمی کا انتخاب کیا ہے۔

مخنت خواجہ سہرا تہائی کی اس ملاقات کا مقصد جاننا چاہتا تھا۔ وہ دروازہ سے ہٹ کر بے پاؤں اس کمرے کی دیوار تک پہنچ گیا جہاں سے ان کی ساری گفتگو سننا رہا شہزادی کے اغوا و قید کے ذکر نے اس کے جسم میں عجیب سی سنسنی پیدا کر دی تھی پھر جسم و بازو کی بات چلی تو بڑی آہستگی سے دروازہ پر ٹیپٹ آیا اور یہی اس نے عقل مندی کی تھی کیونکہ چند ہی لمحوں کے بعد ملکہ کمرے سے نکل آئی اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اسی عقبی دروازے میں داخل ہو گئی تھی۔ داروغہ بلا کونی کے کمرے خاص تک ساتھ ہی رہا۔ رخصت کرنے سے قبل ملکہ نے اس کے ہاتھ پر سونے کا چوتھا سیکہ رکھ دیا۔

”یہ آج کا آخری انعام ہے۔“

داروغہ عملات کمر تک جھکا پھر کمرے سے نکل گیا اور بلا کونی ایک بار قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے سراپا کا جائزہ لینے لگی۔ اس کا یہی حسین جسم جنرل ڈونو کیلئے پھندا بن گیا تھا۔



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

عبدالرحمن اپنی روایتی برق رفتاری کے ساتھ نیکو میڈیا کی سرحد میں داخل ہوا ابھی از میدان میں جشن تخت نشینی پر چند ہی روز گزرے تھے اور قیصر کی امدادی فوج قلعہ کی بارگاہ میں مگر کھول کر آرام کر رہی تھی کہ رہا سست کے راستے پر ترک شہسواروں کے گھوڑے دھول اڑاتے گزرنے لگے۔

عبدالرحمن نے اندھا دھند آگے بڑھ کر از میدان پر حملہ کرنے کی غلطی نہیں کی ”مائیکل اوغلی“ نے جو اطلاع دی تھی اس کے مطابق قیصری فوج قلعے میں آتری تھی اور شہر کے قرب و جوار

میں ایسی کمین گاہیں نہیں تھیں جہاں چھاپہ مار دتے چھپ کر بیٹھ سکتے پھر بھی اس نے احتیاطاً نووس میل ادھر ہی پڑا ڈھال دیا تاکہ صورتِ حال کا صحیح جائزہ لینے کے بعد شہر پر دھاوا کرے۔

ریاست میں داخل ہوتے ہی غلّ مچ گیا کہ "ترک آگئے" مقامی باشندوں میں خوف و ہراس کی لہر پھیل گئی۔ نوٹوں نے گھروں کے دروازے بند کر لیے بعض ازمید کی طرف بھاگ گئے۔ غیر ملکی حملہ کے دوران لوٹ مار، پکڑ دھکڑ، دھونس دھاندلی اگرچہ تاریخی روایت بن گئی تھی مگر ترکوں نے نہ کسی کو پکڑا نہ کسی کا گھر لوٹا۔ نہ کسی کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس وہ مقامی باشندوں سے خلیق و محبت کے ساتھ پیش آئے اور انہیں اپنے روزمرہ کے کام جاری رکھنے کی تاکید کی۔

جب دو تین دن میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا۔ دو روز دیک کسی عورت کی بیخ سٹائی نہ دی کسی دروازے پر خطرے کی دستک نہ ابھری تو لوگ بڑے حیران ہوئے اور گھروں کے دروازے کھول کر باہر آگئے۔ انہیں حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ جب قیصری فوجیں کسی علاقے سے گزرتیں تو کھیت اُجڑ جاتے اور اکا دکا عورتیں اٹھالی جاتی تھیں مگر ترکوں نے ان کے کسی معاملے میں دخل نہیں دیا۔ بلکہ بالکل بے تعلق سے ہو گئے تھے۔ اب وہ انہیں "شریف دشمن" کے نام سے یاد کرنے لگے۔

عبدالرحمن نے دو تین گشتی ٹولیاں ادھر ادھر بھیج دیں تاکہ مقامی حالات کی خبر لا سکیں اور خود "مائیکل اوغلی" کے ہمراہ چند سواروں کی معیت میں ازمید کی طرف چل دیا۔ دارالحکومت پر حملہ کرنے سے پہلے وہ بعض ضروری مقامات خود دیکھ لینا چاہتا تھا اور یہ احتیاط بھی مد نظر رکھی تھی کہ کسی کو اس کے سپہ سالار ہونے کا شبہ نہ ہو سکے۔ سواروں کے قافلے میں جن کی تعداد مختصر تھی وہ ایک عام سوار کی حیثیت سے شامل تھا۔ اور سرداری و رہنمائی کی ذمہ داری "مائیکل اوغلی" نے سنبھال رکھی تھی۔

شہر کو تین چار میل پہلے چھوڑ کر یہ گشتی دستہ مغرب کی طرف ہولیا۔ عبدالرحمن کے

کے نزدیک یہ سمت حملہ کے لیے زیادہ موزوں معلوم ہوتی تھی لہذا اسی جانب سے شہر اور قلعہ کے کمزور مقامات کو جانپننے کے لیے آگے بڑھا۔ اسی سمت سے سمندر کے دارالحکومت ہرتی اور کوئیں حصار کو راستہ نکلتا تھا لیکن جو نہی گشتی دستہ ایک برساقی نالے کی اونچی منڈیر سے گزر کر اس شاہراہ کی طرف بڑھا جہاں میدا اور ہرتی کو ملاتی تھی ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ اس شاہراہ پر چار پانچ نامعلوم سوار ہرتی کی جانب اٹے جا رہے تھے۔ ایک سوار نے جہاں کا سروار معلوم ہوتا تھا کسی خوش لباس نازمین کو زبردستی اپنے گھوڑے پر بٹھا رکھا تھا جو بیچ بھی رہی تھی اور مسلسل مزاحمت بھی کر رہی تھی۔ ترک سوار یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے مگر بھاگتے ہوئے سواروں کے غضب میں ایک اور نظارہ اس سے بھی زیادہ بھیانک اور حیرت انگیز تھا۔ اسی شاہراہ پر درختوں کے ایک گھنے جھنڈ کے قریب نامعلوم سواروں کے ساتھیوں اور از میدی فوج کے سپاہیوں کے درمیان باقاعدہ لڑائی ختم ہو رہی تھی۔ نامعلوم حملہ آور جو بیشتر از میدی سپاہیوں کو قتل کر چکے تھے مزاحمت کرنے والے رہے سپاہیوں کو بھی ٹھکانے لگا کر اپنے فرار ہونے والے ساتھیوں کی طرف پلٹ رہے تھے جو خوش پوش حسینہ کو زبردستی اٹھائے لیے جاتے تھے۔ مغلوب گروہ کے صرف تین چار سپاہی شہر کی جانب بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو سکے۔ باقی سب کھیت رہے۔

عبدالرحمن اور اس کے ساتھیوں کو واقعہ کی نوعیت سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ نامعلوم سواروں نے از میدی کسی امیرزادی کو زبردستی اغوا کر لیا تھا اور دو گروہوں کے درمیان خونین کشمکش یقیناً اسی اغوا کا نتیجہ تھی۔ اگر یہ لڑائی محض دو حریفوں کی ہوتی تو ترک سواروں کو مداخلت کی ضرورت نہ تھی مگر معاملہ ایک عورت کے زبردستی اغوا کا تھا۔ جو مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ لہذا یہ جانے بغیر کہ نامعلوم سوار کون ہیں اور کسی امیرزادی کو اغوا کرنے کا مقصد کیا ہے۔ عبدالرحمن کی ترک غیرت جوش میں آئی۔ اس نے ان واحد میں مظلوم عورت کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور ترکوں کو نامعلوم سواروں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔

عبدالرحمن کے ساتھ ترک سوار نالے کو چھوڑ کر اس طرح شاہراہ کی طرف چھپے جیسے تیرکمانوں سے نکلے ہیں۔ انہوں نے بجلی کی مانند لپک کر اگلی جانب سے سواروں کا راستہ کاٹا۔ یہ ایک عجیب و غریب صورت حال تھی غالب گروہ جو از میدی سپاہیوں کو خاک و خون میں لوٹا کر اور امیر زادی کو اغوا کر کے بکرا جا رہا تھا اچانک ترک سواروں کی کھینچی ہوئی تلواروں کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ مقابلہ برابر کا تھا کیونکہ یہاں بھی فریقین کی تعداد ایک جیسی تھی۔ غالب گروہ کا سردار جو ایک ہاتھ سے عورت کو سنبھال رہا تھا۔ یہاں سے بھی نکل جانا چاہتا تھا اس نے اپنے ساتھیوں کو ترکوں سے نمٹنے کا حکم دیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ عبدالرحمن نے اس کا ارادہ بھانپ لیا اور ترکوں کو نامعلوم سواروں کے مقابلے میں چھوڑ کر تنہا سردار کے تعاقب میں نکلا۔ سردار ڈیڑھ دو فرلانگ سے زیادہ نہ بھاگ سکا تھا کہ عبدالرحمن سر پر پہنچ گیا اور تلوار کے ایک ہی وار سے بازو کاٹ دیا۔ وہ تورا کر گھوڑے سے اُلٹ گیا ساتھ ہی عورت بھی گری۔ عبدالرحمن نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی، کود کر نیچے آیا اور نازنین کو سنبھالنے لگا۔

نامعلوم سواروں نے اپنے سردار کو گرتے اور مرتے دیکھ لیا تھا۔ اب وہ ترک تلواروں کے زخم کھا کر ایک طرف فرار ہونے لگے۔ 'مائیکل اوغلی' کے حکم پر ان کا تعاقب نہیں کیا گیا۔

از میدی نازنین نے احسان مند نگاہوں سے عبدالرحمن کی طرف دیکھا۔ شکر یہ ادا کیا اور اپنی خوب صورت گردن اٹھا کر پوچھا۔ 'کون ہو تم؟'

'ایک ترک سپاہی۔'

'ترک.....؟' وہ کسی سرنی کی طرح بدک گئی۔

'مگر آپ کون ہیں۔ وہ لوگ کون تھے جو آپ کو اغوا کر کے لے جا رہے

تھے.....؟'

نوجوان حسینہ جو لباسِ ادا لب و لہجہ سے کسی بڑے خاندان کی لڑکی معلوم ہوتی تھی

جواب دینے کی بجائے عبدالرحمن کو نگاہِ شوق سے دیکھنے لگی۔ پھر مسکرا کر بولی۔

”کیا سب ترک تمہاری طرح بہادر اور خوبصورت ہوتے ہیں؟“

عبدالرحمن نے نگاہ جھکالی۔ ”یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔ میں نے کچھ اور پوچھا تھا۔“ وہ اس کی ٹوٹی پھوٹی روغن زبان سے لطف اٹھاتی ہوئی بولی۔

”عملہ آدروں کے بارے میں جاننا چاہتے ہو۔ تو کچھ نہیں بتا سکتی کیونکہ میں خود بھی نہیں جانتی۔ میرے بارے میں کچھ معلوم کرنے کا شوق رکھتے ہو تو شاید یہ بات تمہارے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی کہ میں نیکو میڈیا کے تحت وناج کی وارث اور حکمران ہوں۔“

یہ جان کر کہ وہ از میڈ کی شہزادی سے مخاطب ہے، جو کچھ عرصہ قبل اپنے باپ کی جگہ تخت نشین ہوئی تھی عبدالرحمن دنگ رہ گیا۔ مگر اپنی حیرت ظاہر نہ ہونے دی۔ ”پھر تو میں از میڈ کی ملکہ کو سلام پیش کرتا ہوں۔“

”اگر تم دربار از میڈ میں حاضر ہو کر سلام کرتے تو منہ مانگا انعام پاتے مگر اس وقت میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتی۔“ پھر شہزادی نے اپنے گلے سے جواہرات کا ہار اتار کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”فی الحال میری طرف سے یہ انعام قبول کرو۔ تمہارے میری جان بچائی ہے۔“

عبدالرحمن ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ”جان انعام کسیے نہیں بچائی۔“

شہزادی ایک قدم آگے بڑھ آئی۔ ”مگر یہ جواہرات معمولی نہیں۔“

”یہ آپ کا زیور ہے آپ ہی کے گلے میں اچھلے گا۔“

”تم اسے اپنا زیور سمجھو۔“

”سپاہی کا زیور صرف لوہے کی تلوار ہے۔“ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”اگر میں نے تمہارے

گلے کا زیور قبول کر لیا تو ترک سپہ سالار مجھے معاف نہیں کرے گا۔ ترک عورتوں کی عزت بچاتے ہیں ان کے زینہ پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔“

شہزادی کی دل چسپی کچھ اور بڑھ گئی وہ عبدالرحمن کو عجیب سی نظروں سے دیکھ کر کہنے

لگی۔ ”پھر یہ ہار اپنے ہاتھ سے میرے گلے میں ڈال دو۔“

عبدالرحمن ایک لمحہ جھجکا پھر شہزادی کے ہاتھ سے ہار لے کر اس کی گردن میں

ڈال دیا۔ شہزادی تڑپ کر بولی۔ ”اب اپنے سپہ سالار سے ملو تو کہنا کہ اس کا ایک قرض میری

گردن پر ہے۔“

اسی اثناء میں ترک سوار بھی وہاں پہنچ گئے۔ عبدالرحمن فوراً ’ مائیکل اوغلی‘ سے

مخاطب ہوا۔

’سردار۔۔۔۔۔! یہ نیکو میڈیا کی حکمران شہزادی ہیں۔ انہیں عزت کے ساتھ

ازمید پہنچانا ہمارا فرض ہے۔“

یہ بات سب کے لیے حیرت انگیز ثابت ہوئی کہ نیکو میڈیا کی حکمران شہزادی اپنی

ہی ریاست میں اغوا کی جا رہی تھی۔ مائیکل اوغلی نے پوچھا۔ ’ وہ لوگ آپ کو زبردستی کیوں

اٹھالے جانا چاہتے تھے؟‘

شہزادی بتانے لگی۔ ’ وہ کون تھے، کیوں اغوا کرنا چاہتے تھے، مجھے کچھ علم نہیں

میں تو سمندرہ کے والی پرنس کالوجینس سے ملنے نکلی تھی۔ یہاں سے تھوڑی قدر خریدی کا

ایک مقام ہے۔ وہیں ہماری ملاقات طے ہوئی تھی۔ محافظ دستہ میرے ساتھ تھا مگر

رتے ہی میں نامعلوم سواروں نے اچانک حملہ کر کے محافظ دستہ کے افسر کو قتل کر دیا اور

چند آدمی مجھے زبردستی گھوڑے پر بٹھا کر بھاگ نکلے۔ تمہارے سپاہی نے مجھے بچا یا اور

تمہارے اپنے سواروں سمیت حملہ آوروں کو بھاگا دیا جس کے لیے میں تمہارا شکر یہ ادا کرتی ہوں

موقع ملا تو اس مہربانی کا بدلہ چکانے کی کوشش کروں گی“

اب مائیکل اوغلی عبدالرحمن سے مخاطب ہوا۔

’ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے ہمارے سپہ سالار کو بھی دلچسپی ہو سکتی ہے کیوں نہ

ازمید کی بجائے شہزادی کو اس کے پاس پہنچا دیا جائے؟‘

شہزادی کانگ آرٹ گیا مگر عبدالرحمن کا جواب اطمینان بخش تھا۔ ’ سپہ سالار اس بات

کو پسند نہیں کریں گے کہ ہم ایک عورت کو گرفتار کر لائے ہیں۔‘

’ یہ محض عورت نہیں نیکو میڈیا کی ملکہ ہیں۔‘

’ اسی لیے انہیں ازمید پہنچانا چاہیے۔ ترک عورتوں کو یرغمال نہیں بناتے ہم لڑ

کر جیتیں گے۔‘

شہزادی نے ایک بار پھر عبدالرحمن کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ اس کی گفتگو میں بہادری کا جوہر تھا۔ مائیکل اوغلی کہنے لگا۔ "اگر شہزادی صاحبہ اس بات کی ضمانت دے سکیں کہ ان ترک سواروں پر حملہ نہیں ہوگا جو انہیں اپنی حفاظت میں چھوڑنے جائیں گے تو میں ان کی واپسی کا انتظام کر دیتا ہوں۔"

شہزادی نے انجیل مقدس کی قسم کھا کر یقین دلایا کہ وہ اپنے محسنوں کو بصد عزت واپس بھیج دے گی۔ مائیکل اوغلی نے عبدالرحمن ہی سے کہا کہ وہ اپنے ہمراہ چار سپاہی لے جائے اور شہزادی کو از میدان پہنچائے پھر فداً ہی شہزادی کے لیے ایک گھوڑے کا انتظام کر دیا گیا اور پانچ ترک محافظوں کی نگرانی میں شہزادی از میدان کی طرف روانہ ہوئی۔ مائیکل اوغلی نے عبدالرحمن کو ایک عام سپاہی کی حیثیت میں اس لیے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ شہر کے ان مقامات کو اچھی طرح دیکھ سکے جو حملہ کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ شہزادی اور عبدالرحمن کے گھوڑے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اچانک وہ کہنے لگی۔ "تم ایک بہادر محسن ہو۔ مگر میں نے ابھی تک تمہارا نام نہیں پوچھا۔"

"عبدالرحمن کہتے ہیں مجھے۔"

شہزادی مسکرائی۔ "سنا ہے ترک سپہ سالار کا بھی یہی نام ہے؟"

"ہاں۔۔۔۔۔ بہت سے ترک یہی نام پند کرتے ہیں۔"

کچھ دیر خاموشی سے سفر ہوتا رہا۔ پھر حوال عبدالرحمن نے کیا۔

"سندھ کے حکمران کالو جی نس سے ملاقات کس سلسلے میں طے پائی تھی؟"

شہزادی نے چونک کر دیکھا۔ "جواب غیر ملکی ہم پر حملہ آور ہوں تو دوڑ پڑوسی

حکمرانوں کی ملاقات کس سلسلے میں ہو سکتی ہے؟"

"مگر کالو جی نس ایک بدعہد حکمران ہے اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا ممکن

ہے اغوا کرنے والے حوال اسی نے بھیجے ہوں۔"

شہزادی نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ "وہ مجھ سے نہیں میری والدہ ملکہ بلا کوئی

سے ملنا چاہتا تھا۔ مگر معاملہ ریاست کے دفاع کا تھا۔ اس لیے مان نے مجھے بھیج دیا کیونکہ

ابائیں ہی قانونی حکمران ہوں مگر تم کالوجی نس کو کب سے جانتے ہو؟
 وہ ترک سلطان سے بھی فریب کر چکا ہے۔ ترک بدعہد اور جھوٹے آدمی پر
 اعتماد نہیں کرتے۔

شہر قریب آگیا تھا۔ عبدالرحمن نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ ہم یہیں
 سے لوٹ جائیں گے۔

”میں تمہیں اپنا مہمان بنانا چاہتی ہوں عبدالرحمن! شہزادی نے ملتی لگا ہوں سے
 دیکھ کر کہا۔

”مگر یہ بات روانگی سے پہلے طے نہیں ہوئی تھی۔ ہم جلدی واپس نہ گئے تو سردار
 پریشان ہوگا۔“

”اگر واپسی کا قول نہ دے سکی ہوتی تو تم جیسے بہادر کو کبھی واپس نہ بھیجتی۔“
 ”ہو سکتا ہے بہت جلد پھر ملاقات ہو۔“
 ”میں تمہارے سپ سالار سے درخواست کروں گی کہ از میدان پر حملہ کرنے والی ترک
 فوج میں تمہیں شامل نہ کیا جائے۔“

”وہ کس لیے؟“

”میں تمہاری زندگی چاہتی ہوں اور میدان جنگ میں سپاہی کی تلوار کسی محسن
 اور دشمن کا چہرہ نہیں پہچانتی۔“

عبدالرحمن کا تہقیرہ بلند ہوا۔ ”میں تمہارا پیغام اپنے سپ سالار تک پہنچا دوں گا۔“
 ”اور میں تمہارا یہ احسان بھی یاد رکھوں گی۔“

پھر شہزادی گھوڑا دوڑاتی از میدان کی طرف بڑھ گئی۔ عبدالرحمن چند لمحے کھڑا
 شہزاد قلعے کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے بھی گھوڑے کی باگ مٹھی اور اپنے سواروں
 کے ہمراہ پلٹ آیا۔



شہزادی قلعہ میں داخل ہو رہی تھی اور جنرل ڈونواپے دستہ خاص کے ساتھ قلعہ سے نکل رہا تھا۔ جب دونوں کا آنا سامنا قلعہ کے برنجی دروازے پر ہوا، جنرل ڈونواپے واپس آتے دیکھ کر ہکا بکا سا رہ گیا۔ پھر فوراً اس نے چہرے پر خوشی کے تاثرات پیدا کر لیے اور بولا۔

”شہزادی صاحبہ! شکر ہے آپ لوٹ آئیں۔ میں آپ کی تلاش میں جا رہا تھا۔“ جنرل ڈونواپے نے محافظ دستہ کے دو سوار بھی تھے جو نامعلوم حملہ آوروں سے جان بچا کر بھاگے تھے۔ آپ کے محافظ سواروں نے اطلاع دی تھی کہ رستے میں حضور پر کسی دشمن نے حملہ کر دیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ حملہ ہوا اور مجھے گرفتار بھی کر لیا گیا۔“

شہزادی نے مصلحتاً ترکوں کی امداد نہیں کا ذکر مناسب نہ سمجھا اور جنرل سے کہا، ”آپ کو حملہ آوروں کا کھوج لگانا زندہ یا مرہ میرے سامنے پیش کرنا ہوگا۔“ آپ کے ہر حکم کی تعمیل ہوگی۔“ جنرل ڈونواپے نے جواب دیا، ”میں حضور کے دشمنوں کا کھوج لگانے جا رہا ہوں۔ آپ فوراً ملک سے ملیں وہ حملہ کی خبر سن کر بہت زیادہ پریشان ہیں۔“

جنرل ڈونواپے دستہ خاص کے ہمراہ قلعہ سے نکلنا چلا گیا اور شہزادی نے شاہی محلات کا رخ کیا۔ یہاں ہر طرف کہرام مچا تھا اور ہر فرد کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا کہ ”ترک سوار شہزادی صاحبہ کو پکڑ کر لے گئے۔“ مگر شہزادی کو اتنے دیکھا تو ہر غلام، ہر کنیز، ہر خواجہ سرا شکر کا کلمہ پڑھنے اور خداوند کے فضل کا ذکر کرنے لگا۔ فوراً ہی دو تین کنیزیں ملکہ بلاکونی کو اطلاع دینے بھاگ گئیں کہ شہزادی صاحبہ آگئی ہیں۔ یہ ایک عجیب مرخوہ ”تھا جسے سن کر بلاکونی لپکتی بھپکتی آئی اور اتنے ہی بیٹی سے لپٹ گئی۔“

”اوہ بیٹی! تمہیں زندہ و سلامت دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔“ ورنہ جب تمہارے زخمی محافظوں نے آکر حملہ اور اغوا کی خبر سنائی میری جان ہی نکل گئی تھی۔ تم ٹھیک تو ہونا؟

”بچ گئی ہوں مگر بیس مہماقتل ہو گئے“

بلاکونی نے بیس مہماقتلوں کے قتل کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”سنا ہے حملہ آور ترک تھے؟“

”ترک — — نہیں — ترک کسی عورت پر حملہ نہیں کرتے۔“

”پھر وہ کون بد نحت تھے؟“

”پرنس کالو جی نس کے آدمی۔“

”پرنس کالو جی نس“ کا نام کسی اعلیٰ کے بغیر شہزادی کی زبان سے نکل گیا۔

اس کے متعلق اپنے ترک محسن کی بات ذہنی میں رہ گئی تھی۔ مگر یہ نام سنتے ہی ملکہ بلاکونی کے چہرے پر ایک سایہ سا گزرا گیا۔ گھبرا کے بولی ”شاید تمہیں دھوکا ہوا ہے۔“

”جنرل ڈونو حملہ آوروں کی تلاش میں گیا ہے اگر وہ نہ مل سکے تو ان کے سردار کی

لاش مزور مل جائے گی۔“

شام سے پہلے جنرل ڈونو قلعہ میں لوٹ آیا۔ حملہ آوروں کا کوئی سراغ نہ مل سکا تھا

مگر مہماقتلوں کے ہلاک ہونے والے سپاہیوں اور تین نامعلوم حملہ آوروں کی لاشوں کے

ساتھ ان کے سردار کی لاش بھی قلعہ میں پہنچ گئی۔ ایک آدمی نے اسے شناخت کر لیا۔ وہ سمندر

کی ریاست کا ایک بدنام لٹیڑا تھا اور پرنس کالو جی نس بھی اس سے بعض کام لیا کرتا تھا۔

اس انکشاف سے ملکہ بلاکونی کے چہرے پر ہوا بیاں اڑنے لگیں۔ اس نے اسی رات جنرل

ڈونو کو پھر تار میں عمل میں بلایا۔ قاصد اب بھی محنت خواہ نہرا تھا۔

ملکہ بلاکونی اور جنرل ڈونو دو بارے ہوئے جواریوں کی طرح ملے۔ اقتدار کی بھوک

عورت غمزدہ لہجے میں بولی۔ ”شہزادی کو غائب کرنے کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔“

”آپ کو پرنس کالو جی نس سے مدد نہیں لینا چاہیے تھی۔“

”میں نے اسے خون خرابہ سے منع کیا تھا۔ شہزادی کے بارے میں بھی تاکید کر دی

تھی کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہو صرف کچھ عرصہ قید تنہائی میں رکھو۔“

”مگر اس کے بھیجے ہوئے آدمی خون خرابہ سے بار نہ رہ سکے ان کے سردار کی لاش

بھی شناخت کر لی گئی۔“

”تم اس لاش کو کسی گڑبھے میں کیوں نہ پھینک آئے؟“

”لاش بالکل غیر متوقع طور پر ملی، مجبوراً لانی پڑی مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی

شہزادی کو اس کے ہاتھ سے بچایا کس نے؟ وہ تو اُسے لے کر نکل گیا تھا۔“

”بچانے والا وہی ہو گا جس نے سردار کو قتل کیا مگر وہ کچھ نہیں بتاتی کہ کون تھا؟“

”اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟“

”مجھے صرف تخت و تاج سے دل چسپی ہے۔ بیٹی کی زندگی خطرے میں نہیں ٹال

سکتی۔ اب کچھ سوچ کر فیصلہ کروں گی۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”ڈونو! تم میری ضرورت بن چکے ہو۔“



عبدالرحمن نے چشم خود از میدان کے شہزادہ قلعہ کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ وہ مقامات

بھی ذہن نشین کر لیتے تھے جہاں سے حملہ مفید ہو سکتا تھا پھر علی بک، کراخی بک اور افیجی

خواجہ جیسے ترک سرداروں کو اپنے کشتی مشاہدے کی تفصیلات سنائیں۔ مائیکل اوغلی کی معلومت

سے آگاہ کیا اور جنگ کا نقشہ تیار کر لیا۔ از میدان کے دفاع کا انحصار قیصری فوج پر تھا۔

وہاں ہی پر ضرب لگانا چاہتا تھا۔ اُس نے مہمند پر علی بک، میسرہ پر کراخی بک کو متعین

کیا اور افیجی خواجہ کو اپنے ساتھ قلب میں رکھا۔ حملہ کی تیاریوں میں دو روز مزید صرف

ہو گئے اور تیسرے دن جب مورچ ابھی اناطولیہ کے پہاڑوں سے تانک جھانک کر

رہا تھا ترک پھر یہی حرکت میں آگئے۔

شکر کی تعداد زیادہ نہ تھی مگر مختلف سمتوں میں دستوں کی ترتیب اور روانگی

کا نظارہ ایسا تھا کہ اس پر ایک لشکر جبار کا گمان ہوتا تھا۔ ڈھونڈوں کی تال اور نیرپوں کے شور میں منزلِ فنا کا نغمہ گونج اُٹھا۔ سوار اور پیادہ دستے اُس نغمے کی دھن پر دیوانہ وار اُگے بڑھ رہے تھے۔ منزلِ فنا کا یہ نغمہ رفاص درویشوں اور ترک سپاہیوں میں یکساں مقبول تھا جو اُن کے ولوں میں ایک نئی تڑپ، جوصلوں میں ایک نئی دیوانگی پیدا کر دیتا وہ دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے نکل جاتے تھے۔

ابھی ہراول دستہ مائیکل اوغلی کی قیادت میں شہر کے حاشیے پر پہنچا تھا کہ قلعہ کا دروازہ کھلا اور رومی فوج قیصری پر حم لہراتی اور ڈھول تاشوں کی لے پر جھومتی قلعہ سے باہر نکل آئی۔ جنرل ڈونو کی کمان میں مقامی سپاہ صرف فصیل کی حفاظت پر متعین کی گئی تھی۔ حکمران شہزادی اپنی ماں ہلاکوئی کے ساتھ فصیل پر پہنچ گئی تاکہ جنگ کا نظارہ کر سکے اور فوج کو مناسب ہدایات بھی دیتی رہے۔ جب اُس نے فصیل کی ایک برجی سے ترک دستوں کو اُگے بڑھتے دیکھا تو اپنے جسم میں ایک عجیب سی سنسنی اور دل میں ایک نامعلوم سی دہشت محسوس کی، مگر دوسرے لمحے قیصری فوج کی کثرت اُڑتے پرچموں اور چمکتے دھتکے مہتھیاروں پر نظر ڈالی تو اپنے آپ کو مطمئن کرنے لگی کہ اگر ترکوں کی ساری فوج وہی ہے جو سامنے دکھائی دے رہی ہے تو پھر گھبرانے کی ضرورت نہیں قیصری فوج اور مقامی سپاہ اس سے تعداد میں ہمین چار گنا ہوگی یہی کثرت وجہ سکون تھی مگر سبجانے کیا بات تھی؟ اور کوئی بات تھی ضرور! کہ دل کو دھڑکا سا لگا تھا اور اس کے تصور میں بار بار وہی منظر گھوم جاتا جب اُس نے ترک سوار عبدالرحمن کو سمندر کے لیرے پر کسی جیتے کی طرح جھپٹتے اور پوری ہیبت کے ساتھ کندھے تک اس کا بازو کاٹتے دیکھا تھا۔ حالانکہ عام حالات میں وہ ایک سیدھا سا دانا اور خوبو سپاہی لگتا تھا۔ اچانک وہ پریشان ہو گئی۔ قلعہ سے بہت دور شہر کے حاشیے پر ہراول دستوں میں جھڑپ ہونے لگی تھی اور اتنی قدری کے باوجود اُس نے لباس سے ترک دستہ کے سالار مائیکل اوغلی کو پہچان لیا جو اسے سپہ سالار کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔

ہراول دستوں کی پہلی جھڑپ کے ساتھ کچھ اور بھی ہوا۔ ترک مہینہ اور میسرہ کے

سوار بڑی تیزی کے ساتھ دائیں بائیں پھیل گئے اُن کے ساتھ وہ نیزہ بردار پیادہ دستے تھے جو دشمن پر پہلی ضرب لگاتے اور اُسے یکے تاز سواروں کے منہ میں دھکیل دیتے۔ عبدالرحمن زرہ بکتر سے آراتہ اور نمر پر فولادی خود اڑھے ترکوں کے بڑے پرچم کے نیچے قلب میں نمودار ہوا۔ وہ اس فوجی لباس میں کچھ بدلا بدلا اور پہلے سے کہیں زیادہ وہیہ اور خوشنوار نظر آتا تھا۔ بہت جلد وہ ہراول دستہ کے عقب میں پہنچ گیا۔ شہزادی نے فصیل کی برجی سے ٹرک لشکر کی اس تیز نقل و حرکت کو دیکھا اور قلب پر بھی نگاہ ڈالی جہاں ترک سپہ سالار اپنا گھوڑا کداتا ہوا سواروں کو ہدایات دے رہا تھا مگر اُس کی ساری توجہ ہراول دستوں کی لڑائی پر مرکوز تھی وہ ترک ہراول میں اپنے محسن سوار کو تلاش کر رہی تھی جو مائیکل اونلی کا سپاہی تھا اور اُسے دستانے میں ہونا چاہیے تھا لیکن ہزار کوشش کے باوجود اپنے محسن کی صورت یا جھلک بھی نہ دیکھ سکی اور اس خیال سے کچھ مطمئن سی ہو گئی کہ شاید ترک سپہ سالار نے اُسے میدان جنگ میں نہیں بھیجا۔

ہراول دستوں کی جھڑپ شدت اختیار کر گئی۔ اچانک رومی دستہ پیچھے ہٹتا نظر آیا پھر اُس میں جگمگ مچ گئی مگر اُس کے ساتھ ہی رومی میسرہ بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا کہ ہراول کو تباہی سے بچا سکے اور ترک مہینہ نے بجلی ایسی سرخسٹ سے حرکت کی۔ ترکوں اور رومیوں کا دوسرا تصادم بڑا ہولناک تھا۔ میدان جنگ ڈھول تاشوں اور نغیر یوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ ناگہاں ترک سپہ سالار نے تلوار کو جنبش دی اور اپنے میسرہ کو حملہ کا اشارہ کیا۔ ترک پیادے اور سوار منزل فنا کے نغسے کی دھن پر رومی مہینہ پر چھپے اور میدان کے دونوں بازوؤں میں جنگ کا بانار گرم ہو گیا۔

ابھی اہل کاکھیل شروع ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ یک لخت ترک منجنیقیں اور دبا بے حرکت میں آگئے جو قلب کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ قلعہ پر سنگباری ہونے لگی۔ رومی منجنیقیں ان کے مقابلے میں بہت ہلکی اور کمزور تھیں مگر اب قلعہ سے بھی ترک لشکر پر تھپہ برسائے جانے لگے۔ دونوں قلب خاموش کھڑے تھے۔ ترک سپہ سالار نے رومی میسرہ کو پیچھے دھکیل دیا تو عبدالرحمن نے اپنے قلب کو آگے بڑھایا۔ رومی

نے بھی جنبش کی۔ سوج سر پہ پہنچ گیا تھا۔ جب دونوں فوجیں بڑی وحشت کے ساتھ ایک دوسرے سے لٹھم لٹھم لگتی ہو گئیں، ترک منجیقیں اور دبابے بھی آگے بڑھ آئے اور بڑے بڑے پتھر قلعہ کی فصیل پر ٹوٹ رہے تھے۔ ان پتھروں کے درمیان ہانڈیوں میں نفت کی آگ اور جلتے ہوئے شہتیر بھی گرنے لگے۔ ایک فوجی افسر بھاگا بھاگا شہزادی کے پاس پہنچا اور عرض گزار ہوا۔

”حضور! یہاں سے ہٹ جائیں۔ یہ جنرل ڈونو کا پیغام ہے۔“

”جنرل ڈونو سے کہو وہ اپنا کام کرے اور جب ترک فصیل کے قریب آجائیں تو ان پر ’آتش یونانی‘ برسائے۔“

شہزادی بدستور فصیل کی برجی میں بیٹھی جنگ کا تماشہ دیکھتی رہی یونانی آگ برسائے والے گویے زیادہ دُور تک مار نہ کر سکتے تھے اور جب تک ترک قلعہ کی دیواروں کے قریب نہ پہنچ جاتے ان سے کام نہیں لیا جاسکتا تھا۔

رومی لشکر بڑی جوانمردی سے ترکوں کو روکے کھڑا تھا جو فصیل کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دائیں بائیں بھی شدید جنگ جاری تھی۔ ادھر ادھر پتھر گر رہے تھے۔ دھول اُڑ رہی تھی۔ لوہا لوہے سے بکج رہا تھا۔ جسم چھدر رہے تھے۔ گردنیں کٹ رہی تھیں۔ سوار گر رہے تھے۔ گھوڑے ہلکے اور بھاگ رہے تھے، ناگہاں ترک قلب کے نیزہ ہماروں نے رومی سواروں کے ایک دستہ پر تباہ کن ضرب لگا کر آسے ترک سالہ کے منہ میں دھکیل دیا۔ عبدالرحمن کے بیکہ تازہ سوار شاید اسی تاک میں تھے۔ چلتیوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ رومی قلب تباہی سے دوچار ہو گیا۔ دوسری طرف سے انہی خواجہ کے سواروں نے ضرب لگائی۔ قیصری سوار اپنے پیادوں سمیت پیچھے ہٹے۔ ترکوں نے بڑھ کر اورد بایا۔ خود عبدالرحمن رومی سواروں کو کاٹتا ہوا قیصری پرچم کے قریب پہنچ گیا۔ جہاں رومی سپہ سالار بدن پر فولاد پہنے سر پر پتیل کی لمبوتری ٹوپی سجائے جس کے وسط میں رنگیں پرول کی لکیر تھی آہن پوش سواروں کے حلقے میں کھڑا تھا۔ ادھر بھی خواجہ نے تہ کیا ادھر عبدالرحمن نے قلم اٹھانے والے کا بازو کاٹ کر چھینک دیا اور

قیصری پرچم زمین پر گرا جس کے گرتے ہی ترکوں نے "اللہ اکبر" کا غلغلہ انداز نعرہ بلند کیا اور "یا نصیر" کا ورد کرتے دشمن پر ٹوٹ پڑے۔

پرچم گرتے ہی رومی فوج میں ضعف و بزدلی کے آثار پیدا ہو گئے۔ میسرہ کے دستوں میں بھگدڑ مچ گئی کہ شاید قیصر کا بھیجا ہوا سپہ سالار مارا گیا مگر وہ گھوڑے پر سوار اپنے قلب کو تھے رہنے کی ہدایت دے رہا تھا جب کہ سواروں کے حوصلے ٹوٹ رہے تھے۔

فصیل کی رُہی سے شہزادی نے ایک لڑنا دینے والا منظر دیکھا۔ ترک سپہ سالار کسی درندے کی طرح ایک صف کو چیرتا ہوا بڑھا اور رومی سپہ سالار پر بھٹا۔ یکے تاز سوار اس کے پیچھے تھے جنہوں نے آتے ہی آہن پوش سواروں میں تباہی مچادی اور موت کو قریب آتے دیکھ کر قیصر کا بھیجا ہوا جرنیل اپنے آہن پوش محافظوں کے ہمراہ بڑی تیزی سے قلعہ کی طرف پلٹا۔ سپہ سالار کو نکلتے دیکھ کر مہینہ اور میسرہ کے دستے بھی بھاگے۔ ترکوں نے ان کا تعاقب کیا مگر چانک عبدالرحمن نے انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اب وہ فصیل سے اس قدر قریب تھا کہ ندہ و جوش اور فولادی خود کے باوجود شہزادی نے اسے پہچان لیا۔ فرط حیرت سے کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ بعضوں میں خون تیزی سے سنسانے لگا جس محسن کو آج تک ایک معمولی سپاہی سمجھتی رہی وہی ترک فوج کا سپہ سالار عبدالرحمن تھا۔

شہزادی نے ایک اور نظارہ بھی کیا۔ شہر کے طشے سے تھوڑے ہی فاصلے پر خیموں کا ایک نیا شہر آباد ہو گیا تھا اور عبدالرحمن ترک لشکر کے ہمراہ اسی شہر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ دن بھر قلعہ کے سامنے جنگ بھی ہوتی رہی اور ترک اپنا پٹاؤ بھی تبدیل کرتے رہے جس کی طرف کسی کو توجہ دینے کا موقع نہ ملا اور یہ ایک ایسا عجیب و غریب واقعہ تھا جس نے شہزادی پر واضح کر دیا کہ ترک نیکو میڈیا کی شکار گاہ میں داخل ہو چکے اور رومی فوجیں ان کا شکار ہیں جو قلعہ کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئیں مگر دو ہزار لاشیں اپنے پیچھے پھوڑ آئی تھیں۔

میدان جنگ میں پکھری ہوئی لاشیں شہزادی کے ذہن میں قبرستان کی ہزاروں

صلیبوں کی طرح کھڑی ہو گئیں۔ اس نے خوف سے ایک جھرجھری لی اور برہی کا زینہ اتارنے لگی۔ وفادار غلام انطونیو جو نئے محافظ دستہ کا افسر مقرر ہوا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ بلکہ بلا کوئی جمانے کب لوٹ گئی تھی۔



پہلے دن کی جنگ بڑی مایوس کن تھی اور اس کا نتیجہ رُوح فرسا تھا۔ شہزادی نے فوراً جنگی کونسل کا اجلاس بلایا اور فوجی ماہروں سے گفتگو کی۔ رومی سپہ سالار نے میدان جنگ سے فرار کا عذر پیش کرتے ہوئے کہا میں نے ایک جنگی چال سوچی تھی کہ ترک لشکر ہمارا تعاقب کرتا ہوا قلعے میں گھس آئے اور اُسے گھیر کر ہلاک کر دیا جائے لیکن ترک سپہ سالار نے اپنے سواروں کو تعاقب سے روک دیا اور میری چال کامیاب نہ ہو سکی۔

”اگر یہ چال تھی تو ترک سپہ سالار زیادہ ہوشیار اور عقلمند ثابت ہوا۔“
کسی نے سپہ سالار پر طنز کی: ”آپ کی چال نے ہماری فوج کے حوصلے پست کر دیئے۔“

جنرل ڈونو نے خیال ظاہر کیا۔ ”اگر پرنس کالوچی نس اور شہزادی صاحبہ کی ملاقات ہو جاتی اور سمندرہ کی فوج نے عقب سے ترکوں پر حملہ کیا ہوتا تو جنگ کا نقشہ بدل جاتا۔“
شہزادی مشتعل ہو گئی۔ ”جنرل ڈونو! مت بھولو کالوچی نس کی ملاقات میرے سواغیا کا بہاد تھا۔ اس نے دھوکے سے بلا کر مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ وہ بد عہد، مکار اور ناقابل اعتبار آدمی ہے۔“

”معافی چاہتا ہوں شہزادی صاحبہ! ڈونو نے فوراً پنیتر بدلایا۔ اگر سمندرہ سے مدد آئے تو بھی ہم قلعہ میں محفوظ ہیں۔“

’ ہمیں قلعہ ہی میں بیٹھ کر دفاع کرنا چاہیے۔ ترکوں کے ساتھ کھلے میدان میں جنگ کرنا خطرناک ثابت ہوگی۔‘

اور اس فیصلہ کے بعد جنگی کونسل کا اجلاس ختم ہو گیا۔ شہزادی دل میں بہت سے دھڑکے لے کر اپنے قصر کی طرف روانہ ہوئی۔ وہ اس حقیقت کو جھٹلانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی تھی کہ ترک سپہ سالار نے رومیوں پر اپنی فوجی برتری ثابت کر دی اور میدان جنگ سے کامیاب لڑا۔ بلکہ اس کی بے مثل بہادری نے شہزادی کے دل میں ایک نئی چمن ایک نئی کسک پیدا کر دی تھی و فادار انطونیو اب بھی اس کے ساتھ تھا۔ قصر کی ایک امداری عبور کرتے ہوئے شاہی محلات کے مخنث داروغہ کی آواز سن کر دونوں چونکے اور رُک گئے۔ راہداری کے موڑ پر وہ شہزادی کی کنیز خاص فلپانا کو دھمکا رہا تھا۔ اگر تو نے آج ہی رات یہ کام نہ کیا تو کوڑوں سے تیری کھال اُدھیر دی جائے گی۔‘

کنیز خوفزدہ تھی، معاملہ خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ شہزادی نے انطونیو کو اشارہ کیا اور اس نے دبے پاؤں راہداری کا موڑ کاٹ کر مخنث خواجہ سرا کو اچانک دبوچ لیا جو انطونیو کو دیکھ کر بدحواس ہو گیا اور جب شہزادی سامنے آئی تو اس کی جان ہی بچ گئی۔ کنیز نے اپنی بند مٹھی کھول کر ایک ڈبیہ دکھائی اور کانپتی ہوئی آواز میں بتایا۔ اس ڈبیہ میں بے ہوشی کی دوا ہے۔ داروغہ نے کہا تھا میں یہ دوا شہزادی صاحبہ کے کھانے میں بلا دوں اور یہ ملکہ بلا کوئی کا حکم ہے۔‘

اس انکشاف پر شہزادی نقش حیرت بن گئی۔ مخنث خواجہ سرا نے زبان بند کر لی اور کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ اچانک شہزادی ایک طرف مڑی اور فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

’ انطونیو ان دونوں کو لے کر میرے پیچھے پیچھے آؤ۔‘

وہ قصر کے اُس نیم تاریک حصہ کی طرف چل دی جدھر کنیزوں کے مجرے تھے لیکن اُن مجروں سے اُدھر ایک اور کمرہ تھا جس کے استعمال سے شاید داروغہ بھی واقف نہ تھا۔ شہزادی نے کمرے میں داخل ہو کر ایک خفیہ دروازہ کھولا۔ اس دروازے کی سیر پھیاں ایک ترخانے میں اترتی تھیں۔ شہزادی کے حکم پر کنیز نے کمرے سے ایک شمع اٹھائی اور سب

ترخانے میں اتر گئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ محنت داروغہ ترخانے کو دیکھ کر کانپ اٹھا۔ اس عقوبت خانہ میں ایذا رسانی کا ہر سامان موجود تھا۔ شہزادی گرج کر بولی۔

”تمہیں یہ دوا کس نے دی تھی، ملکہ بلا کونی یا کسی اور نے؟“

خواجہ سمرانے شاید فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی زبان نہیں کھولے گا۔ شہزادی کے حکم پر انٹونیو نے دیوار سے چمڑے کا کوڑا اتار لیا اور داروغہ پر ٹوٹ پڑا۔ تینچیں بند ہوئیں اور ترخانے کی فضا میں گونج کر رہ گئیں مگر محنت خواجہ سمرانے زیادہ دیر تک سزا برداشت نہ کر سکا۔ کوڑے نے اس کا جسم اُدھیر کر رکھ دیا تھا۔ آخر شہزادی کے قدموں پر سر رکھ کر اس نے ٹارن محل میں ملکہ بلا کونی اور جنرل ڈونو کی خفیہ ملاقاتوں اور شہزادی کو اغوا کر کے کسی جزیرے میں قید کرنے کی سازش کا انکشاف کر دیا یہ بھی بتایا کہ پرنس کالوجینس نے ملکہ ہی کے پیغام پر انہیں اغوا کرنے کی کوشش کی اور بے ہوشی کی دوا بھی اسی نے فراہم کی تھی کیونکہ ملکہ نے بیٹی کو اپنی قید میں رکھنے اور جنرل ڈونو کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ ایک لرزہ خیز انکشاف تھا۔ شہزادی ونگ رہ گئی۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ کہ تخت و تاج کی خاطر ماں بیٹی کی دشمن بن جائے گی۔ کنیز بے گناہ تھی۔ محنت خواجہ سمرانے کی بھی جان بچتی کر دی، اپنی شاہی مہر کی انگوٹھی انٹونیو کے سپرد کی اور ایک عجیب و غریب حکم دیا۔

”ان دونوں کو قلعے کے خفیہ دروازے سے لیکر نکل جاؤ اور ترک سپہ سالار عبدالرحمن کے حوالے کر دو۔ کہنا قلعے میں ان کی زندگی خطرے میں ہے۔“

”مگر ترک ہمارے دشمن ہیں!“

”دوست — ملکہ بلا کونی اور جنرل ڈونو بھی نہیں!“

شہزادی نے بتایا: ”مجھے کالوجینس کے لیٹرے سے ترک سپہ سالار نے بچایا تھا۔ اب اسی پر اعتماد کر رہی ہوں اور نہیں چاہتی کہ از میدان کے کسی شخص کو اس واقعہ کا پتہ چلے۔ ملکہ اور جنرل ڈونو کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ داروغہ اور کنیز پر کیا گزری۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ خوف کے مارے دونوں کہیں بھاگ گئے اور روپوش ہو گئے ہیں۔ بس اب جاؤ عبدالرحمن

کو میری مہر دکھاؤ گے تو سمجھ جائے گا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔“
 پھر اسی رات انطونیو داروغہ اور کنیز کو لے کر قلعہ کے خفیہ دروازے سے نکل
 گیا اور شہزادی نے وہ رات جاگ کر گزار دی۔ خیال تھا شاید جنرل فونو کے آدمی اُسے
 ’حالتِ بے ہوشی‘ میں اٹھانے آجائیں لیکن رات کسی واقعہ کے بغیر گزر گئی۔ انہیں محنت
 خواجہ بہرا کی طرف سے کسی آخری اطلاع کا انتظار تھا جو فراہم نہ ہو سکی۔



دوسرے دن کے سورج نے ترکوں کو پھر میدانِ جنگ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ لیکن
 فوج کی تعداد کم تھی اور کمان بھی عبدالرحمن کی بجائے فیجی خواجہ کر رہا تھا۔ ڈھولوں اور نفیروں
 کے آہنگ میں ترک روال دوان تھے۔ اُن کے عقب میں دُور تک کوئی اور فوجی نقل و حرکت
 نہ تھی۔ رومی سپہ سالار سوچنے لگا۔ اس قبیل سی سپاہ کا باہر نکل کر مقابلہ کرے یا اُسے فصیل
 کے قریب آنے دے۔ اچانک اس نے قلعہ کا دروازہ کھولنا اور فوج کو میدانِ جنگ میں
 نکلنے کا حکم دیا۔ شاید ترکوں کے چند دستوں کو دیکھ کر کل کی ناکامی کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔
 رومی سپاہ کو قلعہ سے نکلتے دیکھ کر فیجی خواجہ نے پیش قدمی روک دی۔ رومی
 ٹڈی دل کی صورت میں نکلے اور انا فانا فریقین کے تینوں حلقے ایک دوسرے کے سامنے
 صف بستہ ہو گئے۔ جنرل ڈونو جنگ کا نقشہ سوچ کر آیا تھا۔ اتنے ہی تینوں محاذوں پر حملہ
 کر دیا۔ حملہ اچانک اور خلافِ توقع ہوا تھا۔ ترک مہینہ اور قلب معمولی مدافعت کے بعد
 پیچھے ہٹتے نظر آئے۔ یہ دیکھ کر رومی سپہ سالار مسرت سے اچھل پڑا اور مزید دباؤ ڈالنے کا
 حکم دیا۔ رومی تلواریں مارتے ہوئے آگے بڑھے اور ترک دونوں محاذوں سے سپاہی اختیار
 کرتے پیچھے ہٹتے چلے گئے صرف ان کا میسرہ میدان میں ڈٹا رہا۔ رومی مہینہ اور قلب کے دستوں
 کو دھکیلتے ہوئے بہت دُور لے گئے تھے۔ اچانک ہرتی کو جانے والی شاہراہ پر ترک سوار اور

پیادے بھوتوں کی طرح نمودار ہوئے جن کی کمان خود عبدالرحمن کو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رومی عقب سے نرغہ میں آگئے۔ اُدھر سپاہ ہونے والے ترک دستوں نے بھی یک لخت قدم جمائے اور دشمن پر عھپٹ پڑے۔

سپہ سالار جو ترکوں کی 'سپانی' کو ان کی کمزوری پر محمول کر کے اندھا دھند آگے بڑھ گیا حیران تھا کہ ترک سوار اور پیادے عقب میں کہاں سے نکل آتے؛ وہ جوشِ انتقام میں ترکوں کی چال پر لگ گیا تھا جو آسے دھوکہ دے کر اتنی دور تک لے گئے تھے کہ عبدالرحمن کے سواروں اور پیادوں کو جو منہ اندھیرے ہی ہرتی کی شاہراہ پر درختوں کے جھنڈ میں جا چھپے تھے رومی لشکر کو عقب سے گھیر لینے کا موقع مل گیا۔ سپہ سالار کو اپنی حماقت کا احساس اسی وقت ہوا جب ترکوں نے رومیوں کو دونوں اطراف سے تلواروں اور نیزوں کی بارہ پر رکھ لیا اور بے دریغ قتل کرنے لگے۔ آن کی آن میں سیلنگڑوں سوار اور پیادے خاک و خون میں لوٹ گئے رومی فرار کی راہ تلاش کرنے لگے لیکن راستہ نہیں مل رہا تھا کیونکہ عبدالرحمن نے عقب سے اس طرح گھیرا ڈالا تھا کہ ترک سوار اور پیادے اپنے میسرہ سے جا ملے اور رومیوں کی راہ فرار مسدود کر دی تھی۔ رومی گھیرے ہوئے شکار کی طرح بدحواس ہو کر تلواروں کا تقرب بنتے رہے۔ یہ جنگا مثر جہل و قتل دیر تک جاری نہ رہ سکا آخر رومی سپہ سالار نے واپسی کا راستہ نکال ہی لیا اور کچی کچی سپاہ کو لے کر بھاگ نکلا مگر عبدالرحمن نے پیچھا کیا اور زخم لگائے بغیر نہ جانے دیا۔ اس نے بھاگتے ہوئے جنرل کی ران پر تلوار چلائی تھی۔ ترکوں نے قلعہ کی فصیل تک رومیوں کا تعاقب کیا اور ان کے وہ گھوڑے جو سواروں سے محروم ہو گئے تھے گھیر کر لے گئے۔

رومی سپہ سالار پانچ ہزار سپاہیوں کا نذرانہ دے کر اور اپنی ران پر ایک لمبا اور گراگھاؤ کھا کر لوٹا تھا۔ اس پر عبدالرحمن کی ایسی ہیبت طاری ہوئی تھی کہ قلعہ میں پہنچ کر بھی حواس درست نہ ہوئے۔ دو سپاہیوں نے لہو بہان جنرل کو پکڑ کر گٹھ سے اتارا۔ شہزادی اور بلا کوئی نے آج بھی قلعہ کی برجی سے اس ہولناک جنگ کا نظارہ کیا اور ترکوں کی جنگی چال اور حیرت انگیز فوجی صلاحیت پر دنگ رہ گئیں۔ رومیوں کی

شکست نے انہیں مایوس کر دیا تھا۔ جب وہ برجی سے اتر کر نیچے آئیں تو شہزادی نے اچانک سوال کیا: ”کیا قیصر کی بھیجی ہوئی فوج از میدان کی حفاظت کر سکے گی ماں!“

”اتنا اچھے نظر نہیں آتے بیٹی! سجانے کیا ہونے والا ہے؟“

ملکہ بلا کوئی کبھی کبھی نظر صبراً کر آسے دیکھ لیتی لیکن شہزادی کا سلوک حسبِ معمول تھا۔ جیسے جانتی ہی نہ ہو کہ ماں اُس کے خلاف کیا سازشیں کر رہی ہے مگر ملکہ کے دل میں صبح سے دھڑکا لگا تھا کیونکہ دو تین بار محنتِ خواجہ سرا کے بابے میں پتہ کرا چکی تھی اور ہر بار یہی جواب ملا تھا کہ وہ رات سے غائب ہے۔ حیران تھی، وہ اچانک کہاں چلا گیا آخر چلتے چلتے پوچھ ہی لیا۔ ”محلّات کا داروغہ صبح سے کہیں نظر نہیں آیا ایک کام کہا تھا میں نے اُس سے۔“

”پھر آپ ہی کے کام کیا ہو گا ماں! میں نے بھی آج اُسے نہیں دیکھا بلکہ میری کنیز فلپانا بھی رات ہی سے غائب ہے۔“

”فلپانا غائب ہے ملکہ تشویش انگیز ہے میں بولی دونوں کہیں بھاگ تو نہیں گئے!“

پھر خود ہی بڑبڑاتی رہی۔ ”ضرور اُس خواجہ سرانے کنیز کو کوئی اُلٹی پٹی پڑھائی ہوگی اور اُسے بھی اپنے ساتھ لے گیا ہوگا۔ بزدل... ڈرپوک... میں اُسے معاف نہیں کروں گی۔“ بلا کوئی سمجھ رہی تھی شاہی محلّات کا محنتِ داروغہ شریکِ جرم ہونے کے خوف سے کہیں بھاگ گیا یا روپوش ہو گیا ہے۔ وہ اپنی دوسری ناکامی پر دل ہی دل میں بیچ و تاب کھاتی رہی، مگر شہزادی کسی اور ہی خیال میں گم تھی۔ آج اس نے عبدالرحمن کی جنگی صلاحیت اور شجاعت کا جو نظارہ کیا اور رومی سپہ سالار کو جس طرح میدان سے بھاگتے اور زخم کھاتے دیکھا وہ اس امر کا ثبوت تھا کہ قیصر کی فوج نیکو میڈیا کی حفاظت کرنے سے عاری ہو چکی ہے اس کے ساتھ خود شہزادی نے بھی تاریخ کا ایک ورق اُلٹ دیا اور جب ملکہ بلا کوئی اپنے قصر کی طرف لوٹ گئی تو پلٹ کر انطونیو سے مخاطب ہوئی جو حسبِ معمول حفاظت کا فرض ادا کر رہا تھا۔

”انطونیو۔۔۔۔۔!“ شہزادی کا لہجہ سرگوشیا نہ تھا۔۔۔۔۔ آج رات پھر

تمہیں ترک لشکر گاہ میں جانا اور عبدالرحمن سے ملنا ہوگا۔“

وفادار الطویونے سرخم کر دیا۔ وہ خود بھی ترک سپہ سالار کے حسن سلوک سے بے حد متاثر تھا۔ رات جب وہ داروغہ محلات اور کنیز کو لے کر پہنچا تو عبدالرحمن نے دشمن ہونے کے باوجود دوستانہ برتاؤ کیا تھا۔ شہزادی کی آواز کچھ اور مدہم ہو گئی تھی۔ ترک سپہ سالار سے کہنا آدھی رات کو میں قلعہ کے خفیہ دروازے پر اس کا انتظار کروں گی۔ وہ اپنے سرداروں اور جانبازوں کے ساتھ خاموشی کے ساتھ آئے قلعہ کی چابیاں اس کے حوالے کر دی جائیں گی۔“

الطویون نے سراٹھا کر حیرت پاش نظروں سے مالک کی طرف دیکھا۔ ان نظروں میں کئی سوال تڑپ رہے تھے۔ شہزادی نے کہا: حیران کیوں ہوتے ہو۔ میں ازمد کی قبروں میں اضافہ نہیں چاہتی۔“

اور جب رات طویل رہی تھی۔ شہزادی نے قلعہ کے خفیہ دروازے پر اپنے دو معتمد فوجی افسروں کے ساتھ ترک سپہ سالار کا استقبال کیا۔ شہزادی نے اپنی آواز میں دل کی دھڑکنیں بھی شامل کر دیں۔ عبدالرحمن! اس شرط پر خود کو تمہارے حوالے کر رہی ہوں کہ ازمد کے لوگوں کو امان دی جائے۔ رومی سپہ سالار اپنی فوج لے کر قلعہ سے نکل جائے گا۔ وہ قسطنطنیہ کا رخ کرے یا کسی اور ولایت میں چلا جائے تم اس کا راستہ نہیں روکو گے۔“

عبدالرحمن نے شرط منظور کر لی مگر شہزادی نے ’قلعہ‘ کی بجائے ’خود‘ کو اس کے حوالے کر دینے کی جو لطیف بات کہہ دی تھی عبدالرحمن کا فوجی دماغ اس کی لگائے اور مذاکت کو نہ سمجھ سکا۔ اس نے قلعہ کی چابیاں سنبھالیں اور اپنے سرداروں اور بہادروں کے ساتھ شہزادی کے پیچھے پیچھے خفیہ دروازے میں داخل ہو گیا۔ ترک سپہ سالار صرف ایک ہزار بہادروں کے ساتھ آیا تھا۔ قلعہ کی حفاظت کا انتظام شہزادی کے معتمد فوجی افسروں کے ہاتھ میں تھا اس لیے کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ رات کے اندھیرے میں قلعہ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ فوجی خواجہ اور کراخی بک جو ترک لشکر کے ساتھ دور

کھڑے تھے۔ روشنی کا اشارہ ملتے ہی آگے بڑھے اور قلعہ میں داخل ہونے لگے۔ صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے جب بیشتر رومی سپاہی ابھی بارکوں میں محو خواب تھے ازمید کے قلعے پر فوج کا قبضہ مکمل ہو گیا قیصر کے زخمی سپہ سالار اور جنرل ڈونو کے کمروں پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔

ملکہ بلاکونی بیدار ہو چکی اور ایک کنیز سے یہ حیرت ناک خبر سن رہی تھی۔ ”ترکوں نے راتوں رات قلعہ پر قبضہ کر لیا“ کہ عین اسی وقت شہزادی عبدالرحمن اور مائیکل اوغلی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ ”یہ درست ہے ماں! میں نے امن و امان کی شرط پر قلعہ ترکوں کے حوالے کر دیا۔ اس وقت سپہ سالار عبدالرحمن میرے ساتھ ہیں“

ملکہ نے وحشت زدہ نگاہوں سے ترک جنرل کو دیکھا اور بیٹی سے مخاطب ہوئی: ”تو نے ہمیں ذلیل و رسوا کر دیا۔ گستاخ لڑکی!“

”اور ماں۔۔۔“ اٹھاپہ محلات کا داروغہ اور میری کنیز فلپانا رات ہی سے عبدالرحمن کی قید میں ہیں اور بے ہوشی کی وہ دوا بھی ترک سپہ سالار کے قبضہ میں ہے جیسے آپ نے میرے کھانے میں بلانے کی ہدایت کی تھی“

یہ الفاظ سنتے ہی بلاکونی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور غش کھا کر مہری پر گری۔



رومی سپہ سالار نے اگرچہ ترکوں کے قبضہ کی وحشت اثر خبر گہرے رنج کے ساتھ سنی اور شہزادی کے فیصلے پر ریل کھا کر رہ گیا لیکن یہ اطلاع یقیناً اطمینان بخش تھی لہذا اسے اپنے لشکر کے ساتھ قسطنطنیہ کی طرف لوٹ جانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ میدان جنگ میں ہلاک ہونے کی بجائے بچ کر نکل جانے کو بہتر جانا تھا چنانچہ اسی روز رومی فوج کا انخلاء شروع ہو گیا اور وہ سامانِ رسد کے ساتھ اپنے زخمی سپہ سالار کو بھی ایک تختِ رواں پر بٹا کر لے گئی کیونکہ جنرل چپنے پھرنے بلکہ گھوڑے پر سوار ہونے کے قابل بھی نہیں تھا۔

مذکورہ نے ازمد کے شہریوں کو امان دی اور اعلان کر دیا کہ لوگ اپنے روزمرہ کے کام کسی خوف و خطر کے بغیر انجام دیں۔ بہر شخص آنا اور ہر گھر کی عزت محفوظ ہے۔

لوگ گھروں سے نکل کر اپنے کام کاج میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے سن لیا اور دیکھ لیا تھا کہ قیصری فوج قلعے کا دفاع نہیں کر سکتی، شہزادی کو کشت و خون پسند نہ تھا۔ اُس نے ہتھیار ڈالے بغیر ترکوں سے دوستی کر لی اور لوگوں کو امان دینے کی شرط منظور کرانی تھی کسی شخص نے اس فیصلے پر اعتراض نہیں کیا۔ اناطولیہ کے آسمان پر قیصری بیڑوں کا عظیم کاسارہ اقبال غروب ہو رہا تھا۔

شہزادی اس بات پر خوش تھی کہ عبدالرحمن نے اُس کی توقع سے بڑھ کر موت اور دوستی کا ثبوت دیا۔ دوسرے روز اس نے ترک سپہ سالار کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت کا انتظام کیا۔ اس دعوت میں جو رات کے پہلے پہر تک جاری رہی ترک سرداروں کے علاوہ ازمد کے فوجی افسروں، امراء و رؤسا اور معزز شہریوں نے بھی شرکت کی۔ شہزادی جس نے آج آرائش جمال میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، نگاہوں میں سے اٹھ کر باہر آگئی۔ اُس نے پائیں باغ میں کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ستارہ نامید طلوع ہو چکا اور خنک رات میں ربودگی کی وہ کیفیت جواں ہو رہی تھی جو محبت کرنے والے دلوں کو تسکین دیتی ہے۔ اُس نے ایک کنیز کو طلب کیا اُس کے ذریعے عبدالرحمن کو پیغام بھیجا کہ پائیں باغ سے محققہ کمرہ راحت میں کوئی اُس کا انتظار کر رہا ہے اور خود دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتی اُسی کمرے کی طرف چل دی جہاں ترک سپہ سالار سے ملاقاتِ تنہائی کا اہتمام کیا گیا تھا۔

دعوت ختم ہو چکی اور حاضرین ازمد کے مغنیوں سے نیکو میڈیا کا ایک لوگ گیت سن رہے تھے جس نے ایوان میں کیفیت آد سماں پیدا کر دیا تھا کہ عبدالرحمن کو شہزادی کا پیغام ملاقاتِ بلا وہ اسے ایک روایتی پیغام سمجھا۔ یہ رواج نجانے کب سے چلا آ رہا تھا کہ مفتوح ملکوں اور ریاستوں کی شہزادیاں اور حکمرانوں کی بیویاں فاتحین کا سامانِ نشاط سمجھی جاتی تھیں۔ بعض اوقات انہیں زبردستی شریکِ عیش کیا جاتا۔ بعض اوقات فاتحوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وہ خود ہی اُن کی دعوت کا اہتمام کرتی اور تنہائی کی ملاقات

کا موقع دیتی تھیں۔ عبدالرحمن اس عجیب صورتِ حال سے پریشان ہو گیا۔ شہزادی کا دل بھی توڑنا نہیں چاہتا تھا اور تنہائی کی ملاقات سے بھی گریزاں تھا۔ اس نے جواب بھجوا یا۔

”شہزادی سے کہو ابھی انتظار کرے۔“

پھر یک نخت محفل سے اٹھا اور اپنے سرداروں کو لے کر نکل گیا۔ کسی کو محفل چھوڑ دینے کا سبب بھی نہیں بتایا۔ شہزادی کو خبر ملی تو دل مسوس کر رہ گئی۔ یہ بات اس کی توقع کے خلاف ہوئی تھی پھر سوچنے لگی انتظار کرنے کا پیغام بھجوا یا ہے تو پھر کے آئے گا مگر یہ انتظار طویل ہونے لگا اور اس کی بے چینی بڑھتی گئی وہ تو اسی روز عبدالرحمن پر دل نچاؤ کر چکی تھی جب اس نے سمندر کے لٹیرے کو قتل کر کے غیر معمولی بہادری کا مظاہرہ کیا اور اسے بچایا تھا۔ اس بہادری کا ہی کے لیے ایک عجیب سی کسک محسوس کرنے لگی لیکن میدانِ جنگ میں اس کی سپہ سالاری کا راز کھلا تو دل کی دھڑکنیں تیز اور بقیرایاں بڑھ گئیں۔ دراصل قلعہ کا قبضہ بھی محبت کا نذرانہ تھا مگر عبدالرحمن نے محبت کی اس قربانی کو دیویوں کی کمزوری پر محمول کیا۔ شہزادی نے کچھ اور سلوک کیا عبدالرحمن کچھ اور سمجھا۔ اب اس کی دعوتِ ملاقات کو بھی ”پیغامِ نشاط“ سمجھ کر چلا گیا تھا کیونکہ ترکوں کی شرافت کسی عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا نہ جانتی تھی۔

گرفتارِ محبت شہزادی انتظار کرتی رہی اور اس کی آمد کی گھڑیاں گنتی رہی۔ رات بھینکتی رہی۔ آسمانوں کے صحرا میں ستاروں کے کارواں گزرتے رہے مگر وہ نہیں آیا جتنی کہ سحری کا دھند لکا آگیا اور وہ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ کمرہٴ خواب میں چلی گئی۔ عبدالرحمن کے سلوک نے اس کے دل کا چین اور آنکھوں سے نیند کوٹ لی تھی۔ بستر پر کودتیں بدلتی اور سوچتی رہی کہ کیا کر بیٹھی ہے۔ ایک خیر کو اپنا کیوں سمجھ لیا تھا۔ ابھی سوچ کی کرنوں نے ورپکے سے جھانکا ہی تھا کہ کنیز نے مائیکل اوغلی کے آنے کی اطلاع دی وہ ترک سپہ سالار کا پیغام لے کر آیا تھا۔ شہزادی نے چند لمحوں کے بعد حاضری کی اجازت دی۔ مائیکل اوغلی نے عبدالرحمن کا سلام پہنچایا اور بتایا۔

”وہ رات کے واقعہ پر معافی چاہتے اور آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ مجھے بھیجا ہے“

کہ ساتھ ہی لیتا آؤں۔“

یہ سن کر شہزادی کی ساری کسلندی جاتی رہی۔ تمام دوسرے اور اندیشے جو رات بھر دل کو ڈتے رہے تھے، دور ہو گئے۔ خیال آیا اس نے ساری رات توڑ پالی ہے مگر میں نہ سکتا کاموقع نہیں دوں گی پھر کنیز کو ساتھ لیا اور مائیکل اونیلی کے ساتھ چل دی۔

عبدالرحمن کمرے میں تہنپا تھا۔ شہزادی دراصل ہوئی تو اٹھ کر احترام کیا اور اپنے قریب بیٹھنے کو جگہ دی سول سے شہزادی کی عزت کرتا اور چاہتا تھا اُسے عورت کے بلند مقام سے گرنے نہ دے۔ مگر جس پیغام ملاقات کو عورت کی توہین سمجھا اس کا مضمون تو ”محبت کی تقدیریں“ کا جھوٹا تھا جو اُس کے دل کے درتھے پر دستک نہ دے سکا۔ بولا: مجھے انسو سے ہے۔ رات آپ نے بلایا اور میں چلا آیا۔ دراصل میری کچھ ذمہ داریاں ہیں۔“

”رات کی بات کیوں کرتے ہو عبدالرحمن! رات بیت چکی ہے اب تو یہ معلوم کرنے آئی ہوں کہ صبح کا سوچ میرے لیے کیا پیغام لے کر آیا ہے۔“

”میں نے آپ کو بروصہ بھیجنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”شہزادی فنگ رہ گئی۔ بروصہ کیوں؟“

”وہاں آپ سلطانِ معظم کی بیٹی بن کر رہیں گی۔ آپ کا وقار اور مرتبہ بلند ہوگا۔ مجھے اپنے پاس کیوں نہیں رکھ لیتے؟“ شہزادی نے پھر وہی زبان میں محبت کا مضمون چھیڑ دیا۔ عبدالرحمن نے بھانے کیا سوچ رہا تھا۔ اُسے خاموش دیکھ کر کہنے لگی۔

”میں تمہارے قریب رہ کر زیادہ سکون محسوس کرتی ہوں۔“

”یہاں آپ کی زندگی خطرے میں ہے۔“

”تم میری حفاظت کر سکتے ہو۔“

”مگر آپ کی بہتر حفاظت بروصہ ہی میں ہو سکتی ہے۔“

شہزادی ایک لخت کھڑی ہو گئی اور غصے میں بولی۔ ”بہت اچھا، مجھے بروصہ بھجوانے کا انتظام کر دو۔ اب میں اپنا مقدمہ سلطانِ معظم ہی کے حضور پیش کر دوں گی۔ مگر“

مائیکل اوغلی کو میرے ساتھ جانا ہوگا۔
یہ کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ عبدالرحمن اس کی ناراضی کا سبب
بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔



مائیکل اوغلی کے حفاظتی دستہ کی نگرانی میں شہزادی کو بروصہ کی طرف روانہ کر دیا
گیا۔ اس نے روانگی کے وقت عبدالرحمن سے بات تک نہیں کی، سپہ سالار نے الوداع کہا
تو منہ پھیر لیا۔

راتے میں مائیکل اوغلی نے شہزادی کو ترک سلطان اور خاں سے ملاقات کے
آداب اور ترکی زبان کے کچھ فقرے سکھا دیے۔ وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ یہ باتیں سنتی
اور یاد کرتی رہی۔ مائیکل اوغلی نے بتایا سلطان معظم سے ملاقات کے وقت ان کی خیریت
ان الفاظ میں پوچھنی چاہیے۔

”مزاج سلطان فات عالی کر آئی سی انشاء اللہ“

(خدا کرے سلطان کی فات عالی کے مزاج اچھے ہوں)

جواب میں وہ اُسمد لید آئی ”خدا کا شکر ہے میں اچھا ہوں) کہیں گے۔

اگر وہ ترکی زبان بولتے پر حیران ہوں تو جواب میں یہ کہنا چاہیے۔

”فات عالی! تحصیل یم لسان اہل ترکان اولدم“ (فات عالی! میں لے ترکوں

کی کچھ زبان سیکھ لی ہے) اور ملاقات کے آخر میں سلطان کو ان الفاظ میں دعا دینی چاہیے۔

”عمر و اقبال ہمایوں سلطان اولسون مزید“ (سلطان کی عمر اور اقبال ہمایوں

میں مزید ترقی ہو)

شہزادی کیلئے بروصہ کا سفر بھی نیا تھا اور سلطان سے ملاقات بھی بڑی خیال انگیز

تھی وہ مائیکل اوغلی سے ترکوں کی تہذیب و معاشرت کے بارے میں مفید معلومات حاصل کرتی اور ترک خواتین کے بارے میں بھی دریافت کرتی رہی۔ یہ سن کر حیران ہوئی کہ ترک بیگمات چاکے قراجے زیب تن کرتی ہیں اور پشماک اور چار شفا دیکھتی ہیں۔ چار شفا ایک چھوٹی مٹی باریک چادر تھی جسے کھپلی سمت فرجہ (بڑے کُرتے) سے اس طرح ٹانگ دیا جاتا کہ سر چھپ جاتا اور آدھی پیشانی بھی ڈھکی رہتی تھی۔ پشماک گاز کا ایک مہینہ و ما تھا جس سے چہرہ ڈھانپ لیا جاتا تھا مگر اس سے رنگ روپ، نقش و نگار صاف نظر آتے تھے۔ اس نے ترک عورتوں کا نام بھی پوچھے۔ خود سلطان کی بیگمات میں یوسف خاں کا نام بڑا خوب صورت اور مقام سب سے بلند تھا جو اصلاً ایک رومی عورت تھی مگر اور خاں کے نکاح میں آنے کے بعد ترک نام اور ترک لباس قبول کر کے ترکوں کی بلند اقبال ملکہ بن گئی تھی۔ شہزادی کو یہ سب باتیں کسی مشرقی افسانے کی طرح بڑی دلچسپ معلوم ہوئیں اور فیصلہ کر لیا کہ وہ بھی ترک لباس میں ترک نام کے ساتھ سلطان سے ملاقات کرے گی۔ مائیکل اوغلی سے کہا۔

”میرے لیے کوئی ترک نام تجویز کرو۔“

”آپ کا نام تو گل خانم ہونا چاہیے۔“

اس نام میں پھولوں کا رنگ تھا خوشبو اور صباحت تھی۔ شہزادی کو یہ نام اچھا لگا اور بروہہ پہنچنے سے پہلے نام کے ساتھ ترک لباس بھی پہن لیا۔

ازمید کی فتح کے ساتھ نیکو میڈیا کی حکمران شہزادی کی آمد بڑی مسرت انگیز تھی

بروہہ کے شاہی محلّات میں اس کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ خود اور خاں اور ملکہ یوسف خاں نے شہزادی کو خوش آمدید کہا اور اسے ترک لباس میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس نے دستور کے مطابق سلطان کو سلام کیا اور خیریت پوچھی۔

”مزاج سلطان فات عالی کز آئی سی انشاء اللہ۔“

”الحمد للہ آئی“ سلطان نے جواب دیا اور حیرت سے دیکھا رہ گیا۔

شہزادی نے ایک دل چسپ سوال کر کے اور خاں کو مزید حیران کر دیا۔

’سلطانِ عالی! کیا اس لباس میں میں آپ کی بیٹی نہیں لگتی؟‘

’کیوں نہیں! بیٹی ہر لباس میں بیٹی ہوتی ہے۔‘

اور بروصہ کے شاہی محلّات میں اسی وقت اعلان کر دیا گیا کہ سلطانِ معظم نے نیکو میڈیا کی شہزادی کو اپنی بیٹی بنا لیا ہے جس کا ترک نام ’گل خانم‘ ہے۔ تمام بیگمات، شہزادیوں اور ترک سرداروں کی خواتین نے اسے مبارک باد بھی۔ قیمتی نذرانے پیش کیے اس کے سامنے تحائف کے ڈھیر لگا دیے اور وہ اس پذیرائی پر محسوس کرنے لگی کہ نیکو میڈیا کی چھوٹی سی ریاست سے نکل کر وہ ایک بڑی ترک سلطنت کی شہزادی بن گئی ہے۔

استقبال کا ہنگامہ ختم ہوا تو باپ بیٹی کی الگ ملاقات ہوئی اور شہزادی حرفِ مطلب زبان پر لائی۔ ’سلطانِ عالی! میں آپ کے پہ سالار عبدالرحمن کی شکایت لے کر آئی ہوں۔‘

’کیا اس نے کوئی گستاخی کی؟‘

شہزادی اس سوال پر پریشان سی ہو گئی۔ آخر سوچ کر بولی ’گستاخی نہیں کی۔ میرا دل دکھایا ہے اس نے اور یہ گستاخی سے بڑا جرم ہے۔‘

پھر وہ تمام واقعات جو پیش آئے تھے سناتی رہی۔ سلطان بڑی توجہ سے سنتا

اور حیران ہوتا رہا۔ شہزادی نے کہا۔

’سلطانِ معظم! بے شک عبدالرحمن ایک بہادر جرنیل اور اس کی نبضوں کا خون

دوپہر کے سورج کی طرح گرم ہے مگر از میدان کا قلعہ اس کے زورِ بازو سے فتح ہونے والا

نہیں تھا۔ ہمارے سپاہی جب محاصرے کی جنگ لڑتے ہیں تو آتشِ یونانی ’حملہ آوروں

کے جسموں کو کھا جاتی ہے۔ میں نے ترکوں کو اس آگ سے بچایا اور عبدالرحمن کو خود بلا

کر قلعہ اس کے حوالے کر دیا۔ میں اس پر شرمندہ نہیں کیوں کہ ترکوں کی طرح میں نے اپنے

سپاہیوں اور از میدان کے شہریوں کی جانیں بھی بچائی ہیں۔ سلطانِ عالی! رومی اور ترک دختوں

کی طرح ایک ہی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور ان کے درمیان موت کو قص نہیں کرنا چاہیے۔‘

جو اقل سے اُن کے بیٹے اور بہنوں سے بھائی چھین لیتی ہے مگر عبدالرحمن نے میری اس قربانی کو غلط معنی پہنائے اور جب میں نے اپنے دل کی بات کہنے کے لیے اُسے تنہائی میں بلایا تو اُس نے مجھے روم و یونان کی اُن عورتوں میں شمار کر لیا جو فاتحوں کی تفریح کا کھلنا بنتی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ عظیم قیصر صرف ماضی کی عظمتوں کا سایہ بن کر رہ گئے ہیں اور موت نے وہ راستے کھول دیئے ہیں جس کے پیٹ میں وہ اپنا آخری بستر بچھائیں گے کیونکہ اب انا طولیہ کی مہائیں ترکوں کا نام لے کر چلتی ہیں مگر عبدالرحمن کو یہ اختیار کس نے دیا کہ وہ ایک عورت کی قربانی پر اپنی فتح کا محل تو تعمیر کرے لیکن اس بد نصیب پر اپنی محبت کے دروازے بند کر دے۔ —

اب کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ سلطان اُدخاں نے یہ حقیقت سمجھ لی کہ از میر کی فتح کے پیچھے دراصل ایک محبت بھرا دل تڑپ رہا ہے جس کی بے قرار دھڑکنوں کو سننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی، بے چین ہو کر بولا۔

”گل خانم — عبدالرحمن نے اگر تمہاری آنکھوں میں محبت کی شمعیں جلتی دیکھ کر بھی اُن کی روشنی سے انکار کر دیا تو قصور اُس کا نہیں ہمارا ہے کیونکہ ہر ترک سپاہی اور ہر عسکر ہمارے حکم کا پابند ہے کہ جنگ یا فتح دونوں کی طرح کسی عورت کے حسن اور جسم کی توہین نہ کی جائے۔“

”مگر سلطان عالی —! میرا مطلب.....“

”ہم تمہارا مطلب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ سلطان نے اس کی بات کاٹ دی۔ اور تمہارے شکر گزار ہیں کہ تم نے ہمیں ایک ایسے انسانی جذبے کی طرف توجہ دلائی ہے جسے ہم بھول گئے تھے۔ اب عبدالرحمن سے باز پرس تو نہیں کر سکتے لیکن اُسے بروصہ میں طلب کر کے یہ ضرور پوچھیں گے کہ وہ ہماری بیٹی کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے؟“

شہزادی نے شرمناک گردن خم کر دی۔ جو بات آج تک اپنی زبان پر نہ لاسکی وہ سلطان اُدخاں نے کہہ دی اور دریافت کیا۔ ”تمہیں تو اس پر کوئی اعتراض نہیں؟“

”سلطان عالی! میں خود یہی چاہتی ہوں کہ عبدالرحمن کو پلا کر پوچھ لیا جائے کہ

اس کی تلوار تو چلتی ہے دل بھی دھڑکتا ہے یا نہیں؟
 پھر اسی روز سلطان نے ایک تیز رفتار قاصد از مید کی طرف روانہ کیا اور عبدالرحمن
 کو پیغام بھیجا کہ وہ بلا تاخیر بروصہ میں حاضر ہو



عبدالرحمن طلبی کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا۔ قاصد سے بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا مگر
 اس نے بروصہ پہنچنے میں زیادہ دن نہیں لگائے آتے ہی مائیکل اوغلی سے بلا تا کر چانک اور
 فردی بلا دے کا سبب جان سکے مگر وہ بھی اصل بات سے بے خبر تھا۔ حاضری کا حکم
 شہزادی کی آمد کے ساتھ ہی جاری ہوا تھا۔ ۲۱، لیے خیال آیا شاید از مید کے قبضہ اور نیکو میڈیا
 میں مزید پیش قدمی کے بارے میں بعض ہدایات دینے کے لیے طلب کیا گیا ہے۔ اس قسم
 کے معاملے عموماً مجلسِ حرب میں زیرِ بحث آتے اور سلطان کی طرف سے اس کا بڑا بھائی
 علاؤ الدین پاشا یا پھر امیر لوقرہ خلیل ضروری ہدایات دیا کرتے تھے مگر عبدالرحمن کو پتہ چلا کہ
 اسے براہِ راست سلطان کی خدمت میں پیش ہونا ہے۔

ضباطِ رپولیس (کاناٹم اعلیٰ خیر الدین پاشا اسے اپنے ساتھ لے کر شاہی محل
 پہنچا اور قزلباغی کو لایا کرائی۔ شاہی محلات کے داروغہ کبیر کو حکم تھا کہ جونہی عبدالرحمن
 آئے اسے بابِ عالی میں پیش کیا جائے۔ وہ اسے لے کر سلطان کے کمرہ خاص کی طرف چل
 دیا۔ عبدالرحمن نے اس غیر معمولی صورتِ حال کو محسوس کیا۔ اگر اسے کسی فوجی مشورے کے
 لیے طلب کیا جاتا تو یہ معاملہ مجلسِ حرب کا تھا سلطانِ معظم کوئی خاص ہدایت دینا چاہتے
 تو بھی حاضری سلاطینِ باشی کے ذریعے ہوتی اور باش کا تب سلطان کو اس کی آمد سے مطلع
 کرتا لیکن یہاں تو پولیس کے کانٹم اعلیٰ نے کسی مجرم کی طرح اسے قزلباغی کے حوالے کر دیا
 اور کمرہ خاص تک لے آیا تھا۔ اسی بات پر حیران و پریشان تھا کہ نہ جانے بے خبری میں کونسا

جرم کر بیٹھا کہ اس کی پیشی آغاسی کے ذریعے ہو رہی ہے۔ خبر سنتے ہی فوراً حاضری کی اجازت مل گئی اور وہ دل میں کئی وسوسے لیے کمرہ خاص میں داخل ہوا۔

سلطان تہا تھا۔ جب عبدالرحمن مخصوص سلام کر چکا تو سلطان نے قزلہ آغاسی کو رخصت کر دیا اور اسے اپنے قریب بلا کر مخاطب ہوا۔

عبدالرحمن! — ہم سمجھتے تھے از میدان قلعہ تم نے اپنے زور بازو سے فتح کیا ہے مگر ہمیں معلوم ہوا ہے کہ قلعہ کتخ نہیں ہوا رات کے اندھیرے میں تمہیں بطور تحفہ پیش کیا گیا تھا۔ ہم اس کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔

یہ درست ہے سلطان معظم کہ قلعہ مجھے پیش کیا گیا لیکن رومی ہمارے حملوں سے خوفزدہ تھے۔ ہم نے دو مرتبہ انہیں میدان جنگ میں شکست دی تھی۔

اگر جنگ مطلوب ہوتی تو رومی قلعہ بند ہو کر بٹھکتے تھے۔

اس صورت میں بھی ہماری کامیابی یقینی تھی کیونکہ قلعہ کے اندر ملکہ بلا تونیہ اور اس کی بیٹی کے درمیان اقتدار کی کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ میں نے شہزادی کا اعتماد حاصل کر لیا جو اصل حکمران تھی اور قلعہ پر قبضہ کے بعد بھی اس کے اختیارات میں مداخلت نہیں کی۔

پھر اسے بروصہ کیوں بھیج دیا؟

عبدالرحمن یک لخت خاموش ہو گیا، یا تو اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب تھا نہیں یا جواب دینا مناسب نہ سمجھتا تھا، مگر اس کی خاموشی نے سلطان کو پریشان و بے چین کر دیا۔ اپنی بے چینی کو چھپانے کے لیے اس نے منہ دیوار کی طرف پھیر لیا اور کہا۔

عبدالرحمن! ہمیں تم سے کسی غلط بیانی کی توقع ہو سکتی ہے نہ اس امر کا اندیشہ ہے کہ کوئی بھی بات خواہ وہ اہم ہو یا معمولی ہم سے چھپاؤ گے۔ ہم حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں اور اسی لیے تمہیں بروصہ طلب کیا ہے۔

عبدالرحمن ایک لمحہ سوچا رہا پھر بولا۔ اگر سلطان عالی کو حقیقت سے کچھ پی ہے تو پہلے میرا استعفیٰ قبول کر لیا جائے۔

استعفیٰ کیوں؟

”شاید میرا جواب سنکر آپ کا قانون مجھے مجرم سمجھے اس لیے سرِ عسکر کے عہدہ سے مستعفی ہوتا ہوں۔“

”اس کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے پہلے تم حقیقت بیان کرو۔“
عبدالرحمن نے معاملے کی صورت پر خود کیا پھر کہنے لگا:

”حقیقت یہ ہے حضرت لوری! جب شہزادی نے مجھ پر اعتماد کر کے قلعہ میں بلا یا تو یہی خیال تھا شاید وہ میری مدد سے ملکہ بلا تو نیہ اور جنرل ڈونو کی سازش کو ناکام بنانا اور حکومت پر اپنا قبضہ مستحکم کرنا چاہتی ہے مگر جب میں آدھی رات کو قلعہ میں پہنچا تو وہاں نیکو میڈیا کی شہزادی کی جگہ میری ملاقات ایک ایسی عورت سے ہوئی جس نے اپنے سوا کچھ بھی اپنے پاس نہ رکھا تھا۔ اس نے کسی تردد کے بغیر قلعہ کی چابیاں میرے حوالے کر دیں اور وہ بات مجھ پر آشکارا ہو گئی جسے میں پہلے نہیں سمجھتا تھا۔ بیحد اندم! عودت کی محبت بہادر سے بہادر سپاہی کا دل نرم اور خون پانی کر دیتی ہے قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد محسوس ہوا کہ شہزادی نے قلعہ ہار کر مجھے جیت لیا ہے اور یہ وہ بات تھی جس نے میرا قرار لوٹ لیا۔ میرے دل میں محبت کی چنگاری سلگنے لگی۔ میں جتنا شہزادی سے دُور رہنے کی کوشش کرتا اتنی ہی یہ آگ اور بھڑکتی۔ پھر یہ سوچ کر کہ کہیں اس آگ میں میری تلوار کا لوہا پگھل نہ جائے۔۔۔ میں نے اسے بروصہ روانہ کر دیا“

”تو تم شہزادی سے اپنی محبت کا اقرار کرتے ہو؟“

”اگر آپ کے قانون میں محبت جرم ہے تو میں اقبالِ جرم کرتا ہوں۔۔۔“

سلطان نے پلٹ کر کہا: ”عبدالرحمن! ہم تمہیں جرمِ محبت کی سزا دیں گے۔“

پھر اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ایک پردہ ہٹایا۔۔۔ اور یہ ہے تمہاری حسین سزا۔۔۔“

عبدالرحمن نے نظر اٹھا کر دیکھا تو خود تصویرِ حیرت بن گیا۔ پردے کے پیچھے نیکو میڈیا کی حسین شہزادی ترک لباس میں قیامت کا روپ دھارے کھڑی تھی۔ عبدالرحمن کے ہونٹ تھر تھرائے۔ ”شہزادی۔۔۔!“

جواب سلطان نے دیا۔ ”یہ ہماری بیٹی گل خانم ہے۔ ہم نے تمہارا استغفار منظور کیا اور گل خانم تمہیں سونپ دی۔“

یہ کہہ کر سلطان دروازے سے باہر نکل گیا اور کمرے میں وہی دونوں رہ گئے۔ یوں کچھ دن گزرے رہے تھے لیکن ہونٹوں پر خاموشی تھی۔ آخر شہزادی نے اس خاموشی کو توڑا اور اس کی طرف قدم بڑھا کر بولی:

”عبدالرحمن! تمہارے اقرارِ محبت نے مجھے زندگی بخش دی ہے مگر تم از میدانِ خاموشی کیوں رہے؟“

”آپ بھی..... نہیں!“ وہ مسکرایا۔ ”تم بھی حقیقت سنا چاہتی ہو؟“ اس نے پہلی بار شہزادی کو ”تم“ کے لفظ سے مخاطب کیا تھا وہ اس اندازِ خطاب پر خود رفتہ سی ہو گئی۔ ”ہاں وہ حقیقت جو تم بیان کرو گے یقیناً خوب صورت ہوگی۔“ تو سنو! میدانِ محبت کا ہوا جنگ کا۔ ایک بہادر سپاہی میدان میں کبھی اپنی شکست قبول نہیں کرتا۔“

”اسی لیے تو میں نے تمہارے سامنے خود کو ہار دیا تھا۔“

”اور یہی ہار تمہاری ہیبت بن گئی۔“ پھر عبدالرحمن نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بانٹوں میں سمیٹ لیا اور چند لمحوں کے لیے زمانے کی گروٹھ ختم گئی۔

دوسرے روز قاضی جند رہ نے امرائے سلطنت کی موجودگی میں ان کا نکاح پڑھا سلطان ہی کو شہزادی کا باپ اور ولی تسلیم کیا گیا۔ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور شاہی محل میں ہی ایک بڑی ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔



لکھ بلا کوئی کو جو ابھی تک اپنے کمرے میں امیر تھی جب اس شادی کی خبر ملی تو

اس کے دل میں ایک نئی امید نے کروٹ لی۔ رومی جنرل ازمید نے نکل کر سمندر کے دارالحکومت
ہرتی میں ٹھہر گیا اور قیصر کے نئے حکم کا منتظر تھا۔ ملکہ بلاکونی نے خفیہ طور پر اسے پیغام بھجوایا
کہ عبدالرحمن نے شہزادی کو بروصہ بھیج دیا اور خود بھی اس کے پیچھے چلا گیا ہے۔ تم ازمید
کی طرف لوٹ آؤ اور قلعے کا محاصرہ کر لو۔ جنرل ڈونو کی سپاہ قلعہ میں بغاوت کر دے گی
اس طرح ہم ازمید پر دوبارہ قبضہ کر کے ترکوں کو نیکومیڈیا سے نکال دیں گے۔

اسیری کی حالت میں بھی بلاکونی کی خدمت پر رومی کنیزیں متعین تھیں۔ ترکوں
کے نزدیک ازمید کا معاملہ ختم ہو چکا تھا کیونکہ اہل شہر ان کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔
لیکن وہ اس سازش سے بے خبر تھے جو ملکہ بلاکونی کے ذہن میں پردوش پارہی تھی۔

اچانک ایک دن قلعہ کے سامنے قیصری پرچم نمودار ہوئے۔ رومی سپہ سالار
اپنی فوج کے ساتھ لوٹ آیا تھا اور اس کے ہمراہ سمندر کا حکمران کالوجنیس بھی لشکر سمیت
میدان میں نکل آیا تھا۔ ٹرک پریشان ہو گئے۔ اس پریشانی میں وہ ملکہ بلاکونی کو بالکل
نظر انداز کر گئے جو اسی رات نہ صرف اپنے کمرے سے نکل گئی بلکہ اس نے جنرل ڈونو کو
بھی قید سے چھڑا لیا اور جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو ازمیدی سپاہ نے قلعہ کے اندر
بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔

ازمید میں اعتماد کی فضا یک لحنت بے اعتمادی میں تبدیل ہو گئی۔ قلعہ کے اندر
جنرل ڈونو کی قیادت میں ازمیدی سپاہ اور قلعہ کے باہر قیصر کے لشکر نے ترکوں کو
عجیب و غریب صورت حال سے دوچار کر دیا۔ اب قلعہ ان کے لیے ایک ایسا پنجرہ
بن گیا تھا جہاں ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

ایسی خواجہ نے ٹرک سرداروں کے ساتھ مشورہ کیا اور فوری طور پر پنجرے
سے باہر نکل جانے کا فیصلہ کیا پھر وہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ قلعہ کے عقبی دروازہ سے نکل
گئے۔ کسی کو ان کا تعاقب کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ رومی لشکر قلعہ میں پھر داخل ہو گیا
اور جنرل ڈونو نے قیصر کے سپہ سالار کا استقبال کیا۔

قلعہ میں قبضہ کا جشن منایا گیا۔ اس جشن میں نیکومیڈیا کا تاج حکومت ملکہ

بلاکونی کے سر پر رکھ دیا گیا۔ تقدیر اس کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر لے گئی تھی اور اب جنرل ڈونو اس کا محافظ بھی تھا اور شریکِ حکومت بھی۔

ترکوں نے ازمید سے چند میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈال دیا اور بروصہ کی طرف قاصد دوڑایا۔ سلطان کا حکم پہنچا کہ شہر سے دور نیکو میڈیا کی سرحد پر آ جاؤ۔ عبدالرحمن اور گل خانم نے کئی بار گزارش کی کہ انہیں نیکو میڈیا کی طرف روانگی کی اجازت دی جائے مگر سلطان نئی ترک سلطنت کے آئینی اور تنظیمی امور میں اس قدر مصروف تھا کہ ان کی درخواست پر توجہ نہ دے سکا مگر وہ نیکو میڈیا کے معاملات سے غافل نہیں تھا۔

ایک دن باش کاتب نے رپورٹ پیش کی کہ — "قیصر انڈونیکس موسم نے ملکہ بلاکونی کی حکومت کو تسلیم کر لیا اور شہزادی کو حتی وراثت سے محروم کر دیا ہے۔ ازمید اور نیکو میڈیا کی حفاظت کے لیے قسطنطنیہ سے نئی فوج بھی روانہ کر دی ہے۔"

ترک سلطان یہ رپورٹ پڑھ کر بڑبڑایا — "قیصر اپنی زندگی کا ثبوت دے رہا ہے مگر قبروں میں اس کے اجداد کی ہڈیاں گل چکی ہیں اور اسے بھی اپنا بستر لاشوں پر بچھانا ہوگا۔"

پھر سلطان اچانک کھڑا ہو گیا اور حکم دیا — "نیکو میڈیا کے لیے ہمارا گھوڑا تیار کیا جائے۔"

دوسرے دن وہ عبدالرحمن اور گل خانم کے ہمراہ نیکو میڈیا کی طرف اڑا جا رہا تھا اور عقب میں وہ سوار اور پیادے تھے جو صرف اس کی کمان میں بڑتے تھے۔ ریاست کی سرحد پر انجمنی خواجہ نے ترک سرداروں کے ساتھ سلطان کا استقبال کیا۔ اس نے ایک روز سفر کی تھکان اتاری پھر آگے بڑھ کر ازمید کا محاصرہ ڈال دیا۔ ازمید میں غل مچ گیا کہ — "ترک آگے" حالانکہ وہ اس طرح گئے تھے جیسے لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

سلطان نے ترک سرداروں کو ادھر ادھر روانہ کر دیا کہ قلعہ اور شہر کا رشتہ

مواصلات کاٹ دیں۔ وہ اپنے دستوں کو لے کر اس طرح گھوم گئے جیسے موت کسی شہر کا طواف کرتی ہے۔ اب کسی طرف سے شہر کو مدد مل سکتی تھی نہ رسد صرف ہندو کارا تہ کھلاتا تھا۔ جب اہل قلعہ کو معلوم ہوا کہ سلطان اور خان نے بغیر نفیس جنگ کا جھنڈا کھڑا کیا ہے تو ان کی نبضوں میں خوف سرسرا نے لگا۔

کئی روز کے جاں سوز محاصرہ کے بعد جنرل ڈونو قلعہ کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ سلطان نے عبدالرحمن ہی کو مقابلے پر بھیجا اور شام کے غروب ہوتے ہوئے مورچ کے ساتھ جب رومی اور ازمیدی سپاہ شکست اٹھا کر قلعے کی طرف بھاگی تو جنرل ڈونو کا سر عبدالرحمن کے نیزے پر بلند ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ کئی ہزار سوار اور پیادہ موت کا لقمہ بن گئے تھے۔

جنرل ڈونو کی ہلاکت نے ملکہ بلاکونی کو لرزادیا، اب اسے اپنی موت بھی نظر آ رہی تھی کیونکہ نیکو میڈیا کی اصل حکمران عبدالرحمن کے ساتھ ازمید کی طرف لوٹ آئی تھی اس نے سلطان کی طرف صلح کا پیغام بھیجا اور درخواست کی: "اگر مجھے قسطنطنیہ جانے کی اجازت دے دی جائے تو میں قلعہ آپ کے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔"

سلطان نے شہزادی کو اختیار دیا: "تم چاہو تو اپنی ماں کی درخواست قبول کر سکتی ہو ورنہ اس مرتبہ ہم ازمید کو بزور تیغ فتح کریں گے۔"

ملکہ بلاکونی کا قاصد شہزادی کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا اور امان طلب کی۔ شہزادی نے جو اب بھی گل خانم کے رُوپ میں تھی، ماں کی درخواست قبول کر لی اور کہا: "سلطان معظم! رومی اور ترک ددختموں کی طرح ایک ہی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، میں ان ددختموں کی شاخیں کاٹنا نہیں چاہتی۔"

سلطان نے صلح منظور کر لی۔ دوسرے دن ملکہ بلاکونی بیٹی کو ملے بغیر بھری رتہ سے قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ قیصر کی فوج جس طرح قلعے میں داخل ہوئی اسی طرح باہر نکل گئی لیکن اس مرتبہ اسے ہتھیاروں سے محروم کر دیا گیا تھا۔

عبدالرحمن شہزادی کی معیت میں فاتحانہ انداز میں قلعہ کے اندر داخل ہوا اور

عقب میں وہی ترک سردار اپنے پرچم لیے چلے آ رہے تھے جو کچھ ہیں عہد قبل قلعہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اہل شہر نے شہزادی کا خیر مقدم کیا۔ پھر از میدان ایک اور جشن منایا گیا جس میں ترک سلطان نے گل خانم اور عبدالرحمن کو باقاعدہ نیکو میڈیا کی حکومت کا پروانہ دیا اور اس ریاست سے قیصر اینڈ رونیس کا حکم منسوخ کر دیا۔

غلاط کے کنارے جب قیصر نے اناطولیہ کی طرف نظر دلائی تو اس کے پیکر میں اپنے اجداد کی روح کوٹتی اور گرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

سلطان اور خان نے نیکو میڈیا سے نکل کر اپنے گھوڑے کی لگام سمندرہ کی طرف موڑ لی تھی۔ اب وہ کالوچی نرس سے اپنا پرانا حساب چکانے والا تھا اور ترک پرچم اناطولیہ کے رومی ساحلوں کی طرف حرکت کر رہے تھے۔



چاہِ بابل

دُنیا کی سب سے بڑی داستانِ عشق

تاریخ کے سینے سے کشید کی ہوئی ایک لافانی کہانی جسے مؤرخ، ادیب، شاعر اور صحافی
قمر اجنالوی نے ۲۵ سال کی ریسرچ کے بعد قلم بند کیا۔ زیرِ طبع ہے۔

مکتبہ القریٰ، سرکلر روڈ، لاہور

نیش عقرب



استفادہ

○ تاریخ ابن خلدون
طہ ابن خلدون

○ سلطان عربین کا جدِ حکومت
آگرت ہیں

○ تاریخ الکامل
ابن اثیر

○ مسند ابن ابی عمیر
بین پول



محافظ سرداروں نے گھوڑوں پر نمدے کس لیے تھے۔ اچانک برف باری شروع ہو گئی۔ ملکہ نے شہزادے کے گھوڑے کی نگام تمام لی اور اسے واپس محل میں لے آئی لیکن اسی شام برف کی برچھیوں سے زخمی ایک قافلہ شاہی محل کے دروازے پہ آ کے رکا۔ ملکہ کو جب خبر ہوئی وہ شہزادے کے ہمراہ اس خستہ حال قافلے کے خیر مقدم کے لیے بے تابانہ صددرواز تک آئی۔ شہزادی اپنی سواری سے باہر نکلی تو سب کو ایسا معلوم ہوا جیسے چاند زمین پر اتر آیا ہو۔ نوجوان شہزادے نے جب شعلہ رخ شہزادی کو دیکھا تو عقل و ہوش گم کر بیٹھا۔ اس سے شہزادی کا رسمی استقبال بھی نہ کیا گیا۔

یہ ہسپانیہ کے ایک سرسبز و شاداب پہاڑی علاقے کی داستان ہے۔ یہاں ہر طرف چشمے گنگناتے اور آبشار گونجتے رہتے تھے۔ ساری فصا میں موسیقی اور خوشبو رچی ہوئی تھی۔ پھولوں اور اونچے درختوں سے ڈھکی ہوئی یہ زمین حسین مناظر کے علاوہ اپنی دیافروز اور جاں سوز داستانوں کے لیے کوہِ قاف کی مثال تھی۔ شہزادے کو ایک اہم سفرویش پیش تھا مگر اس نے آسمان کی اس ادا کا شکر یہ ادا کیا کہ عین وقت پر برف برسائے اس کے

راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں اور اس طرح اُسے ایک جہاں تاب چہرے کے منظر سے سرفراز کیا۔

ریاست نادار کی ایک طرف ریاست کٹسال، دوسری جانب ریاست لیون واقع تھی۔ شہزادی کٹسال سے اور شہزادہ لیون سے اُسے تھے اور جہاں اُنہوں نے اتفاقاً ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اُس ریاست کا نام نادار تھا۔ لیون اور کٹسال کے درمیان واقع ریاست نادار میں ملکہ تھیوڈا کا حکم چلتا تھا۔ شہزادی کی آمد غیر متوقع نہیں تھی لیکن شہزادے کی موجودگی ملکہ کے لیے الجھن کا سبب بن گئی تھی۔ برف باری نہ ہوتی تو شہزادہ چلا جاتا۔ ادھر ملکہ کا خیال تھا کہ شہزادی کا قافلہ دیر سے نادار پہنچے گا اس وقت شہزادہ اپنی ریاست لیون کے لیے کوچ کر چکا ہوگا۔ مگر نہ وہ اس بُرے موسم میں شہزادے کو واپس بھیجنے کا فیصلہ کر سکتی تھی نہ شہزادی کا قافلہ روکنا اس کے بس میں تھا۔ شہزادی اور شہزادہ دونوں ایک ہی محل میں ٹھہرے اور ملکہ نے بطورِ خاص اس نزاکت کا خیال رکھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے کم سے کم مل سکیں مگر ملکہ تھیوڈا کی تمام احتیاطی تدبیریں ناکام ثابت ہوئیں۔ شہزادی سفر کی تھکن کے باوجود نادار کے مناظر دیکھنے کے لیے باہر نکل گئی، ملکہ اُسے نہ روک سکی۔ شہزادہ پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ ایک بار پھر دونوں کا آمناسا منام ہوا اور دونوں دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ شہزادے کا نام اور ڈون تھا۔ وجہیہ، دراز قد اور باوقار عموماً اُسے صرف ڈون کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔ شہزادی چھوٹی انفٹاکہلاتی تھی۔ وہ حسنِ جمال لطافت اور نزاکت کی کمال تصویر تھی۔ لوگ اُسے اُس کی مشہوریاں کی رعایت سے چھوٹی انفٹاکہلاتی کہتے تھے۔ برف باری ختم ہو گئی لیکن شہزادہ ڈون نے قافلے والوں کو کوچ کا حکم نہیں دیا۔ اُس نے غیر متوقع طور پر قیام طویل کر دیا۔ ملکہ تھیوڈا اپنے عزیز مہمان سے یہ درخواست نہیں کر سکتی تھی کہ اُسے اب جلد چلا جانا چاہیے۔ جس بات کا ملکہ کو خدشہ تھا وہی ہوا۔ شہزادہ ڈون اور چھوٹی انفٹاکہلاتی رفاقت رنگ لائی۔ پہلے وہ خدام اور کنیزوں کے سامنے ایک دوسرے سے رسمی طور پر ملتے تھے، اب چھپ چھپ کے ملنے لگے۔

اس وسیع و عریض محل میں دونوں معزز مہمانوں پہ گھومنے پھرنے کی کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی تھی۔ انہیں یک خانی کے بہت سے مواقع میسر تھے۔ محل کے باہر رگوں میں سنسنی پیدا کرنے والے ابشار تھے۔ دور تک پھیلی شکار گاہ تھی۔ دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کے بہت دور جنگل میں نکل جاتے اور دنیا و مافیہا کی فکر وں سے آزاد ہو جاتے۔ یوں یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی۔ ایک شہزادی نے ایک شہزادے کو اور ایک شہزادے نے ایک شہزادی کو منتخب کر لیا تھا مگر دونوں اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھے کہ ان کی راہ میں سنگین فصیلیں حائل ہیں۔ دونوں ریاستیں ایک دوسرے کی شدید دشمن تھیں۔ اچانک ریاست لیون سے شہزادے کی آمد میں تاخیر کا سبب جاننے کے لیے ایک قاصد آچکا تھا اور اس کی فوری طلبی کا پیغام بھی لایا تھا۔ شہزادے کے پاس اب ریاست نافر میں مزید قیام کا کوئی بہانہ نہیں تھا۔ ویسے بھی اسے آج نہیں توکل جانا ہی تھا۔



وداع ہونے سے ایک رات پہلے جب وادی کا ابشار زور و شور سے بہ رہا تھا اور پہاڑی ندی کی بے قرار لہریں ایک دوسری سے اکھیلیاں کر رہی تھیں۔ شاہی محل کے گرم ایوان میں شہزادہ ڈون آتش وان کے قریب شہزادی انفسا کے سامنے بیٹھا تھا۔ آتش وان کے دکنے انکاروں کی سرخی شہزادی کے رخساروں پر تلملارہی تھی۔ ڈون ہلکیں جھپکاٹے بغیر اسے محویت سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں گم تھے، انہیں معلوم تھا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ بہت دیر بعد ڈون کی خواب ناک آواز نے اس خاموشی کا طلسم توڑا۔ انفسا! کیا تم یہ رات اسی طرح خاموشی سے گزار دو گی۔ تو لمحے پہلے ہیں انہیں عنایت سمجھو، مجھ سے

بات کرو۔

”کیا بات کروں ڈون!“ شہزادی کی سرپلی آواز میں سوز تھا۔ ”معلوم نہیں تم سے کب ملاقات ہو۔ سوچتی ہوں اس دن اچانک برف باری کیوں ہو گئی اور تم یہاں کیوں رگ گئے۔ تم نے یہ کیا کر دیا؟“

”انفٹا! یہ میری خوش قسمتی تھی۔ میں نے اس دن بدلتے موسم کا شکر یہ ادا کیا۔ شہزادہ ڈون سرشاری سے بولا۔ ”مگر انفٹا! ہمیں تو یہ خیال ہی نہیں رہا کہ جدائی کی گھڑی بھی آجائے گی۔“

دونوں کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ شہزادے نے انفٹا کی آغوش میں بھر لیا۔ ”انفٹا! جان عزیز، بھول مت جانا، میں تمہیں لینے کسٹائل ضرور آؤں گا۔ مجھے یاد رکھنا قربت کے یہ لمحات بہت مختصر ہیں اور میرے پاس تم سے کہنے کے لیے بہت سی باتیں جمع ہو چکی ہیں مگر اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مختصر مہلت میں کون سی بات کہوں، کون سی نہیں بس میرا انتظار کرنا انفٹا! میں جلد ہی ریاست کسٹائل پہنچ کے تمہارے والد کو ہموار کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے یقین ہے جب میں ایک بڑا مقصد ان کے سامنے پیش کروں گا وہ اس پر ضرور غور کریں گے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ہونا بھی نہیں چاہیے انفٹا! ہسپانیہ آج کل عربوں کے چنگل میں ہے۔ اموی سلطان عبدالرحمن الناصر نے خلافت کا دعویٰ کر کے اپنا اقتدار اور مضبوط کر لیا ہے، چنانچہ وقت کا سب سے اہم تقاضا یہ ہے کہ میری اور تمہاری ریاستیں اپنے اختلافات فراموش کر دیں اور اموی اقتدار کے خلاف متحد ہو جائیں۔ مجھے تمہارے والد کے سامنے یہ وضاحت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی کہ اس اتحاد کے لیے ہم دونوں کا باہمی تعلق کیا کر دار ادا کر سکتا ہے۔“

”ڈون!“ انفٹا نے خیال آگینز لہجے میں کہا۔ ”تم ایک ذہین شہزادے ہو جذبات میں حقائق سے مرنے والے اور یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے، اسے آغا سیدھا سا دیکھ کر خیال کرتے ہو؟“

ڈون نے کہا۔ ”مجھے اپنے جذبے اور تمہارے عہد پر کھل اعتماد ہے۔“

اور اس صورت میں یقین ہے کہ ہمارے راستے کی ہر تہ پیچیدگی خود بخود سلجھ جائے گی۔ تم میرے ساتھ ہو تو ہر کاوٹ دور ہو جائے گی۔ ” وہ جوش میں بولا۔

شہزادی منس پڑی۔ ڈون کے کانوں میں چاندی کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ تم مجھ پر خود جیسا اعتبار کر سکتے ہو لیکن بہتر ہے کہ ہم اپنی ریاستوں کے حالات بھی پیش نظر رکھیں۔ اس طرح ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔“

”کیا تمہارے ذہن میں کوئی تجویز ہے؟“ ڈون نے بے قراری سے پوچھا۔
 شہزادی انفسا نے خود کو اس کی آغوش سے آزاد کیا اور باوقار انداز میں کہنے لگی۔
 ”میری ریاست کسٹائل چھوٹی ہے مگر جیسا کہ تمہیں معلوم ہے اس نے تمہاری ریاست لیون کی بالادستی کبھی قبول نہیں کی۔ مجھے صاف گوتی سے کہنے کی اجازت دو، خصوصاً میرے والد کے عہد میں کسٹائل نے باقاعدہ ایک خود مختار اور خود سر ریاست کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ میری اور تمہاری ریاستوں کے درمیان کشیدگی اور خانہ جنگی کا اصل سبب یہی ہے دوسری طرف تمہارے والد نے جب سے جنگ خذق میں سلطان عبدالرحمن کو شکست دی اور غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے، معاف کرنا اس وقت سے وہ خاص طور پر کسٹائل کی خود مختاری ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسی لیے ہماری ریاستوں کے درمیان اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔“
 ”مجھے معلوم ہے انفسا! مجھے معلوم ہے۔“ ڈون نے تیزی سے کہا۔ ”میرا اور تمہارا رابطہ ندی کے دو کناروں کا رابطہ ہے اور ان کناروں کے درمیان پانی کے بجائے خون بہ رہا ہے۔“

”ہاں ڈون! دو بادل ٹکرائے ہیں اور ایک بجلی چمک گئی ہے۔ لیون اور کسٹائل کے درمیان تلواروں کا تھن ہوتا رہتا ہے۔ جب تک یہ وحشیانہ تماشائیں ختم نہ ہو جائے۔۔۔۔۔“
 ڈون نے اس کا منہ لیں ہاتھ اپنی مضبوط ہتھیلی میں بچھ لیا اور اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ تماشائیں ختم ہوگا انفسا! ضرور ختم ہوگا۔ اپنے ڈون پر اور اپنے آپ پر بھروسہ رکھو۔ مانا ہماری قوم اتنی مہذب اور اتنی متمکن نہیں کہ صرف میری اور تمہاری خاطر آسانی

سے اپنی دشمنی کے فاصلے کم کر دے مگر یقین رکھو، میں اپنے والد کی ضد توڑ دوں گا اور انہی کی اجازت سے تمہارا پیغام بن کے کٹاٹل پہنچوں گا۔

’ڈون! انفٹا بے تابی سے اس کے بازوؤں میں سما گئی۔ تم کٹاٹل آکے مجھے سرا انتظار پاؤ گے۔ میں بھی اپنے والدین کو رونا مند کرتے کی کوشش کروں گی۔ تمہیں شاید علم ہو۔ انہوں نے بھی ایک دوسرے سے محبت کی تھی اس لیے ممکن ہے کہ وہ ہمارے رشتے کی دیوار نہ بنیں لیکن سیاسی حالات کی دیوار تو بدستور کھڑی ہے اس کا کیا ہوگا؟‘

’تمہارا ڈون ہر دیوار گرا دے گا انفٹا! صرف ایک دیوار باقی رہے گی جو ہمارے اور عربوں کے درمیان حائل ہے۔‘ وہ دونوں دیوار میں چبھی ہوئی اینٹیوں کی طرح ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔



محبت کا یہ فیصلہ عجیب تھا کہ عربوں کے خلاف لیون اور کٹاٹل کا باہمی اتحاد ہی دو دل یک جا کر سکتا ہے۔ ڈون کے محافظ سواروں نے گھوڑوں پر دوبارہ نمدے کس لیے تھے۔ ڈون اپنی میزبان ملکہ تھیوڈا سے رخصت ہونے کے لیے اس کے کمرے میں پہنچا تو ملکہ نے الوداعی گفتگو بے حد شفقت اور اپنائیت سے کی۔ پھر اسے ایک عجیب نصیحت کی۔ ڈون خشن رہ گیا۔ ملکہ اس سے کہہ رہی تھی۔

’ڈون! تم لیون کے ولی عہد ہو جاؤ یا بدیر سلطنت کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں آنے والی ہے لہذا میں تمہیں نصیحت کرتی ہوں کہ جب تم اقتدار کی مسند سنبھالو، اس وقت قرطبہ کے سلطان کی طرف شمشیر کی بجائے دوستی کا ہاتھ بڑھانا۔‘

ڈون کو ایسا محسوس ہوا جیسے ملکہ تھیوڈا نے اس کی گردن پر تلوار رکھ دی ہو۔ وہ حیرت زدہ ہو کے بولا۔ ’مجھے عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ قرطبہ کا سلطان ہمارا دشمن ہے اور دشمن

کی طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھایا جاتا، شمشیر بڑھائی جاتی ہے۔“

ملکہ نے نوجوان شہزادے کی حیرت میں اور اضافہ کر دیا۔ ”ڈون! ہم اندلس کی عرب سلطنت کے خلاف دو صدیوں سے برسریں پیکار ہیں، بے شک ہم نے شمالی علاقوں میں اپنی کچھ ریاستیں قائم کر لی ہیں اور تمہارے باپ نے جنگِ خندق میں سلطان عبدالرحمن کے بعد بہت نام پیدا کیا ہے لیکن کیا اس شکست سے عربوں کے قدم اکھڑ گئے، کیا کسٹائل کے نواب نے تمہارے باپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا، بلکہ ہو یا یہ کہ سلطان کے لشکروں نے صرف ۲ سال میں ہمیں دو بار شکست دے کے اپنا حساب برابر کر لیا مگر لیون اور کسٹائل کے درمیان جس خاندان کی کا آواز ہوا تھا وہ بدستور جاری ہے۔“

ڈون نے ادب سے جواب دیا۔ ”ملکہ عالیہ! اب بہت جلد آپ سن لیں گی کہ لیون اور کسٹائل متحد ہو گئے ہیں اور ان کی متحدہ فوجیں قرطبہ کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں۔“

ملکہ تھیوڈا نے شہزادے کو اس طرح دیکھا جیسے اُس نے کوئی مضحکہ خیز بات کہی۔

”اگر ایسا ہوا تو خدشہ ہے کہ ہماری ہزاروں بیوہ عورتوں میں کچھ اور اضافہ ہو جائے گا۔“

عربوں کو کمزور سمجھنا سراسر نادانی ہے۔ عبدالرحمان الناصر نے اپنی سلطنت بے حد مضبوط کر لی ہے۔ وہ سلطنت گزشتہ دو صدیوں میں اتنی مضبوط کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس حالت میں اُس سے جنگ کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ شہزادے! عربوں نے ہمارے لشکروں کو دو شکستیں دینے کے باوجود لیون کو پامال نہیں کیا۔ اس کی وجہ جانتے ہو، عبدالرحمن چاہتا ہے کہ ہم مختلف ریاستوں میں بٹے رہیں اور کبھی متحد نہ ہو سکیں۔ ویسے ایک بات سُن لو۔ عبدالرحمن ایک عادل حکمران ہے۔ اُس کی سلطنت میں قابل لوگ کسی نسلی یا مذہبی تفریق کے بغیر اہم عہدوں پر فائز ہیں اور وہ اپنی عیسائی رعایا سے بھی ویسی ہی محبت رکھتا ہے۔ جیسی مسلمانوں سے۔ لہذا اگر تم نے اس کی حمایت اور دوستی حاصل کر لی تو اپنی قوم پر بہت بڑا احسان کرو گے۔“

ڈون ان باتوں کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ اُس کے دل میں تو محبت کی بسا کچھی تھی اور وہ ہر قیمت پر انفسا کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے ملکہ تھیوڈا کے ہاتھ پر ہوسہ

دیا اور یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ "ملکہ عالیہ! ضعیفی ہمیشہ مصلحت اندیش ہوتی ہے مگر میری رگوں میں ابھی جوان خون گردش کر رہا ہے۔ تاہم میں آپ کی باتوں پر غور ضرور کروں گا۔" تھوڑی دیر بعد وہ اپنے سواروں کی معیت میں لیون کی طرف بڑھ رہا تھا۔ حسین و جمیل انفسا برن پوش وادی میں کھڑی اس وقت تک اسے دیکھتی رہی جب تک کہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔



لیون پہنچنے کے بعد ملکہ تھیوڈا کی نصیحت ڈون کے دماغ میں برفانی ہواؤں کی طرح رقص کرتی رہی۔ عبدالرحمن الناصر کا نام اس کے ذہن پر کوڑے کی مانند طرہ میں لگاتا رہا۔ کبھی کبھی وہ اپنا ذہن جھٹک کر دل کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ دل کی ہر دھڑکن انفسا کا نام لیتی تھی اور اس کے ہر تار سے محبت کا نغمہ چھوٹتا تھا۔ ڈون بار بار اُن خیال آفرین لمحوں کی یاد میں کھو جاتا جو نادار کی رنگین اور سرد فضا میں بسر ہوئے تھے۔ ایک طرف قبیلہ قریش کا باز عبدالرحمان اُس کے ذہن کے ویران غلاموں میں پرواز کر رہا تھا، دوسری طرف کٹائل کی شعلہ رُخ و ڈبیزہ انفسا اپنی ناقابل فراموش یادوں کے ساتھ دل کی محرابوں میں رقص کرا رہی تھی۔ آخر ایک طویل ذہنی کش مکش کے بعد اُس نے عبدالرحمن کو بھول کر صرف شہزادی انفسا کو اپنے خیالات کا مرکز بنا لیا۔

انفسا کے شعلہ حسن نے اُس کے دل میں محبت کی وہ آگ بھڑکا دی تھی جیسے ہسپانیہ کے عرب شاعر سوزِ عشق کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ ڈون نے اپنی محبوبہ کے لیے ایک عربی قصیدہ منتخب کیا اور اُسے اپنے خاص غلام کے ذریعے کٹائل بھجوا دیا۔ عرب شاعر کی رنگین بیانی نے شہزادی انفسا کے دل میں محبت کے نئے خطوط کھینچ دیئے اور ایک خیال افروز رومانی شمع روشن کر دی۔ شہزادی نے بے تاب ہو کے اپنے محبوب کو پیغام بھیجا

کہ وہ جلد کسٹائل آئے اور اس کے باپ سے ملاقات کرے۔ اس نے یہ لکھا کہ عربی قصیدے نے میرے دل میں قرطبہ دیکھنے کا شوق پیدا کر دیا ہے۔ سنا ہے عبدالرحمن الناصر نے اسے جنت کی طرح خوب صورت بنا دیا ہے۔ قرطبہ کی سیاحت ہم دونوں ایک ساتھ کریں گے۔
 ڈون! آؤنا۔

ڈون کو یہ پیغام ملا تو وہ تڑپ اٹھا اور اس کے دل میں بھی انفسا کے ساتھ قرطبہ گھومنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ واقعی عبدالرحمن الناصر نے قرطبہ کو حسین قصروں، مصنوعی جھیلوں، تالابوں اور خوش نما باغات سے رشک فرورس بنا دیا تھا۔ لیون، کسٹائل اور ناوار کے باشندے اگرچہ اموی سلطنت کو اپنا دشمن سمجھتے تھے لیکن جس طرح محبت کا کوئی وطن نہیں ہوتا، اسی طرح شعر و ادب اور لطیف فنون کی میراث بھی عالم گیر ہوتی ہے۔ مقامی لوگ تہذیب و تمدن کی شائستگی سے عاری ہونے کے باوجود عربی شعر و ادب سے متاثر تھے اور قرطبہ کی نادر عمارتیں، باغات اور تفریح گاہیں دیکھ کے عرب تہذیب و تمدن پر فنگ رہ جاتے تھے۔ وہ عربوں کی داستانیں اور عشقیہ نظموں پادریوں کی تصانیف سے زیادہ دلچسپ سمجھتے اور نہایت ذوق و شوق سے انہیں پڑھتے تھے۔

ڈون کے بھیجے ہوئے قصیدے کے جواب میں شہزادی انفسا کا پیغام ڈون کے دل پر عبرت کا ایک تازیانہ ثابت ہوا وہ عبدالرحمن سے ٹکرانے کا حیرت انگیز ولولہ لے کے لیون سے نکل کھڑا ہوا اور سب سے پہلے کسٹائل پہنچا تا کہ کسٹائل کے نواب یعنی انفسا کے باپ سے معاملات طے کر سکے، وہ اپنے دل میں محبت کی شمع رکھ کر کے کسٹائل آیا تھا۔ اس شمع کی حسین و رنگین شعاعوں نے اس کے خیالات تابناک کر دیے تھے۔ اس کا دل اس یقین سے لبریز تھا کہ انفسا کا باپ نواب فرندو اس کی دعوت قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکے گا کیونکہ قوم کے روشن مستقبل کا انحصار اسی امر پر ہے۔

ڈون کے اس یقین کے پیچھے کچھ ناقابل انکار حقیقتیں تھیں۔ اول تو عرب حکمرانوں سے مسلسل لڑائیوں کے بعد لیون کی جو سلطنت قائم ہوئی تھی وہ مقامی باشندوں کی نہی تناؤں کا مرکز بن چکی تھی۔ ان کے آباؤ اجداد کو عرب اور محمد حملہ آوروں نے دو ٹوک

سال قبل شمال کی طرف مار بھگا یا تھا۔ یہ بھاگے ہوئے لوگ ایک قلیل جمعیت کے ساتھ پارٹی
 حصاروں اور غاروں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ ڈون اسی سلطنت کا ہونے والا سربراہ تھا۔
 اس کے باپ رامیرونے اپنے بھائی کو معزول کر کے تخت پر قبضہ کیا تھا پھر اس کی آنکھوں میں
 دھکتی ہوئی سلاٹیاں پھر وادی تھیں۔ اس کے بعد لیون پر کھتل اختیار حاصل کر کے اسے
 ایک مستحکم سلطنت میں تبدیل کر دیا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ رامیرونے ۶۳۹ء میں
 عبدالرحمن کو جناب خندق میں شکست دے کر اپنی قوم کا ہیرو بن گیا تھا۔ کسٹائل کا نواب
 فرنڈو ایسے نام و د باپ کے بیٹے اور لیون کے ولی عہد کو رشتہ دینے سے بھلا کیسے انکار
 کر سکتا تھا پھر بھی اگر انکار کی کوئی وجہ ہو سکتی تھی تو صرف وہ کشیدگی تھی جو دونوں ریاستوں
 کے درمیان ایک طویل مدت سے چلی آرہی تھی لیکن ڈون اپنی محبوبہ کے ایک اشارے پر
 وہ کشیدگی قربان کرنے کے لیے پہنچ گیا تھا۔



کسٹائل میں ڈون کی آمد ایک جلیل القدر شہزادے کی آمد تھی اور اس کے ہمراہ
 منتخب سواروں کا ایک دستہ سفر کر رہا تھا پھر بھی باہمی ناچاتی کی وجہ سے اس کا کوئی غیر معمولی
 استقبال نہیں کیا گیا کیونکہ وہ نواب فرنڈو کے حریف کا ولی عہد تھا مگر کوئی ایسی بات بھی ظہور
 میں نہیں آئی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ کسٹائل کے باشندوں کو اس کی آمد ناگوار گزری ہے۔
 نواب فرنڈو اس کے مقصد سے بے خبر نہیں تھا۔ شہزادی انفٹا سے ڈون کے متعلق
 اپنے اور اپنے متعلق ڈون کے جذبات سے آگاہ کر چکی تھی اور نواب کے طرز عمل سے یہی
 ظاہر ہوتا تھا اسے ڈون کی آمد پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ نوجوان شہزادے نے شاہی محل کے
 دروازے سے آسمان کی لامحدود وسعتوں پر نظر دوڑائی تو اسے اپنی قسمت کا ستارہ چمکتا ہوا نظر آیا۔
 کسٹائل کا شاہی محل فرنی تعمیر کا بہترین نمونہ تھا۔ نواب فرنڈو نے ڈون کے ساتھ

اُس کے صرف دو خاص محافظوں کو محل میں داخل ہونے کی اجازت دی اور اُس کے اعزاز میں ایک پُر تکلف ضیافت کا اہتمام کیا۔ ضیافت کے روز خصوصی ایوان کے دروازے پر نواب نے مادام انفسا کی معیت میں اُس کا استقبال کیا۔ ڈون اپنی محبوبہ کو سُرخ لباس میں دیکھ کر ان خود رفتہ ہو گیا۔ وہ اس لباس میں گلاب کی طرح دل آویز اور شگفتہ نظر آرہی تھی۔ نواب نے رسمی الفاظ میں شہزادے کو خوش آمدید کہا لیکن شہزادے کی بے تاب نگاہیں تو شہزادی کے سُرخ زیبا کا طواف کر رہی تھیں۔ حتیٰ کہ اُس نے مادام کی طرف بھی زیادہ توجہ نہیں دی۔ مادام اٹھارہ بیس سال قبل کسٹائل اور نادار کے سب سے مشہور افسانہ محبت کا کام کزی بردار تھی اور اس کا حُسن آج بھی ہزاروں سینا دل کو شرماتا تھا۔ شہزادی انفسا اسی تصویر کا دوسرا نقش تھی۔

کھانے کے دوران ڈون نے نواب اور مادام کے سامنے اپنا حسین مدعا پیش کر دیا۔ دونوں میاں بیوی نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اس رشتے پر اصولی طور سے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ پھر بھی ڈون کی بجائے اگر یہ رشتہ اُس کے باپ شاہ رامیرونے طلب کیا ہوتا تو بات اور ہوتی۔ شہزادے نے مرعش لہجے میں کہا: "میرے والد خود چاہتے ہیں کہ لیون اور کسٹائل کی دیرینہ عدوت محبت میں تبدیل ہو جائے اور متحد ہو کر وطنہ کا رُخ کریں۔ والا جناب! آپ کے علم میں ہے، خندق کی جنگ کے بعد عبدالرحمن الناصر کسی جنگ میں بہ نفس نفیس شریک نہیں ہوا۔ اس سے آپ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟"

نواب نے چونک کے نوجوان شہر لڑے کی طرف دیکھا اور سکرا کے جواب دیا "ہم نے سنا ہے، ایوان شوری سلطان کو جنگ میں شرکت کا مشورہ نہیں دیتا کیونکہ حلیفہ کی حیثیت سے اُن کی کچھ اور ذمے داریاں بھی ہیں، دمشق اور بغداد کے خلفاء کی بھی یہی روایت ہے۔"

"محترم بزرگ! شہزادے نے اُدب سے کہا۔ 'حقیقت دراصل کچھ اور ہے۔ ہمارے ملک میں عبدالرحمان الناصر کو ہمارے بہادروں کی بے حد خطرناک مزاحمت

کا ساٹنا کرنا پڑا ہے۔ جنگِ خندق میں اگر عرب سوار اُسے اپنی حفاظت میں لے کے میدان سے فرار نہ ہو جاتے تو میرے والد شاہِ رامیر وکی تلوار اُس کا سر تن سے جدا کر چکی ہوتی، یہ میرا خیال نہیں ایک حقیقت ہے کہ وہ ہم سے خوف زدہ ہو چکا ہے، اس صورت میں اگر ہم متحد ہو کر نکلیں تو ہسپانیہ سے عرب اقتدار کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔“

نواب فرزندِ دکا بے ساختہ تہقہہ بلوری جام کی کرچیوں کی طرح پکھرتا چلا گیا۔ ڈون اُس کے تہقہہ کا مفہوم سمجھنے سے عاری تھا۔ ٹھیک اسی لمحے مادام اور شہزادی نے مغذت کے ساتھ اٹھنے کی اجازت چاہی اور حسین انٹا آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے کوئی پیغام دے کر رخصت ہو گئی۔ ڈون کی نظریں محتاط انداز میں دُور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ ضیافت میں ملک کی بہترین شرابیں مہیا کی گئی تھیں خواتین رخصت ہو گئیں تو کسٹائل سے درباری سرداروں اور امراء نے شرابوں کی طرف ہاتھ بڑھائے اور محفل میں جیسے بجلیاں دوڑنے لگیں۔ شہزادے کے سامنے سب سے اعلیٰ شراب پیش کی گئی۔ ڈون نے سر جھکا کے یہ تواضع قبول کی اور شراب سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ابھی اُس نے صرف چند جام پیے ہوں گے کہ اُسے اپنے جسم سے چنکاریاں پھوٹتی محسوس ہوئیں۔ اُس نے لڑکھڑائی آواز میں نواب فرزندِ دکا شکر یہ ادا کیا اور کہا: ”جناب والا! کسٹائل کی ہر چیز نشہ آور ہے۔“

شاید وہ کچھ اور بھی کتا سیکن اُسی وقت محل کی ایک خادمہ ایوان میں داخل ہوئی اُس نے ڈون کے قریب پہنچ کے اُس سے کان میں کوئی بات کہی۔ شہزادہ یک لخت اٹھا اور اپنے میزبان سے اجازت لے کے خادمہ کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یقیناً شہزادی نے اُسے ملاقات کا پیغام بھیجا ہے۔ ایوان میں سرداروں اور امراء کے چہرے اچانک بگڑ گئے۔ انہوں نے نواب فرزندِ دکا کی طرف دیکھ کے ایک تضحیک آمیز تہقہہ بلند کیا۔ نواب کی پیشانی پر بے پروائی کے لیکن وہ خاموشی لے ساتھ شراب سے دل بہلاتا رہا۔ چند لمحوں بعد وہ اچانک کھڑا ہو گیا اور حاضریں سے مخاطب ہو کر بولا: ”معزز زارگانِ دربار! کیا آپ جانتے ہیں کہ لیون کس ولی عہد کو شہزادی نے خادمہ کے ذریعے اندر کیوں بلا یا ہے؟“

اُسے چل کر ذرا دیکھیں کہ تنہائی کی یہ ملاقات کس محلے تک پہنچتی ہے۔“

نواب فرزند اپنے درباریوں کو ڈون اور انفسٹا کی ملاقات کا منظر دکھانا چاہتا تھا۔ یہ ایک عجیب پیش کش تھی۔ کسٹائل کے نیم وحشی بہادروں کے لیے یہ منظر تفریح اور دل چسپی کا ایک نیا سامان تھا چنانچہ وہ شراب سے بھرے ہوئے پیمانے چھوڑ کر نواب کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ چند کشادہ سخن اور راہ داریاں عبور کر کے نواب ایک مضبوط دروازے کے سامنے رُک گیا۔ دروازے پر ایک محافظ نسکی تلوار لیے پہرہ دار رہا تھا۔ نواب نے محافظ سے پوچھا۔ ”ہمارا مہمان پہنچ گیا؟“

محافظ نے گردن جھکا کے اثبات میں جواب دیا۔ نواب نے گرج کر کہا۔

”دروازہ کھول دیا جائے۔“

محافظ نے فوراً حکم کی تعمیل کی دروازے کے بھاری پٹ کھلے تو سرداروں نے کمرے میں ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ شہزادہ ڈون زنجیروں میں جکڑا ہوا تیرخانے کی آہنی سائٹوں کے پیچھے پڑا تھا۔ سردار بلیکس جھپکنا بھول گئے۔ نواب اُن کی طرف پلٹا۔ سردارو! کیا خیال ہے، کیسا منظر ہے؟

ایک بوڑھے سردار نے کہا۔ حضور گرامی! اگر یہ کوئی مذاق ہے تو خطرناک حد تک دلچسپ مذاق ہے اور اگر حقیقت ہے تو کسٹائل کے قلعے کی فصیل اتنی مضبوط اور بلند کر لیجئے کہ لیون کے چھا پہاروں کی کندیں اس کے گنگوروں تک نہ پہنچ سکیں۔“

نواب نے اس اقدام کے حجاز میں کہا۔ ”سردارو! اس نا تجربہ کار لڑکے نے لیون اور کسٹائل کے اتحاد کی اہمقا نہ تجویز پیش کر کے ہمیں آزمانے کی کوشش کی اور یہ دعوا کیا تھا کہ یہ عبدالرحمان الناصر کو شکست دے سکتا ہے۔ عبدالرحمن ہم سب کا دشمن ہے لیکن دشمن کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ آنا کمزور نہیں ہے کہ ڈون جیسے گیدڑ اسے شکار کرنے کا دعوا کریں۔ رفیقو! فرانس کی مدد کے بغیر ہم عربوں کے خلاف کوئی کامیاب جنگ نہیں لڑ سکتے مگر فرانس عبدالرحمن سے جنگ کرنے کی بجائے اُس کی دوستی کا خواہاں ہے۔ قسطنطنیہ، جرمنی اور روم کے سفیر اُس کے دربار میں تہ زجھکا کے کھڑے ہوتے ہیں ایسی

تاریخ دہرائی گئی ہے۔“

لوگوں کی نظریں ڈوڑکے اُس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ سب ہی سمجھے کہ آج اس نے طوت سے زیادہ پی لی ہے اور نشے میں ایک تاریخی حقیقت سے انکار کو رہا ہے۔ اُس شخص نے لوگوں کی آنکھوں میں حقارت کی جھلک دیکھی اور کہا ”صباحو! یہ درست ہے کہ شہزادی نے اپنی ماں کی طرح اپنے محبوب کو فرار ہونے میں مدد دی ہے اور اُسے قید خانے سے نجات دلا دی مگر آپ یہ نہ بھولیے کہ اُس کی ماں اپنے محبوب کے ساتھ خود بھی کسٹائل آگئی تھی۔ اس کے برعکس شہزادی اپنے اپنے محبوب کے ساتھ فرار نہیں ہوئی۔“

لوگ اس کی نکتہ آفرینی پر داد دینے لگے۔ یک نخت کسی نے انکشاف کیا۔
”شہزادی محل کے اُسی قید خانے میں نظر بند کر دی گئی ہیں جہاں سے انہوں نے شہزادہ ڈون کو رہا کرایا تھا۔“

یہ اطلاع اُن نوجوانوں کے لیے یقیناً تکلیف دہ تھی۔ جنہوں نے شہزادی کی جرات پسند، تھی۔ اُن کے نزدیک نواب فرزند جیسے بہادر شخص کو یہ بزدلی زیب نہیں دیتی تھی کہ وہ سر آئے مہمان کو فریب سے قید خانے میں ڈال دیتا مگر بوڑھوں اور مصلحت اندیش لوگوں کا خیال مختلف تھا کیوں کہ اُن کے جسموں میں خون کی گردش سرداؤ سست پڑ گئی تھی۔ وہ ریاست کی آزادی ایک ناواں شہزادی کی محبت سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور نواب فرزند کی مجبوری اور مصلحت خوب سمجھتے تھے۔ نواب نے ہمیشہ اپنی جان پر کھیل کے ریاست کی آزادی اور خود مختاری کا تحفظ کیا تھا کسٹائل کے باشندے اسی شجاعانہ کردار کے باعث اُسے پسند کرتے تھے مگر طویل خانہ جنگی نے ریاست کی بسفوں سے بہت سارا خون چھوڑ لیا تھا اور اب اُس میں مدافعت کی پہلے جیسی قوت نہیں رہی تھی۔ نواب فرزند و شہزادہ ڈون کو پرغمال کے طور پر اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا تاکہ لہون کے شاہ سے اپنے بعض مطالبات منواسکے لیکن شہزادے کے فرار نے صورت حال کیسر تبدیل کر دی تھی اور اب یہ خطرہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ رامیرو جیسا ظالم اور خود پسند

بادشاہ اس واقعے کی آڑ میں کسی وقت بھی کسٹائل پر حملہ کر سکتا ہے۔
 کسٹائل کے لوگ کسی روز تک متوقع حملے کا انتظار کرتے رہے۔ وہ راتوں کو
 چونک چونک کر اٹھتے اور پہاڑی گلیوں اور دروں میں گونجتے والی طوفانی اور برفانی ہواؤں
 کا شور ٹاپوں میں ڈھل کر ان کی سماعت سے ٹکراتا رہتا لیکن کسی روز گزر گئے، کوئی غیر
 معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ نہ پہاڑوں سے چھا پانا اترے نہ لیون کے سرخ پرچم دکھائی
 دیے۔ اس کیفیت سے لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ ہو سکتا ہے۔ شہزادہ ڈون نے
 اپنی گرفتاری کی ذلت باپ سے پوشیدہ رکھی ہو۔

ان کے اس اطمینان کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک روز اچانک
 کوہستانی فضا نقارہ و طبل کی ضربوں سے گونجنے لگی۔ رامیرو کے وحشی سوار تباہی
 بربادی کی آندھیاں لیے نمودار ہوئے۔

نواب فرزندوں نے پہلے کی طرح اس بار بھی قلعے سے نکل کر حملہ آوروں کا راستہ
 کاٹا لیکن ڈون کی اسیری کی طرح جنگ کے نقتے پر یہ چال بھی ٹیڑھی پڑی۔ حملہ آور رسالے
 کی قیادت لیون کا ولی عہد خود کر رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں وہی جنگ جو سوار
 تھے جنہیں نواب فرزندوں نے مکاری سے قید کر لیا تھا۔ اب وہ سب اپنی ذلت کا
 بدلہ لینے پر تلے ہوئے اور دشمن کو نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے۔ ممکن ہے نواب
 کے سرفروش ساتھی یہ حملہ روک لیتے لیکن شہزادہ ڈون کے رسالے کے پیچھے پیچھے نمود
 شاد امیر و اپنے سرخ پرچموں اور نونی شہ سواروں کے ساتھ نمودار ہوا اور دیکھنے دیکھنے
 جنگ کا نقشہ تبدیل ہو گیا۔

نواب فرزندوں کی قسمت میں شکست کی ذلت مرلوم ہو چکی تھی۔ لیون کے
 شہ سواروں نے اس کے لیے فرار کے تمام راستے بند کر دیے۔ کسٹائل کے جاں فروش
 اس کے تحفظ کی خاطر کٹ کٹ کر گرے مگر فرزندوں کی شکست سے دوچار ہوا۔ اس نے
 جنگ ہار دی۔ قسمت ہار دی اور قسمت کے ساتھ جان کی حفاظت کے وعدے
 خود کو بھی ہار دیا۔ لیون کے فاتحین نے اسے زندہ گرفتار کر لیا۔

رامیر واپنے حریف کو اسیر کر کے لیون کی طرف روانہ ہو گیا۔ کسٹائل کی تقدیر کا فیصلہ ولی عہد ڈون کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ اُس سے کہہ دیا گیا کہ وہ اس بد قسمت ریاست کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے۔ کسٹائل کے باشندے ساہا سال سے اپنی آنادی اور خود مختاری کی دلیرانہ حفاظت کرتے آئے تھے لیکن آج اُن کے پرچم خاک و خون میں تھڑے پڑے تھے، اُن کی آزادی کا سورج غروب ہو گیا تھا اور اُن کی ریاست کے والی کو گرفتار کر کے لیون کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ شکست و اسیری کا یہ واقعہ کسٹائل کی تاریخ کا ایک الم ناک باب تھا اس واقعے نے کسٹائل کی پیشانی پر غلامی کی مہر ثبت کر دی۔

شاہ رامیر واپنے اپنے قیدی نواب فرنڈو سے اُس وقت تک ملاقات نہیں کی جب تک وہ لیون نہیں پہنچ گیا۔ اس نے دربار آراستہ کیا تو نواب کو ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے اُس کے سامنے پیش کیا گیا۔ رامیر و اُس کی گرفتاری پر بے حد مسرور تھا۔ اس نے تخت پر بیٹھ کے اپنی گردن فخر سے بلند کی اور بد قسمت نواب کی طرف ہاتھ لہرا کے بولا۔

”فرنڈو! تم نے ہمارے ولی عہد کو دعوت میں بلا کے اور میزبان بن کے فریب سے گرفتار کیا تھا مگر ہم تمہیں کھانے کی میز سے نہیں جنگ کے میدان سے اسیر کر کے لائے ہیں اور اس لیے لائے ہیں کہ لیون میں ہم نے تمہارے لیے ایک نیا مہمان خانہ تعمیر کرایا ہے اس مہمان خانے کی تعمیر اسی روز شروع کر دی گئی تھی جس روز ڈون تمہاری قید سے نجات حاصل کر کے یہاں پہنچا تھا۔ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے معزز مہمان کو کسی پرانی کوٹھڑی میں مہمان بنائیں۔“

شاہ رامیر واپنے جس نئے مہمان خانے کا ذکر کیا تھا۔ وہ لیون کا ایک انتہائی اذیت ناک، بدترین اور پر ہول قید خانہ تھا۔ اُسے زمین کی سطح سے بیس فٹ کی گہرائی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ آدمی اُس زمین دوز مقبرے میں پتھر کی پوری چوبیس سیرٹھیلوں کا ایک خم دار زینہ اُترنے کے بعد داخل ہوتا تھا قید خانہ قبر کی مانند تنگ، سرد اور تاریک کوٹھڑیوں پر مشتمل تھا۔ اُن کوٹھڑیوں کے درمیان پتھر کی دس دس فٹ چوڑی دیواریں حامل تھیں۔ دیواروں میں

سوداخ بنانا یا سیندھ لگانا ممکن نہ تھا۔ ایک کوٹھڑی کا قیدی یہ بھی معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ دوسری کوٹھڑی میں کون اُس کی طرح ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ زمین دوز قید خانے کے اوپر محافظ سپاہیوں کی بیرکیں تھیں اور وارونہ کا کمرہ تھا۔ تہ خانے سے ملحق ایک اذیت خانہ تھا۔ قید خانے کے اندر ایک بلند اور مضبوط فصیل تھی۔ فصیل کے مہیب برجی دروازے میں داخل ہونے کے بعد قیدی کا بیرونی دنیا سے ہر شے منقطع ہو جاتا تھا۔

کسٹائل کا باغی اور خود سر نواب فرزند اُس بھیانک قید خانے کی ایک سوادِ خونناک کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔ کوٹھڑی کے اندھیوں کو روشنی کی کوئی کرن پریشان نہیں کر سکتی تھی۔ نواب فرزند نے کوٹھڑی کے باہر ایک تاریک گلی سے شاہ رامیرو کی آواز سنی۔

”قیدی گھبرانا نہیں۔ تم اس مہان خانے میں زیادہ دنوں تک تنہا نہیں رہو گے۔ دوسری کوٹھڑی قرطبہ کے خود ساختہ سلطان کے لیے تیار کی گئی ہے۔ سلطان والا تبار اس مہان خانے کو رونق بخشیں گے تو تمہیں اُن کے ساتھ بل بیٹھنے کی سہولت فرام کر دی جائے گی۔“

اس آواز کے ساتھ ہی لحد نما کوٹھڑی کا دروازہ بند ہو گیا۔ گلی اور زینے میں کچھ آٹھیں ابھریں اور بدرتج خاموشیوں میں ڈوبتی چلی گئیں۔ آخر زمین دوز قید خانے پر پت کی طرح مہیب اور ہولناک سناٹا چھا گیا۔ نواب فرزند کے وحشیانہ قہقہے نے یہ سناٹا توڑنے کی کوشش کی لیکن قہقہہ خود ٹوٹ گیا۔



فرزند کی شکست اور اسیری کے بعد کسٹائل کے عام باشندوں کی مزاحمت قریب قریب ختم ہو گئی تھی۔ قلعے پر اب لیون کا سرخ پرچم لہرا رہا تھا۔ رامیرو کے لشکر نے قلعے

پر قبضہ کر لیا لیکن شہر کے حالات پر اب تک قابو نہیں پاسکا تھا۔ کسٹائل کے لوگ شکست کے باوجود کسی نئے آقا کی اطاعت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

دونوں ریاستوں کے درمیان چونکہ مدت سے کشیدگی تھی اور باہمی خانہ جنگی میں لیون کے بہت سے آدمی ہلاک اور زخمی ہوئے تھے اس لیے فاتحین نے کسٹائل کے باشندوں سے اپنے پرانے زخموں کا انتقام بھی لیا اور اپنی فتح کا خراج جبراً وصول کرتے رہے اس سنگ و لی کی وجہ سے ایک نئی نفرت پیدا ہو گئی۔ دونوں ریاستوں کے باشندے ایک ہی نسل، ایک ہی قوم اور ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتے تھے لیکن اقتدار و اختیار کے جھگڑوں نے انہیں دو متحارب گروہوں میں تبدیل کر دیا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کے ازلی دشمن ہوں۔ اس دور میں یورپ کے غیر مذہب اور وحشی حکمران منضوح اقوام کی خواتین کو بھی مال غنیمت تصور کرتے اور ان کے حسن و جمال سے اپنی خلوتیں رنگین بنانا فتح کا دستور سمجھتے تھے۔

لیون کے فوجیوں نے کسٹائل کی فتح کا خوب جشن منایا۔ شراب اور موسیقی کی محفلاًں میں کسٹائل کی حسین اور جوان عورتیں بے حجاب کی گئیں اور ان کے جسموں کی توہین کی گئی اسی قسم کی ایک محفل کا ذکر بے محفل شباب پر تھی اور فوجی افسروں کے نشیلے قمقمے فضا میں مستیاں بکھیر رہے تھے کہ اچانک کسٹائل کے چند بوڑھے سردار اپنے ماتحتوں پر شدید غصے کی شکنیں لیے داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر برہنہ عورتوں کی چنچیں نکل گئیں۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ کے ادھر ادھر چھپنے کی کوشش کر لے لگیں مگر لیون کے فوجیوں نے انہیں بے دردی سے پھر اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایک سردار نے بلند آواز میں افسروں کو بلائی۔ تم ہمارے ہم قوم ہو پھر بھی ہماری خواتین کو ہماری آنکھوں کے سامنے ذلیل کر رہے ہو۔ یاد رکھو، تم نے کسٹائل جیتا ہے۔ کسٹائل کے لوگ نہیں جیتے کان کھول کر سن لو، اگر فتح کا یہ قابلِ نفرت جشن بند ہو تو ہم قرطبہ کے سلطان تک فریاد لے کر جائیں گے پھر تم سے ہماری عورتوں کی توہین کا انتقام عربوں کی تلواریں لیں گی۔ تم گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ کے پھینک دیئے جاؤ گے۔“

یہ بے وقت کی راگنی سب کو بُری معلوم ہوئی۔ بعض افسروں کے نزدیک بوڑھے سردار کی یہ جسارت ناقابلِ معافی تھی۔ جنگ اور فتح کے بارے میں مقامی فوجیوں کے کچھ اصول تھے مگر بوڑھے نے عربوں کی شرافت اور تلواروں کا طعنہ دے کر فتح مند افسروں کی توہین کی تھی اور اپنی سرکشی، اپنی بغاوت کا برملا اظہار کر کے لیون کی بالادستی کا مذاق اڑایا تھا۔ چنانچہ ایک فوجی افسر غصے میں اُس کی طرف بڑھا۔ اُس نے پہلے بوڑھے کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر حقارت سے کہا۔

”کٹائل کے بڑھے گدھ! تو ہمیں عربوں کی تلواروں سے ڈرانے آیا ہے؟ شاید تو نہیں جانتا کہ عورت کا حُسن فتح کا نشہ دوہند کر دیتا ہے۔ جا، قرطبہ کے سلطان سے ہماری شکایت کر دے۔ ہم اُس سے نہیں ڈرتے۔ ہم یہ جشن اسی طرح مناتے رہیں گے کیوں کہ یہ ہمارا دستور ہے۔“

”ہم اپنی ذلت کا تماشا نہیں دیکھ سکتے۔ ہم تمہیں اپنی عزت سے نہیں کھیلنے دیں گے۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے۔“

بوڑھے کے الفاظ کی گونج ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ فوجی افسر کی تلوار اچھل کے میان سے باہر آگئی۔ ایک بجلی سی چمکی اور دوسرے ہی لمحے بوڑھے کا لاشہ زمین پر تڑپنے لگا۔ دوسرے سردار اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کے تیزی سے پلٹے اور جشن گاہ سے نکل گئے۔ اس ناخوشگوار واقعے کے بعد نغمہ و مے کے ہنگامے پھر شروع ہو گئے اور کٹائل کی بے بس اور بے حجاب عورتیں فاتحین کی دست درازیوں کا نشانہ بننے لگیں۔

سردرات کے اندھیروں میں کہیں دور آوازوں کا شور بلند ہوا۔ کٹائل کے لوگوں کا بھرا ہوا ہجوم جشن گاہ کی طرف بڑھ رہا تھا مشتعل آوازیں بتدریج طوفانی ہواؤں کے شور کی طرح بلند سے بلند تر ہو رہی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے جشن گاہ میں بہنے والے خون کی سرخی آگ کے شعلوں میں تبدیل ہو گئی۔ بھیرے ہوئے ہجوم نے ہر وہ شے نند آتش کر دی جو لیون سے وابستہ تھی۔ سپاہیوں کی چھل داریاں اور افسروں کے خیمے دھڑا دھڑا جلنے لگے۔

کٹائل کے باشندوں کے دلوں میں بھڑکنے والی آگ دھویں کے پادلوں کی صورت

اختیار کر کے جشن گاہ کی طرف لپکنے لگی۔ رقص بند ہو گیا، موسیقی تھم گئی۔ شراب کے پیمانے کھنک چھنک کے ٹوٹنے لگے۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ کسٹائل کے خلاف پھر جنگ کا بگل بجا دیا گیا۔ لیون کے سپاہی تلواریں سونت سونت کر اُس مشتعل ہجوم کے تعاقب میں نکلے جس نے فتح کے جشن کی تمام خوشیاں پھونک ڈالی تھیں۔ آتش زنی کرنے والے لوگ دھوئیں کے سائے بن کر فاب ہو گئے لیکن لیون کے فوجیوں کی تلواریں اب کسی پر رحم کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ انہوں نے شہر کو جا لیا اور ہر وہ شخص تہ تیغ کر دیا جو اُن کے سامنے آیا۔ خوب قتل عام ہوا۔ صبح کا اُجالا پھیلنے تک زندہ آدمیوں کی فرست سے سینکڑوں نام خارج کر دیئے گئے۔



کسٹائل کے قلعے پر تین دن سے لیون کا سرخ پرچم لہرا رہا تھا مگر شہزادہ ڈون اب تک شاہی محل میں داخل نہیں ہو سکا تھا۔ محل میں داخلے سے پہلے ضروری تھا کہ وہ شہر میں اُٹھنے والی بغاوت اور شورش کچل دے۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ کسٹائل تو مغلوب ہو چکا ہے لیکن کسٹائل کے لوگ مغلوب نہیں ہوئے اور ان کی طرف سے ہر لمحے فتنہ و فساد کا خطرہ ہے۔ تین روز بعد کسٹائل کے لوگوں کی سرکشی کم ہوئی اور وہ تلواروں کے زخم کھا کھا کر گھروں میں پناہ گزین ہو گئے تو ڈون نے شاہی محل جانے کا ارادہ کیا اور شہزادی انفسا کو اپنی آمد کی اطلاع بھیجی۔ وہ جا ہوتا تھا جنگ و جدل کی تمام کلفتیں ذہن سے اتار کر اپنی محبوبہ کی رنگین قرابت حاصل کر کے، اُسے یقین تھا کہ شہزادی شاہی محل میں بے چینی سے اُس کا انتظار کر رہی ہوگی۔

یورپ کا دستور تھا کہ مفتوح حکمران کی ملکہ اپنے حُسن کی جلمہ سامانیوں کے ساتھ فاتح کا استقبال کرتی اور اپنے بدن کے ساتھ اپنی وفاداریاں بھی اُسے سونپ دیتی تھی یا پھر

فاتح، شاہی خواتین میں سے خود کسی کا انتخاب کرتا اور اسے ملاقات کا پیغام بھیجتا تھا۔ اس کا استقبال ہر حالت میں ضروری سمجھا جاتا تھا۔ کٹائل کی ملکہ شاہی محل میں نظر بند کر دی گئی تھی۔ کمرے کے گرد لیون کے محافظ دن رات پہرا دیتے تھے کیونکہ یہ امکان نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ کٹائل کے سرداروں سے رابطہ پیدا کر کے انہیں بغاوت پر آمادہ کر سکتی ہے۔ شہزادی انفٹا کو ڈون کے فرار کے سلسلے میں اپنے باپ کے غیظ و غضب کا نشانہ بننا پڑا تھا۔ مگر اب وہ شاہی محل میں آزاد اور خود مختار تھی۔ ڈون اس سے ملنے اور اسے اس کے ایشیا کا صلہ پیش کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ شہر کے انتظامات سے فارغ ہوتے ہی اس نے قلعے کا رخ کیا اور تصور میں شہزادی انفٹا کی دل شکار شرمیلی مسکراہٹوں میں ڈوبنے لگا۔ وہ سوچتا تھا کہ استقبال کے وقت شہزادی کے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھر کبھی جائیں گی۔ آج کی رات، آج کی ملاقات ان کی خوشیوں کا گہوارہ بننے والی تھی۔ کیونکہ کٹائل کی فتح کے ساتھ ہی ڈون نے اپنی محبت کی بازی بھی جیت لی تھی۔ اب ان کے درمیان کوئی نواب، کوئی باپ حائل نہیں تھا۔

سورج برف پوش پہاڑوں کے پیچھے سو پوش ہو چکا تھا۔ شمال کی سرد ہوا بدن پر کوڑے برساتی چل رہی تھی۔ قلعے کے دروازے پر لیون کے نیزہ بردار محافظوں نے شہزادہ ڈون کا استقبال کیا اور قرنا پھونک کر قلعے والوں کو اس کے پہنچنے کی اطلاع دی۔

قلعے کی ہر روش اور ہر ہلکاری میں لیون کے محافظ ہوشیار ہو گئے۔ وہ ولی عہد کی حفاظت پر مامور تھے۔ ڈون شعلوں کی روشنی میں آہستہ آہستہ چلتا شہزادی انفٹا کے کمرے کی طرف بڑھا مگر اسے وہاں اپنے استقبال کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ شاہی محل میں نہ کوئی غیر معمولی روشنی تھی، نہ کوئی خلافت معمول سرگرمی، بیشتر کمرے تاریکی میں ڈوبے تھے۔ خود شہزادی کا کمرہ بھی روشنی سے محروم تھا۔ یہ سب کچھ ڈون کی توقع کے سراسر خلاف تھا۔

وہ ایک لمحے کے لیے غلام گردش میں رُک گیا۔ ٹھیک اسی وقت ایک محافظ نے کسی نیم تاریک کونے سے نکل کر اسے تعظیم دی اور بتایا کہ شہزادی اپنے کمرے میں اس

کی منتظر ہے۔ ڈون کے دل پر مایوسی کی جو دھند چھا گئی تھی چھٹ گئی لبوں پر ضعف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ پھر وہ جیسے ہی شہزادی کے خاص کمرے کے قریب پہنچا مخلوط نسل کی ایک خادمہ ادب سے دروازہ کھول کر ہٹ گئی۔ کمرے کے اندر صرف دو سمعیں ٹمٹا رہی رہی تھیں یا آتش دان میں لکڑیاں روشن تھیں۔ شعلوں کے عکس شہزادی کے سوگوار چہرے پر کانپ رہے تھے۔ وہ آتش دان کے قریب ایک کرسی پر نیم دراز تھی ڈون کی آہٹ سن کے آہستگی سے اٹھی مگر اس کے ہونٹوں پر کوئی تبسم نہیں تھا۔ نکھول میں کوئی دعوت نہ تھی۔ چہرے پر کوئی پیغام نہ تھا۔ کہیں مسرت کے آثار ہی نہیں تھے۔ حالانکہ اصول کے مطابق اسے اپنا گداز اور پرکشش بدن آراستہ کر کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کا جادو بکھیر کے ڈون کا استقبال کرنا چاہیے تھا۔ وہ بہت آداس اور خمزہ دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے اسے اپنے محبوب کی آمد پر قطعی خوشی نہ ہوئی ہو۔ یہ سرد مہری ڈون کو متحیر کر دینے کے لیے کافی تھی۔ وہ شہزادی کے قریب پہنچ کے رک گیا اور پرتکلف لہجے میں بولا: معلوم ہوتا ہے عزت مآب شہزادی کو ہماری ملاقات سے کوئی دلچسپی اور ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے ورنہ یہ کمرہ آج روشنیوں سے محروم نہ ہوتا۔

”کمرے کی روشنی دل کا اندھیرا دور نہیں کر سکتی ڈون! شہزادی نے تعیش لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ میں ایک شکست خورندہ شہزادی کی طرح تمہارا استقبال نہیں کر سکی، معذرت خواہ ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ فاتح کی زبان میں گفتگو نہ کرو۔“ ڈون نے محسوس کیا کہ شہزادی اگرچہ سوگوار ہے لیکن اس کے دل میں محبت کی آگ ابھی تک سرد نہیں ہوئی۔ یہ ایک حوصلہ افزا بات تھی۔ اس نے آگے بڑھ کے نرمی سے شہزادی کا ہاتھ پکڑ لیا اور پیار سے بولا۔

”عزیز از روح! ہو سکتا ہے، تمہارے دل کو کوئی صدمہ پہنچا ہو لیکن مجھے اپنے ایشارہ کا شکر یہ ادا کرنے کا موقع تو دو، میں تمہارے دل کا اندھیرا دور کر دوں گا انفساً! اگر تم رضا مندی ظاہر کرو تو ہم کل ہی ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔ کسٹائل کا چرچ ہماری شادی کا اعلان کر دے گا۔“

شہزادی نے یک لخت اُس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "نہیں ڈون! میں اپنی خوشیوں کا محل اپنے ہم وطنوں کی بربادی پر آباد نہیں کر سکتی۔ لیون کے سپاہیوں نے کٹائل کو جو غم، جو زخم، جو زحمت دینے ہیں، وہ اتنی جلدی شادی کے نعروں میں تبدیل نہیں ہو سکتے اگر تم انصاف نہیں کر سکتے تو کم از کم ظلم بھی نہ کرو۔"

ڈون پر انکشاف ہوا کہ کٹائل کے دوسرے باغیوں اور خود سروں کی طرح شہزادی نے بھی لیون کی فتح قبول نہیں کی۔ یہ بات حیرت انگیز تھی۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا اُسے باپ کے قید خانے سے رہا کرانے اور اُس کی خاطر اپنی جان پر کھیل جانے والی شہزادی شادی کی پیشکش فوراً قبول کر لے گی اور اُس کے ساتھ کٹائل کے تخت پر جلوس آرائی کو اپنی محبت کی کامیابی قرار دے گی لیکن شہزادی کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا اُسے ڈون کی کامیابی سے خوشی نہیں ہوئی البتہ کٹائل کی شکست اور تاراجی کا صدمہ ضرور پہنچا ہے۔ شہزادی کے کردار کا یہ پہلو ڈون کے لیے ناقابل فہم تھا۔ اُسے اچانک خیال آیا کہیں وہ اپنے باپ کی امیری پر تو غمزدہ نہیں ہے؟ اس نے شہزادی سے کہا۔

"اگر تمہیں اپنے والد کی گرفتاری کا صدمہ ہے تو خود سوچو، اس میں یہ کیا قصور ہے۔ میں تو تمہارا رشتہ لے کے آیا تھا۔ انہوں نے خود بد عہدی کی اور مجھے فریب سے قید کر لیا۔ انفساً! تمہیں اس شخص کے لیے اتنا پریشان نہیں ہونا چاہیے جس نے تمہارا محبوب کو گرفتار کر کے اپنی بربادی کو خود آواز دی۔"

"ڈون! اگر میرے والد نے تمہیں فریب سے گرفتار کیا تھا تو میں نے تمہاری رہائی کا انتظام کر کے اُن کے اس سلوک کی تلافی کر دی تھی۔ پھر تمہیں کٹائل پر حملے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

اس سوال کا ڈون کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بلاشبہ اُس کی ریاست نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کٹائل کی آزادی غصب کر لی تھی۔ شہزاد نے فوراً محبت کی آڑ لے لی اور کہا۔

"انفساً! تم جانتی ہو تمہارے والد کی موجودگی میں ہماری شادی ناممکن تھی۔"

محبت کی کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے، اب ہم دونوں آزاد ہیں اور اپنی مرضی سے ایک دوسرے کے ہو سکتے ہیں۔“

شہزادی کے چہرے پر ناگواری کی ایک لہر گزر گئی۔ ”ڈون! میں تم سے محبت ضرور کرتی ہوں لیکن اپنے والد کی اسیری اور اپنے ہم وطنوں کی غلامی کی قیمت پر تم سے شادی نہیں کر سکتی۔“

”انفٹا!“ ڈون کی آواز دُور تک گونجی مگر شہزادی اس طرح پُرسکون تھی جیسے کوئی سمندری چٹان لہروں کا شور سن کر خاموش رہتی ہے۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اگر مجھ سے شادی کرنا مقصود ہے تو میرے والد کو رہا کرو اور کٹائل کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ جس روز یہ دونوں شرطیں پوری ہو گئیں، میں خود بخود تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی، تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

ڈون کی حیرت پاش نظریں شہزادی کے چہرے پر جم کے رہ گئیں۔ آتش دان کے شعلوں کا عکس ابھی تک اس کے رخساروں پر لرزاں تھا۔ ڈون چند لمحے بت کی طرح ساکت و صامت کھڑا ہوا اُسے دیکھتا رہا جیسے اُسے اس کے وجود پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ پھر ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اتچھا، میں تمہاری تجویز کی ہی لیون بھیج دوں گا، اگر میرے والد نے منظور کر لیا تو میں تمہارے والد اور کٹائل دونوں سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے ایک چاہنے والے کا وعدہ۔“

شہزادی کے ہونٹوں پر پہلی بار ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کے ڈون کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اچھے ڈون! میں تمہیں اپنے والد کی قید سے رہا کر کے اپنی محبت کا ثبوت دے چکی ہوں۔ اب تمہاری باری ہے، تم بھی میرے والد کو آزاد کر کے اپنی محبت کا ثبوت دو۔“

ڈون کے چہرے پر جذبات کی کش مکش نے لکیریں بنا دیں۔ شہزادی نے اپنے باپ کی رہائی کا مطالبہ کر کے اُسے کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

کٹائل کے باشندے شہزادی سے صرف اس لیے ناراض تھے کہ اُس نے ڈون کو قید خانے سے نکال کے گویا ایک بھیڑیے کو رہا کر دیا تھا مگر جب انہوں نے سنا کہ شہزادی نے اپنی شادی کی شرط نواب فرزند کی رہائی اور کٹائل کی آزادی ٹھیکرادی ہے تو شہزادی نے اُن کے نزدیک روم کی قدیم دیویوں کا مقام حاصل کر لیا۔ انہوں نے نواب فرزند کے مجسمے کے ساتھ شہزادی کا بھی ایک حسین مجسمہ تیار کیا اور دونوں مجسمے کٹائل کے بڑے چوک میں نصب کر دیے گئے۔ کٹائل کے لوگ آج بھی فرزند ہی کو اپنا حکمران سمجھتے تھے، حالانکہ وہ لیون کے برترین قید خانے میں محبوس تھا۔ اب شہزادی بھی لوگوں کی عقیدت کا مرکز بن گئی تھی لیکن انہیں یقین نہیں تھا کہ لیون کا شاہ رامیر و شہزادی کی ایک بھی شرط ملنے پر تیار ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ رامیر و کس مزاج کا آدمی ہے۔ اُس نے اقتدار کی خاطر اپنے حقیقی بھائی کی آنکھوں میں دکھتی سلائیاں پھر وادی تھیں۔ صرف چند روز بعد لوگوں کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ رامیر و نے شہزادی کی دونوں شرطیں مسترد کر دیں اور ڈون کو پیغام بھیجا کہ قیدی فرزند و اب موت کے اندھیرے سے باہر نہیں آسکتا اور کٹائل والوں کی خود مہری کے لیے ہمارے پاس تلوار کے سوا کوئی انعام نہیں ہے، رہ گئی شہزادی انفساً تو وہ ہمارا نہیں ڈون کا مسئلہ ہے۔ اگر وہ اُس سے فتح کا حق وصول نہیں کرے گا تو یہ اُس کی کمزوری ہوگی، کٹائل کے ساتھ اب کٹائل کی شہزادی بھی اُسی کی ملکیت ہے۔ رامیر و کے اس پیغام نے کٹائل کے باشندوں کو اور مشتعل کر دیا۔ اُن کے تجربہ کار سرداروں نے فیصلہ کیا کہ لیون کے خلاف عبدالرحمن الناصر کی امداد حاصل کی جائے۔ اُن کے نزدیک نہ صرف ہسپانیہ بلکہ پورے یورپ میں قرطبہ کی حکومت ہی وہ فیصلہ کن طاقت تھی جو اپنی اقبال بندی اور عدل گستری کے باعث پڑوسی ملکوں اور ریاستوں کے باہمی جھگڑے غیر جانبداری سے فیصلہ کر سکتی تھی۔ عبدالرحمن الناصر خصوصاً عورتوں کی بے عزتی اور بے حجابی سخت ناپسند کرتا تھا اور اہل لیون کا سب سے بڑا جرم یہی تھا۔ اُن کے فوجیوں نے کٹائل کی عورتوں کو بے حجاب اور رسوا کیا تھا۔ انہیں وحشیانہ تفریح کا ذریعہ بنایا تھا کٹائل کے لوگوں کو یقین تھا کہ جب قرطبہ کے دربار میں اُن کا استغاثہ پہنچے گا عبدالرحمن الناصر

منظوموں کی حمایت کرنے سے دریغ نہیں کرے گا اور وہ بہت جلد عرب سواروں کے گھوڑوں کی ٹاپیں سن لیں گے مگر وہ شہزادی انفٹا کے مشورے کے بغیر کوئی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھے۔

ڈون اپنے باپ کا پیغام سن کے سخت پریشان ہو گیا تھا۔ شہزادی انفٹا نے اس سے محبت کا جو ثبوت طلب کیا تھا، وہ خطرے میں پڑ گیا اور جب تک ڈون وہ ثبوت فراہم نہ کرتا، اپنی محبوبہ کو حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے باپ سے مل کے رو بہ رو گفتگو کرے گا۔ ڈون کو پوری طرح احساس ہو گیا تھا کہ کٹائل کے لوگوں کی رائے برکتہ ہو چکی ہے۔ وہ نواب فرزندو کے سوا کسی دوسرے کا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اب اسے خود بھی حکومت اور محبت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔

کٹائل کے شاہی محل میں اس نے شہزادی سے ایک طویل ملاقات کی اور اسے بتایا کہ وہ اپنے باپ سے ملنے کے لیے لیون جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی یہ آخری کوشش بھی ناکام ہو جائے۔ مگر وہ انہیں رضامند کرنے کی ہر تدبیر پر عمل کرے گا۔ اس نے کہا، اگر وہ واپس نہ آسکا تو شہزادی کو سمجھ لینا چاہیے کہ نواب فرزندو کی طرح اسے بھی لیون کے بدترین اور منحوس قید خانے میں محبوس کر دیا گیا ہے۔

شہزادی نے اس سے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ وہ خاموش اور پرسکون تھی، مگر رخصت سے قبل اس نے ایک سوال کر کے ڈون کو شدید کر دیا۔ ڈون! یاد ہے۔ جب ہم نادار میں بیٹے تھے تو تم نے کہا تھا کہ ہماری محبت صرف اس صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ لیون اور کٹائل کو متحد کر کے دونوں کی نفرت کا رُخ قرطبہ کی طرف موڑ دیا جائے۔ عرب دونوں ریاستوں کے دشمن ہیں مگر میں تم سے صرف یہ دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ قرطبہ کے سلطان کے متعلق تمہاری ذاتی رائے کیسا ہے؟

ڈون نہیں جانتا تھا کہ شہزادی کے اس سوال کا مقصد کیا ہے مگر اس کی محبت اور دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کو کسی غلط فہمی میں نہ رکھے اور صحیح رائے کا اظہار کرے۔

اُس نے ٹھیرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ "انفٹا! جب نادار میں ہم پہلی بار ملے تھے اور میں نے عربوں کے خلاف لیون اور کٹائل کے اتحاد کی تجویز پیش کی تھی تو اس تجویز کا مقصد تمہارے حصول کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا میرے والد یا تمہارے والد میں سے کوئی بھی اس تجویز کی مخالفت نہیں کر سکے گا کیونکہ وہ دونوں صرف نامِ فردی کے لیے عربوں کے خلاف جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر دونوں میں سے کوئی بھی تمہارا میاابی حاصل نہیں کر سکتا۔ قرطبہ کی حکومت یورپ کی سب سے بڑی طاقت ہے اور اُس سے جنگ کرنا خودکشی کا دوسرا نام ہے۔ رہی عبدالرحمن الناصر کے متعلق میری ذاتی رائے تو میں اُسے ایک بہادر عادل اور رعایا کا خیر خواہ شخص سمجھتا ہوں۔ وہ مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر سب سے انصاف کرتا ہے اور مظلوموں کی حمایت کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہتا ہے۔"

شہزادی نے پُر عزم لہجے میں کہا۔ "ڈون! اگر تمہاری رائے درست ہے، تو اب تم بے فکر ہو کے لیون جاؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اگر میرے والد کی طرح تمہیں بھی کسی تنگ، سرد اور تاریک قید خانے میں پھینک دیا گیا تو میں تم دونوں کو وہاں سے نکال لاؤں گی۔"

ڈون نے محبت کے جوش سے مغلوب ہو کر شہزادی کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اس کے باقوتی ہونٹوں کو طویل وادری۔ شہزادی نے کوئی مزاحمت نہیں کی کیوں کہ ان کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے اور اس مرتبہ وہ پھر ایک نئے عزم کے ساتھ رخصت ہو رہے تھے۔ ڈون نے شہزادی کو اوداع کہا اور اپنے محافظ سواروں کے جلو میں لیون روانہ ہو گیا۔ برف پوش چوٹیوں پر چمکتے سورج نے اُسے کٹائل سے بھلتے دیکھا اور شاہی محل میں شہزادی کے خاص کمرے کا درجہ بند ہو گیا۔ شہزادی لپٹی تو ایک خادمہ کمرے میں موجود تھی۔ وہ کٹائل کے سرداروں کے قائد کی ملاقات کے لیے اجازت لینے آئی تھی شہزادی نے اُسے فوراً طلب کر لیا۔ سرداروں کا قائد نواب فرزندو کی رہائی اور کٹائل کی آزادی کے لیے عبدالرحمن الناصر سے امداد کی تجویز لے کر آیا تھا۔ شہزادی کچھ دیر تک اس سے گفتگو کرتی رہی۔ اُسے بتایا گیا کہ عبدالرحمن الناصر نامارک ملک تھیوڈا پر بہت

اعتماد کرتا ہے۔ اس لیے اگر ملکہ کی سفارش حاصل کر لی جائے تو کسٹائل کو قریب سے امداد مل سکتی ہے۔ شہزادی نے سرداروں کے قائد کو فوراً نادر روانہ کر دیا۔ اُسے یقین تھا کہ ملکہ تھیوڈا اس مشکل کلفت میں ضرور کسٹائل کے کام آئے گی



کسٹائل میں رامیرو کے تسلط کے خلاف آزادی کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ لوگوں نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ نواب فرزندو کے بے جان مہتے کو اپنا آقا تسلیم کر سکتے ہیں لیکن لیون کے کسی شخص کو حکمران نہیں مان سکتے۔ دوسری طرف شہزادہ ڈون لیون کے دربار میں پیش ہوا۔ اُس نے نواب فرزندو کی رہائی کی سفارش کی۔ اُس کا باپ رامیرو غیظ و غضب میں دیوانہ ہو گیا۔

”ڈون! ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے نادان بکلو گے۔ اور اس دشمن کی رہائی کا مطالبہ کرو گے جسے تمہاری جان لینے میں بھی کوئی دریغ نہیں تھا۔ غور سے سن لو، اگر تم کسٹائل کے معاملات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تو تمہاری جگہ ہم شہزادہ سانکو کو کسٹائل کی حکومت بخش دیں گے اور وہ کسٹائل کے ساتھ شہزادی انفسا کا مالک بھی قرار پائے گا کیونکہ انفسا ایک مفتوحہ ریاست کی شہزادی ہے۔“

ڈون کا ہاتھ تلوار کے قبضے پر پہنچ گیا۔ اُس نے جوش سے کہا: ”آپ کسٹائل کی حکومت جسے چاہیں بخش دیں لیکن شہزادی انفسا میری محبت، میری عزت، میری زندگی ہے سانکو کو اس کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے میری تلوار سے مقابلہ کرنا ہوگا۔“

شہزادہ سانکو لیون کے سابق بادشاہ اور ملکہ تھیوڈا کا بیٹا تھا۔ ملکہ تھیوڈا اپنے شوہر کی وفات کے بعد تخت نشینی کے جھگڑوں سے تنگ آ کر نادر چلی گئی تھی اور اپنے بھائی کی وفات کے بعد ریاست نادر کی ملکہ بن گئی۔ پھر جب لیون کے تخت پر رامیرو نے قبضہ

کیا تو ملکہ تھیو ڈا سے اس کے اختلاف اور گہرے ہو گئے لیکن اس کا بیٹا شہزادہ سانکو بدستور لیون میں رہا۔ اس نے رامیرو کی اطاعت قبول کر لی تھی اور جنگوں میں اس کے شانہ بشانہ شریک ہوتا تھا۔ اب کسٹائل کا جھگڑا سامنے آیا تو رامیرون نے یہی مناسب سمجھا کہ بیٹے کی جگہ اپنے بھتیجے سانکو کو مفتوحہ ریاست کا حاکم بناوے۔ شہزادہ سانکو کسٹائل کی حکومت سنبھالنے کے لیے فوراً آمادہ ہو گیا لیکن وہ شہزادی انفٹا سے کوئی سروکار رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے شاہ رامیرو کے سامنے تجویز پیش کی کہ اگر وہ نواب فرنڈو کو رہا کرنا مناسب نہیں سمجھتا تو شہزادی انفٹا کو بھی لیون طلب کر لے کیوں کہ اس کی موجودگی میں کسٹائل کے معاملات کبھی درست نہیں ہو سکتے۔ ایک اطلاع کے مطابق کسٹائل کے باغیوں کی اہل رہنما وہی تھی۔ ڈون نے چیخ کے کہا کہ اگر شہزادی کو اس کی مرضی کے بغیر لیون لایا گیا تو وہ بغاوت کر دے گا۔

شاہ رامیرون نے محسوس کیا کہ کسٹائل کے جھگڑے کی اصل جڑ نواب فرنڈو ہے۔ نواب اس کی تخت نشینی کے وقت سے مسلسل فساد آرائی کر رہا تھا۔ اس نے لیون کے اقتدار کے خلاف ہمیشہ تلوار بلند کی اور ہر وقت خانہ جنگی پر آمادہ رہا۔ اس نے ڈون کو دھوکے سے گرفتار کیا اور اب اگرچہ خود گرفتار ہو گیا تھا لیکن اس کا وجود رامیرو کے لیے بے سکونی کا باعث بنا ہوا تھا۔ رامیرون نے عزم کر لیا کہ وہ کسٹائل کا جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ خود اس کا بیٹا یہ فیصلہ قبول کرتا ہے یا نہیں۔ وہ نہایت خوفناک انداز میں تخت سے اٹھا اور درباریوں سے مخاطب ہو کے کہنے لگا۔

”کیا کوئی شخص ہمیں بتا سکتا ہے کہ فرنڈو نے ہمارے ساتھ دشمنی کے سوا کبھی دلی کاسلوک کیا ہو؟“

درباریوں میں سے کوئی شخص بھی ایسی مثال پیش نہیں کر سکا۔ سب کا متفقہ فیصلہ یہی تھا کہ فرنڈو لیون کا بدترین دشمن ہے اور ہمیشہ تلوار کی نوک سے گفتگو کرتا ہے۔ رامیرو نے اعلان کر دیا۔ ”ہم بھی اب تلوار ہی استعمال کریں گے۔ ایسٹری مبارک تقریب کے

روز کٹائل کے معزول نواب فرزند کو قلمم کر دیا جائے گا۔“

دربار میں سناٹا چھا گیا۔ شاہ رامیر و درباریوں کو شدید چھوڑ کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ لیون کے سرداروں کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ فرزند کا انجام کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذمہوں کو معاف کرنے کے قائل نہیں تھے۔ اُن کے نزدیک فرزند کو اسی روز جہنم کر دینا چاہیے تھا۔ جب وہ پہلی بار ایک قیدی کی حیثیت میں رامیر کے حضور پیش کیا گیا لیکن اب اُس کا قتل یقیناً شہزادہ ڈون کو بغاوت پر آمادہ کر سکتا تھا۔ ڈون فرزند کی بٹی سے دیوانہ وار محبت کرتا تھا اور اس کی رہائی کی سفارش بن کے آیا تھا۔

درباریوں نے رخصت ہونے سے پہلے ڈون کو دیکھا۔ ڈون شدید غصے کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اُس کے باپ نے اس کی سفارش ہی مسترد نہیں کی بلکہ نواب کے قتل کا حکم صادر کر کے یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ لیون کا ولی عہد کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بہت اچھا۔ اُس نے سوچا، وہ اپنے باپ کو بہت جلد اپنی حیثیت سے آگاہ کر دینگا۔ اسی لمحے ایک ہاتھ نے نرمی سے اُس کے کندھے پر دباؤ ڈالا۔ ڈون نے پلٹ کے دیکھا شہزادہ سانکو اس کی پشت پر کھڑا تھا۔ وہ دونوں دربار میں تمہارے گئے تھے۔

”ڈون! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ کوئی غلط قدم نہ اٹھانا۔“

”مگر نواب فرزند کو قتل کا فیصلہ میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ اس فیصلے سے میری سخت توہین ہوئی ہے۔ مجھے بھرے دربار میں ذلیل کیا گیا ہے۔ اب میں انفساً کو کیا منہ دکھاؤں گا۔“ ڈون ناقابل بیان اذیت سے دوچار تھا اور ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے

مگر کوئی نہ کوئی فیصلہ بہر حال کرنا تھا۔ ایسٹر کی تقریب میں صرف ایک مہینہ رہ گیا تھا اور اُس کے پاس قسمت آزمائی کے لیے گنتی کے بیس دن باقی تھے۔ سانکو نے سرگوشی میں کہا۔ ”ڈون! اگر تمہیں کوئی فیصلہ کرنا ہے تو قید خانے کا محاصرہ

کو اور نواب فرزند کو موت کے زمین و وزاندھیرے سے نکال کر اپنی تحویل میں لے لو۔ تمہارا مدعا پورا ہو جائے گا تو تم اپنے والد سے مصالحت کی گفتگو کر سکتے ہو۔“ ڈون کی

آنکھوں میں ایک نئے عزم کی چمک نمودار ہوئی۔



ملکہ تھیوڈا کی سفارش کے ساتھ شہزادی انفٹانے عبدالرحمن الناصر کو یہ پیغام

روانہ کیا۔

”محترم سلطان! آپ بے نواؤں کی نواسنتے اور منگولوں کی حمایت کرتے ہیں۔ میرے والد کٹائل کے حقیقی والی نواب فرزند و آج کل لیون کے شاہ رامیرو کی قید میں ہیں۔ لیون کے شاہ نے انہیں کٹائل پر حملہ کر کے گرفتار کر لیا تھا۔ بزرگ سلطان! کنیز جانتی ہے کہ نواب فرزند و آپ کے دشمن ہیں مگر ان کی اسیری کے بعد کثیر باپ کی شفقت سے محروم ہو گئی ہے اور آپ کو ان کے مقام پر تصور کر کے التجا کرتی ہے کہ آپ ایک بے سہارا بیٹی کے سر پر شفقت کا سایہ کیجئے اور میرے منگولوں والہ کو اس موت سے نجات دلائیے جو ایسٹر کی تقریب پر ان کے لیے مقرر کر دی گئی ہے۔ میرا پیغام بعض تفصیلاً زبانی گوش گزار کرے گا۔ آخر میں صرف یہ عرض کروں گی کہ ایک بیٹی نے اپنی فریاد باپ کے کانوں تک پہنچا دی ہے اور اس کا دل اس یقین سے لبریز ہے کہ سلطان کی طرف سے مدد ضرور آئے گی“

آپ کی بیٹی شہزادی انفٹا آف کٹائل

ناممکن تھا کہ ایک بیٹی کا پیغام باپ کے دربار میں پہنچے اور وہ تڑپ نہ اٹھے۔

عبدالرحمن الناصر نے اسی وقت اپنے سپہ سالار کو حکم دیا کہ وہ فوراً لیون کی طرف سیاہ رولانڈ کرے اور نواب فرزند و کو قید سے نجات دلائے۔ اس نے سپہ سالار کو یہ ہدایت بھی کر دی کہ یہ ہم ایسٹر

سے پہلے کامیابی کے ساتھ مکمل ہو جاتی چاہیے تاکہ نواب کے قتل کا فیصلہ عملی جامہ نہ پہن سکے۔ شہزادی انفسا کے قاصد کو اُس نے اس جواب کے ساتھ رخصت کر دیا کہ "ایک بیٹی نے باپ کو جو درخواست بھیجی ہے، اُس کے جواب کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ درخواست کا عملی جواب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی۔"

قاصد نے کٹائل کے شاہی محل میں حاضر ہو کے شہزادی انفسا کو قرطبہ کے دربار کی روداد اور سلطان کی پدرانہ شفقت کی کہانی سنائی۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ عرب لشکر اُس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو چکا ہے۔ اپنی درخواست کی اس قدر پزیرائی پر شہزادی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اُس نے بھاگ کر اپنی ماں کو یہ مژدہ سنایا۔ اُس کی ماں کی نظر بندی ختم کر دی گئی تھی۔

عرب لشکر پہنچنے کی خبر پر لگا کر رامیر و تک پہنچ گئی۔ وہ جانتا تھا کہ کٹائل کے لوگ عربوں کے دشمن ہیں لیکن اس موقع پر نواب کی رہائی کے لیے وہ یقیناً عربوں کا ساتھ دیں گے اور ہو سکتا ہے، لیون کے خلاف عربوں کے ساتھ کوئی فوجی معاہدہ بھی کر لیں۔ اس تمام کارروائی میں نادار کی ملکہ تھیوڈانے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ عربوں کے حملے کی صورت میں رامیر و نادار کی مدد سے بھی محروم ہو گا۔ رامیر و نے حالات کی اس جھانک صورت حال پر غور کیا تو اُس کے دل پر پہاڑوں کا بوجھ آ پڑا۔ وہ مخالفت کے ان طوفانوں میں عربوں سے لڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کٹائل اور نادار کے علاوہ خود اُس کا ولی عہد ڈون اس کے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا۔ ڈون، نواب فرنڈو کو رہیں دوز قید خانے سے رہا کرانے کی کوشش میں ناکام ہو کے دڑوں کی طرف بھاگ گیا تھا۔ نواب فرنڈو کی موت کے اعلان کے ساتھ ہی قید خانے پر فوج کا زبردست پہرا لگا دیا گیا تھا۔ اب ڈون پہاڑی علاقوں میں اپنی علیحدہ جمعیت فراہم کر رہا تھا۔ رامیر و کو اپنے ناراض بیٹے کی کشتی کا بھی سامنا تھا۔ حالات بے حد صدمہ شکن تھے اور اُنہیں سمجھانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ رامیر و پشت پر ہاتھ باندھے بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ سوچتے سوچتے وہ اچانک ایک جگہ ساکت ہو گیا۔ اس کے ذہن میں عجیب تدبیر آئی۔ اُس نے سوچا کہ جب وہ عربوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا

تو کیوں نہ نواب فرزندوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے اور اُسے عربوں کی طرف متوجہ کرنے کی بجائے اپنا دوست بنائے۔ اس تدبیر پر عمل کر کے وہ عربوں اور مقامی ریاستوں کے درمیان نفرت کی پرانی دیوار بدستور قائم رکھ سکتا تھا۔ یہ ایک اندھی چال تھی اور اُسے شبہ تھا کہ نواب فرزندوں کی بدلتا ہوئیں دیکھ کے شاید اُس کی پیش کش قبول نہ کرے لیکن اُسے یاد آیا کہ قہر جیسے تنگ و تاریک قید خانے میں نواب کو یہ خبر کیسے پہنچ سکتی ہے کہ عرب لشکر محض اُس کی رہائی کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔

لوطی کی طرح چالاک اور عیار رامیرونے فوراً فرزندوں سے ملاقات کا فیصلہ کر لیا اُسی روز زمین دوز قید خانے میں نواب فرزندوں کی قبر ناک تارک کو ٹھٹھری کا دروازہ کھلا۔ سپاہی قیدی کو لے کر باہر نکلے۔ اس ملاقات کا اہتمام قید خانے ہی کے ایک گوشے میں کیا گیا تھا کیونکہ رامیرونے دشمن کو اس وقت تک سورج کی روشنی دکھانے کے لیے تیار نہیں تھا جب تک وہ اس کی شرط قبول نہ کرے۔

نواب تنہائی کی اس اذیت ناک قید میں بے حد کمزور ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اس کے باوجود اُس نے حالات کے سامنے ابھی تک شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ شاہ رامیرونے ایک نیم تارک گوشے میں نہایت سرد مہری سے اُس کا خیر مقدم کیا اور بتایا کہ اگر وہ دو باتوں پر رضامند ہو جائے تو اُسے رہائی نصیب ہو سکتی ہے۔ گفتگو کے دوران رامیرونے اہتمامی مصالحت آمیز تھا۔ نواب خاموشی سے اُس کی باتیں سننا رہا۔ رامیرونے یہ شرائط پیش کیں :-

۱۔ کسٹائل لیون کا باج گزار رہے گا اور لیون کا شاہ اُس کا اعلان حکمران ہوگا۔

۲۔ نواب اپنی بیٹی انفسا کی شادی شہزادہ ڈون سے کرے گا اور ریاست

کسٹائل بیٹی کے جہیز میں لکھو دے گا۔

رامیرونے کی عیاری کے مقابلے میں نواب نے بھی کچھ عیاری ضروری سمجھی۔ اُس نے کہا کہ وہ کسٹائل کا خود مختار حکمران ہوگا اور اسی شرط پر اپنی بیٹی کی شادی ڈون سے کر سکتا ہے۔ کسٹائل کی ریاست شہزادی کے جہیز میں نہیں لکھی جائے گی۔ گویا رامیرونے مقصد

ہیں کامیاب ہوا۔ اُس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "نواب فرزندو! ہمیں آپ کی خود مختاری کی شرط منظور ہے لیکن یہ وعدہ کیجئے کسٹائل لیون کا خیر خواہ رہے گا اور دشمن کے خلاف اس کے شانہ بہ شانہ لڑے گا۔"

فرزندو نے یہ بات منظور کر لی اور لیون کی خیر خواہی کا اقرار کیا۔ اسی وقت زمین دوز قید خانے کے دروازے کھل گئے اور رامیر و فرزندو کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے باہر نکلا۔ وہاں سے وہ دونوں شاہی محل پہنچے۔ محل میں انہوں نے صلح کے معاہدے پر دستخط کیے۔ معاہدے کی رُو سے کسٹائل کی آزاد حیثیت تسلیم کر لی گئی اور ڈون کے ساتھ شہزادی انفسا کی شادی کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ صلح رامیر و کی سیاسی کامیابی تھی۔ اُس نے فرزندو سے دوستی کر کے عرب یلغار بے مقصد بنادی اور ڈون کے حلافہ شہزادی انفسا کی خوشنودی بھی حاصل کر لی۔ اس معاہدے کی تشہیر ہوئی تو عرب لشکر و دیباٹے تاگوس کے کنارے رک گیا۔ شاید اس کی روانگی کا مقصد پیدا ہو گیا تھا۔

نواب فرزندو کی رہائی اور کسٹائل میں واپسی ایک یادگار واقعہ تھا۔ کسٹائل کے لوگوں نے ایسے جوش و خروش سے اُس کا استقبال کیا جیسے وہ کسی قید خانے سے رہا ہو کر نہیں بلکہ کوئی عظیم الشان تلوغ فتح کر کے لوٹا ہو۔ فیصل شہر سے شاہی محل تک طویل راستے میں دونوں طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ نعروں سے پورا شہر گونج رہا تھا۔ فرزندو کی راہ گزر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھول پھتے تھے۔ مکالوں کے در پھول سے فرزندو پر سکتے، زیور اور پھول نچھاور کیے جا رہے تھے۔ کسٹائل میں کئی روز تک جشن کا سماں رہا۔ رات کو چراغاں ہوتا تھا اور دن کو پھریرے لہراتے تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نواب فرزندو کا شمار عربوں کے بدترین دشمنوں میں ہوتا تھا لیکن شاہی محل پہنچ کر جب اُسے اپنی رہائی کے سلسلے میں شہزادی انفسا اور سرداروں کی کوششوں کا علم ہوا تو یہ حقیقت اُس کے سامنے آ گئی کہ رامیر و نے محض عرب لشکر کے خوف سے اُسے رہا کیا اور فریب سے صلح کے معاہدے کا پابند بھی بنا لیا ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے اُس کے لیے یہ امر نہایت تکلیف دہ ہو گیا کہ وہ اپنی بیٹی ایک دشمن

خاندان میں بیاہنے پر مجبور ہے۔ لوگ اُسے یہ طعنہ دے سکتے تھے کہ اُس نے اپنی رہائی بیٹی کے عوض خریدی ہے لیکن صرف یہ حقیقت اس تکلیف کا احساس کم کر دیتی تھی کہ شہزادی انفسا ڈون سے محبت کرتی ہے۔ کسٹائل کے لوگ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ مسرت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مصیبت کے ایام میں عبدالرحمن الناصر نے دشمن ہونے کے باوجود اُس کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا اور انفسا کی درخواست پر جو کارروائی کی تھی وہ ایک حقیقی باپ کی غیرت کا اظہار تھا۔ فرزندوں نے محسوس کیا کہ عبدالرحمن نے ایک اسی بازی جیت لی ہے جس کے سامنے شہروں اور قلعوں کی فتوحات بیچ ہیں۔

دونوں ریاستوں کے باشندے روز روز کی چپقلش سے تھک چکے تھے۔ جنگ نے خوف دہرا س کی جو گھٹا ایک زمانے سے اُن پر مسلط کر رکھی تھی اب وہ بتدریج چھٹ رہی تھی۔ فرزندوں کی رہائی اور چھوٹی انفسا کی ہونے والی شادی کی خبر نے کسٹائل کے لوگوں میں لیون کی فوجوں کے لگائے ہوئے زخم بڑی حد تک مندمل کر دیے تھے۔ چند روز بعد حالات معمول پر آئے تو دونوں ریاستوں میں ڈون اور انفسا کی شادی کے انتظامات ہونے لگے۔ اس طرح کسٹائل میں اُس جشن کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا جو لوہاب فرزندوں کی واپسی پر برپا ہوا کسٹائل کے علاوہ لیون میں بھی دن رات میلا سا لگا رہنے لگا۔ دکانیں قیمتی ملبوسات سے اور باغ پھولوں سے عالی ہوتے جا رہے تھے۔ شادی کی تاریخ سے چند روز قبل شہزادہ ڈون اپنی حسین محبوبہ کو لینے کے لیے نہایت دھوم دھام سے کسٹائل کی طرف روانہ ہوا۔ رات کے لیے جلوس میں ڈون کا عربی گھوڑا سب سے زیادہ سجا ہوا تھا۔

جب آرزوؤں کا یہ قافلہ ریاست کسٹائل کی سرحد میں داخل ہوا اُسے پورے شاہانہ اعزاز کے ساتھ شہر لایا گیا۔ فیصلی شہر کے دروازے پر لوہاب فرزندوں اور بڑی انفسا نے بے نفس نظریں اپنے ہونے والے داماد کا استقبال کیا۔

لوگ یہ عجیب منظر حیرت سے دیکھ رہے تھے کیوں کہ ڈون وہی شخص تھا جسے فرزندوں نے اپنے زنداں میں ڈال دیا تھا۔ کسٹائل کے لوگوں کا خیال تھا کہ شاہ رامیر و خیر سگالی کے اظہار کے طور پر رات کے جلوس میں خود موجود ہوگا مگر ڈون کو تنہا دیکھنے کے

انہیں مایوسی ہوئی۔ نواب فرزند و اور ملکہ کو بھی اپنے لوگوں کے سامنے سبکی محسوس ہوئی۔ لیون کے وزیر نے شاہ رامیرو کی اچانک علالت کا بہانہ بنا کے ان کا تکرر دور کرنے کی کوشش کی مگر رامیرو اگر علیل ہو گیا تھا تو شادی کی تاریخ بڑھانے کا فیصلہ بھی تو کر سکتا تھا۔ ریاست کسٹائل کے عظیم اشراف قصر میں زندگی گزار کر کسی پر بیٹھا لیون کا شہزادہ ڈون اپنی دلہن کی رونمائی کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ دونوں ریاستوں کے درباری امراء حکام اور فوج کے بڑے بڑے سردار اس کے اطراف بیٹھے تھے۔ سب سے اونچی کرسی پر فرزند و جلوہ افروز تھا۔

پہلے ڈون کی نظر ملکہ تھیوڈا پر پڑی۔ ملکہ دلہن کو سہارا دینے آہستہ آہستہ دوٹھا کی طرف لا رہی تھی۔ شہزادی کا حسن و جمال دیکھ کے براتیوں کی آنکھیں دنگ رہ گئیں۔ دلہن شہزادی گلابی عبا پہنے تھی۔ سر پر سونے کا چمکتا ہوا تاج رکھا تھا۔ ملکہ اور دلہن کے عقب میں شہزادی کی ماں باوقار انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ شہزادی کو ایسی احتیاط سے ڈون کے پہلو میں رکھی کرسی پر بیٹھایا گیا جیسے ذرا بھی ٹھیس لگی تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ پھر کسٹائل کے سب سے بڑے پادری نے دو دشمن خاندانوں کے دکھا اور دلہن کو ازدواجی رشتے میں منسلک کر دیا۔ ہر سمت سے مبارک سلامت کا شور بلند ہوا اور اتنے پھول نچھاور کیے گئے کہ شہزادی اور شہزادہ ان میں چھپ گئے۔

روایت کے مطابق دوٹھا کو چند دن اپنی سسرال میں قیام کرنا چاہیے۔ مگر کسٹائل کے لوگوں کے دلوں پر اس وقت افس پڑ گئی جب نکاح اور شاہی طعام کے فوراً بعد شہزادہ ڈون نے واپسی کا اعلان کر دیا۔ نواب فرزند و اور ملکہ نے اسے شکایتی نظروں سے دیکھا لیکن ڈون اپنے باپ شاہ رامیرو کے حکم کے مطابق فوراً واپسی کے لیے مجبور تھا۔ چنانچہ چراغ جلنے سے پہلے کوچ کا بگل بج گیا۔ نواب فرزند و اتنا پریشان ہوا کہ اس نے اپنی دلہن بیٹی کو روکنے کا فیصلہ کر لیا مگر ملکہ تھیوڈا اور ملکہ انفٹانے اسے کھل کا مشورہ دیا۔ لیون کی فوجوں کی بلغار سے نواب فرزند و کے فوجی

نظم و نسق کا شیرازہ بچھ چکا تھا۔ وہ اس موقع پر شاہ رامیرو سے کسی قسم کی عداوت کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔ چنانچہ نواب کو باؤلِ ناخواستہ اپنے داماد اور بیٹی کو فصیل شہزادہ کی رخصت کرنے کے لیے آنا پڑا۔ وداع کا منظر بہت دلگداز تھا۔ نواب کا سر جھکا ہوا تھا، ملکہ انفسا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ واپسی کا قرنا پھونکا جا چکا تھا۔ شہزادی بے اختیار اپنے اُاس باپ سے چپٹ گئی اور ہنسی بچھو کی طرح ہلک ہلک کر رونے لگی۔ نواب نے اُس کی کمر تھپ تھپائی اور اس کے آنسو پیچھے۔ 'جاؤ، خداوند تمہارا نگہبان ہے۔' نواب فرزندوں نے شکستہ آواز میں کہا۔

بیٹی نے رخصت ہوتے وقت باپ سے ایک بات کہنا ضروری سمجھی۔ وہ سدی ہوئی آواز سے بولی۔ 'میں آپ کی عزت کو تماشاً بنانے کا تصور تک نہیں کر سکتی۔'

نواب کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اُس نے مسکرا کے صرف اتنا کہا 'ڈون اب ہمارا فرزند ہے۔ جاؤ، ایک حسین زندگی تمہاری منتظر ہے۔'



لیون کے شاہ رامیرو نے پورے طسراق سے مسلح دستوں کے ساتھ شہر سے باہر آ کے ہرات کا استقبال کیا۔ اُس نے اپنی بہو شہزادی انفسا کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور بے شمار قیمتیں تحائف سے نوازا۔ پھر خود اپنی معیت میں اُسے شاہی محل لے گیا۔ دہن کی شبِ عروسی کے لیے محل کا سب سے شان دار گوشہ منتخب کیا گیا تھا۔ شہزادہ ڈون راستے بھر شہزادی کے ساتھ رہا تھا۔ شہزادی کو دیکھ کر اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُس نے ساری دنیا فتح کر لی ہو۔ سفر میں اُسے اپنی ٹبتوں کے اظہار

کا موقع نہیں مل سکا لیکن یہ کیا کم تھا کہ اُس کی محبوبہ اس کے قریب تھی۔ لیون ہنچتے ہی وہ بے شمار سہانی راتوں کا مالک ہو گیا تھا۔ اُس کے لب، اس کے بازو شہزادی کو وارِ حُسن دینے کیلئے پھڑک رہے تھے اور اب کچھ دیر نہیں تھی۔

عروسی جوڑے میں ملبوس شہزادی اپنے شہزادے کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اس کی نظریں دروازے پر جمی تھیں۔ یکایک ریشمی پردوں میں ہلچل ہوئی۔ شہزادی کے رخسار انار کی طرح لال ہو گئے۔ مگر جیسے ہی اُس نے سر اٹھایا اناروں کا رنگ اڑ گیا۔ آئے مالا اس کا شوہر نہیں بلکہ شاہ رامیرو تھا۔ شہزادی نے اُسے تعظیم دی۔ شاہ رامیرو کی افسردہ آواز ایوان میں گونجنے لگی۔

”ہمیں معلوم ہے انفساً! تمہیں اس وقت ڈون کا انتظار ہو گا مگر ہم افسوس کے ساتھ تمہیں خود یہ اطلاع دیتے آئے ہیں کہ شہزادے کو ہم نے لیون کی افواج کے ساتھ ایک اہم اور ضروری مہم پر روانہ کر دیا ہے۔ کچھ دیر ہوئی ہمارے مجسروں نے ہمیں یہ تشویش ناک اطلاع پہنچائی ہے کہ شمالی سرحد پر گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ تم جانتی ہو ریاست اور حکومت کے معاملات تمام جذبات سے بالاتر ہوتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے، شہزادہ ڈون کامیاب و کامران ہو کر بہت جلد واپس آجائے گا۔“

شہزادی کا ماتھا ٹھنکا۔ شاہ رامیرو فوراً واپس چلا گیا۔ شہزادی نے اتنی عمر صرف پھول سوگھنے، ساز بجانے اور بدن پر رنگا رنگ ملبوسات سجانے میں نہیں گزاری تھی۔ شاہ رامیرو کے لفظوں میں چھپی ہوئی تلخی اُس کے بدن میں گھل گئی۔ چھوٹی انفسانے پوری استقامت سے اپنے نسر کا یہ فیصلہ سنا اور اپنے کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اس کا رتبہ ایک شہزادی کا نہیں ہے اور وہ نواب فرزند کی بیٹی نہیں ہے۔

ہفتے گزر گئے، ڈون واپس نہیں آیا۔ شاہ رامیرو اپنی بہو کو سامنے بٹھا کے چہرے کے رنگ دیکھتا رہا اور اُسے ڈون کی مہم جوئیوں کی اطلاعات پہنچاتا رہا۔ شہزادی ہر رات عروسی جوڑا اپن کے شہزادے کا انتظار کرتی رہی۔ محل میں دنیا بھر کی چیزیں

میٹر تھیں، صرف ڈون نہیں تھا اور ڈون کے بغیر کچھ بھی نہیں تھا۔ ریاست لیون میں زندگی معمول پر تھی۔ شاہی محل میں بھی شمالی سرحدوں پر ہونے والی گڑبڑ پر کوئی خاص تشویش نہیں پائی جاتی تھی۔ البتہ سلطان عبدالرحمن ایباصری کی بڑھتی ہوئی فتوحات اور قرطبہ کی عظمت و شوکت کی داستانیں محل میں بہت تجسس اور تردوسے سنی جاتی تھیں اور ڈون نہیں آنے پاتا تھا۔ جلد ہی شہزادی کو اندازہ ہو گیا کہ اُس کا خسر شاہ رامیرو اپنے دل عہد بیٹے اور بہو کے لیے کس قسم کے جذبات رکھتا ہے۔ اُس کے بیٹے نے فرزند و کے لیے اپنے باپ کے خلاف سرکشی کی تھی اور وہ خود اس کے دشمن بن اب فرزند کی بیٹی تھی۔ فرزند نہ صرف زندہ تھا بلکہ ریاست کسٹائل کے تخت پر بیٹھا اپنی بھری ہوئی فوجیں دوبارہ منظم کر رہا تھا۔ شاہ رامیرو لے جو قید خانہ خاص طور پر فرزند و کے لیے بنوایا تھا وہ خالی پڑا تھا۔ اُس نے فرزند و کو آزاد کرتے وقت جتنا اپنا دماغ وسیلہ کیا، دل اتنا کشادہ نہیں کیا تھا۔ اب نواب فرزند و کی بیٹی اس کے محل میں تھی۔ وہی لڑکی جس نے اپنے باپ کی آزادی کے لیے سلطان عبدالرحمن سے شکایت کی تھی اور ایک فاتح کا سر مفتوح کے سامنے جھکوا یا تھا۔ وہ ڈون کو غیر ضروری معرکوں میں الجھا کے ان فٹلے سے دور کئے ہوئے تھا۔ شہزادی نے ان تلخ حقائق کے باوجود اپنے خسر کی تعظیم و تکریم میں کوئی کمی نہیں کی، اُسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن شاہ کے دل کا غبار ضرور چھٹ جائے گا۔ ڈون آخر تک ریاست سے دور رہے گا اور کب تک شاہ کا نفس اس لذت سے آسودہ ہوتا رہے گا مگر یہ محض اُس کی خوش خیالی تھی۔ ڈون کو گئے کئی مہینے ہو گئے اور شاہ رامیرو کے لبوں پر پھیلنے والی سکراہٹ گہری ہوتی گئی۔

پھر اُس نے ایک دن بہو کے سامنے حیرت انگیز انکشاف کیا کہ اُسے ریاست لیون کے خلاف ملکہ تھیوڈا کی سازش کی خبر ملی ہے۔ شہزادی انفساً جانتی تھی کہ ایک طرف رامیرو نے ڈون کو نادر کی سرحد پر الجھانے کا ہانا تلاش کیا ہے اور دوسری طرف نادر پر اپنی حکومت کا خواب پورا کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔

دوسرے ہی روز شاہ رامیرونے دربار میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ اُس نے لیون اور نادار کے حقوق و اختیارات کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ کسٹائل کے بعد نادار بھی اس کی بالادستی تسلیم کر لے اور وہ ساری شمالی پٹی پر قابض اور متصرف ہو کے فرانس اور اندلس کے درمیان حائل ہو جائے تاکہ یورپ کے سفیر قرطبہ پہنچنے کے لیے راہ داری کا پروانہ اُس سے حاصل کریں۔ دراصل وہ قرطبہ کا فرانس، روم، جرمنی اور قسطنطنیہ تک بڑھتا ہوا اثر و رسوخ روکنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اُس نے نادار کے خلاف سرحدی چھیڑ چھاڑ کا آغاز کر دیا تھا۔ تاکہ بات بڑھے اور اُسے نادار پر چڑھائی کرنے کا جواز مل جائے۔ شاہ رامیرونے ملکہ تھیوڈا کی جگہ اُس کے بیٹے سانکو کو نادار کا حاکم بنانا چاہتا تھا تاکہ وہ کسی موقع پر کہیں لیون کے تخت کا دعویدار بن کے نہ ابھرے۔ رامیرونے اس بات کا بھی غم تھا کہ سلطان عبدالرحمن الناصر سے ملکہ تھیوڈا کے غیر رسمی مراسم کیوں ہیں؟

رامیرونے نادار کے خلاف ایک سازش تیار کی اور اس میں ملکہ تھیوڈا کے بیٹے سانکو ہی کو مہرہ بنایا۔ شہزادی انفٹا کو جب اس سازش کا علم ہوا تو اُس نے پہلی بار عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے اپنا ایک معتبر غلام نادار کی طرف دوڑایا۔ اور ملکہ تھیوڈا کو اُس حملے سے آگاہ کیا جو شہزادہ سانکو کی قیادت میں نادار پر ہونے والا تھا۔ شاید شاہ رامیرونے اس بات سے آگاہ نہیں تھا کہ قرطبہ نے ریاست نادار کی حفاظت کا معاہدہ کر رکھا ہے۔

ملکہ کو جیسے ہی لیون میں ہونے والی سازش کی اطلاع ملی، اُس نے ایک تیز رفتار قاصد قرطبہ کی طرف روانہ کیا اور عبدالرحمن الناصر سے درخواست کی کہ اب اُس کے وعدے کے ایفا کا وقت آ گیا ہے جو اُس نے ضرورت کے وقت نادار کی حفاظت اور امداد کے لیے کیا تھا۔

شاہ رامیرونے خلاف کئی شکایات قرطبہ پہنچ چکی تھیں یہ پیغام ملتے ہی عبدالرحمن الناصر نے لیون پر فیصلہ کن ضرب لگانے کے احکام جاری کر دیے۔ سلطان نے اس

ہم کے لیے اپنے وفادار بہادر منتخب کیے۔ یہ وفادار بہادر اُس کے حکم پر جانیں لڑا دینا اپنے لیے فخر کا باعث سمجھتے تھے۔ عبدالرحمن کا لشکر آمدھی اور طوفاں کی طرح شمال کی طرف بڑھا۔

رامیرونے بھی ناوار کے خلاف اپنی سازش کے خاکے میں عمل کا رنگ نہیں بھرا تھا کہ قرطبہ کے لشکر کی آمد کا غلغلہ اٹھا۔ یہ لشکر لیون کے خلاف نبرد آزمائی کا عزم لے کے آ رہا تھا۔ رامیرونے سانکو کی سرکردگی میں ایک جمعیت ناوار سے ملحق مشرقی سرحد پر متعین کی اور خود لیون اور کسٹائل کی متحدہ فوجیں لے کے ٹالاویرا کے میدان کی طرف بڑھا تاکہ آگے نکل کے قرطبہ کی فوج کا راستہ روکے۔ اُدھر اُس نے ڈون کو مغربی سرحد سے میدان جنگ میں طلب کر لیا۔ لیون سے رخصت ہوتے وقت وہ شہزادی انفٹا پر طنز کرنا نہیں بھولا۔

شہزادی! "اس نے زہر خند سے کہا۔" سلطان عبدالرحمن الناصر جنگ خندق کے بعد خود کبھی میدان جنگ میں نہیں آیا۔ اس بار بھی اُمید نہیں ہے۔ ورنہ ہم اُس کا سراپے اپنے پر چڑھائے ہوئے لیون واپس آتے پھر بھی ہم ٹالاویرا سے تمہارے لیے اُس کے کسی بڑے سردار کا سر ضرور لے کے آئیں گے۔"

معاہدے کے مطابق کسٹائل کا نواب فرزند و بھی اپنے لشکر کے ہمراہ لیون کے سرخ جھنڈے کے نیچے پیش قدمی کر رہا تھا۔ ٹالاویرا کے میدان میں قرطبہ کے لشکر کا ہراول دستہ نمودار ہوا اور دونوں فوجیں صف بندی کرنے لگیں۔ قرطبہ کے سپاہی بھوکے چپتیوں کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ اُدھر رامیرونے اپنے پرچم کو حرکت دی اور نواب فرزند و کو قرطبہ کے سواروں کا پہلا حملہ روکنے کا اشارہ کیا مگر نواب نے حملہ روکنے کی بجائے اپنی صفیں سمیٹ لیں اور حملہ آوروں کو قلب لشکر کی طرف بڑھنے کا راستہ دے دیا۔ یہاں شاہ رامیرونے بلفس نفیس موجود تھا۔ وہ یہ مہما سمجھنے سے قاصر تھا کہ کسٹائل کے سواروں نے قرطبہ کے رسالے کو روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی؛ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ نواب فرزند و کے دل میں ابھی تک اُس کے لیے نفرت کی آگ بھڑک رہی

ہے اور وہ لیون کا بدترین اور بھیانک قید خانہ ابھی مچھولا نہیں ہے۔ اُس نے رامیرو کی قیادت میں کسٹائل کے شکر کے ساتھ پیش قدمی ضرور کی تھی لیکن لڑنے کے لیے نہیں بلکہ میدانِ جنگ سے کٹنے اور بھٹنے کے لیے تاکہ رامیرو اکیلا قرطبہ کے سپاہیوں کی یلغار روکتا پھرے۔

کسٹائل کا لشکر میدان سے ہٹتا ہوا وعدہ نکل گیا۔ اب صرف رامیرو اپنی فوج کے ساتھ حملہ آوروں کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ حملہ آوروں کے گرزوں کی دھمک سے میدان لوز رہا تھا۔ رامیرو نے یہ تباہ کن حملہ روکنے کی بہت کوشش کی لیکن جیسے ہی کسٹائل کی فوج ہٹی، لیون کی فوج کے حوصلے پست ہو گئے اور قرطبہ کے ایک سپاہی کا گرز رامیرو کے دائیں شانے پر ضرب لگاتا ہوا گزر گیا۔ وہ بڑی شکل سے گرتے گرتے بچا۔ اسی لمحے دوسرے سوار نے اس پر نیزے سے حملہ کر دیا۔ اگر لیون کے سپاہی بادشاہ کو اپنے حلقے میں لے کے میدان سے فرار نہ ہو جاتے تو اُس کی موت یقینی تھی۔ رامیرو بھاگ کھڑا ہوا اور اُس کے نشکر نے بھی راہ فرار اختیار کی۔ قرطبہ کی فوج نے فوراً تک ان کا تعاقب کیا۔

شاہ رامیرو جب لیون کے شاہی محل میں داخل ہوا بہت دل شکستہ تھا۔ گرز کی ضرب کا زخم اُس کے شکست خوردہ چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ دو سپاہیوں نے اسے سہارا دے کے گھوڑے سے اتارا اور اُس کے خاص کمرے میں پہنچا دیا۔ اُس کی خبر گیری کے لیے سب سے پہلے شہزادی انفٹا کمرے میں داخل ہوئی۔ بادشاہ تڑپ کے بولا۔

”انفٹا! ہم تمہارے لیے قرطبہ کے سلطان کے کسی غلام کا سر بھی نہیں لاسکے خود اُس کے غلاموں سے چوٹ کھا کے آئے ہیں۔ بہر حال ہم تمہارے شوہر کو واپس لے آئے ہیں۔ شکست ہو تو ممتل ہو۔ ہم بھول گئے تھے کہ تمہارے دو باپ ہیں۔ فرغڈو کو ہم نے سر کر لیا لیکن تمہارا دوسرا باپ ہم سے مغلوب نہیں ہو سکا۔ ہم نئے سرے سے تمہاری شادی کریں گے کیونکہ تم سلطان عبدالرحمن کی بیٹی ہو۔ عبدالرحمن جو ایک فاتح ہے۔ ہم ایک فاتح کی بیٹی سے اُس کے شایانِ شان سلوک کریں گے۔“ انفٹا

نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شاہ رامیرو کو پھر اپنے آپ سے فرصت نہیں ملی۔ وہ ایک سال بستر پر تڑپتا رہا۔ اس کی موت کے بعد رسمی طور پر ولی عہد ڈون اپنی ملکہ انفٹا کے ساتھ تخت پر متمکن ہوا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سلطان کی خدمت میں دوستی کا عہد نامہ لکھنے کے بھیج دیا۔ سلطان نے اپنی بیٹی کے شوہر کی درخواست قبول کر لی۔ جب سفیر قرطبہ سے واپس آیا تو سب سے پہلے ملکہ انفٹا نے سلطان کے عہد نامے کو بوسہ دیا۔





پاکستان



۲۲۳

استفلا

- تاریخ ہندوستان
فصل اعلا در لہی زکا د اللہ
- دربار اکبری
فصل اعلا در لہی زکا د اللہ
- کینہ کی حکومت
باری بیگ
- تاریخ ریاستہائے
ہندوستان



راجپوتانے کا آسمان آفتاب کی تازت سے گرم اور گرد و غبار سے گدلا رہتا تھا۔ آفتاب غروب ہونے کا منظر بھی عجب دل فریب تھا۔ شفق کے ایسے خوں رنگ نظارے پنجاب یا اودھ میں نظر آیا کرتے ہیں۔

سورج اُفق پر سرخیاں بکھیرتا رخصت ہوتا تھا، شام بہت حسین اور رنگین تھی۔ خوب رو اور تو مند لوجوان بلرام کے دل میں بھی شفق کا سماں تھا۔ محبت اس کے سینے میں شعلے دہکاتے ہوئے تھی۔

وہ راج کمار کی کرشنو سے ملنے کے لیے راج پوری سے اُدے پورا آتا تھا۔ گلبدن کرشنو کی منگنی جو وہ پور کے ادھیڑ عمر راجا بھیم سین سے ہو چکی تھی اور اس کا حسن پورے دستخان میں چاندنی کی طرح چمکا ہوا تھا۔ بلرام کو خوب معلوم تھا کہ وہ ایک خطرناک بازی کھیل رہا ہے اور اگر یہ راز افشا ہو گیا تو اُدے پور کی بے شمار تلواریں اُسے چھلنی کر کے نکھریں گی۔ وہ اس اُفتاد کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ محبت نے

ڈرنا نہیں سیکھا، صرف زندہ رہنا یا مرنا سیکھا ہے۔

راج کمار کی کرشنورا جستان کا سب سے دلگتا ہوا ستارہ اور سب سے مہکتا ہوا پھول تھی۔ اسے راج کماروں کے پرنے دستور اور ان کی سیاسی اغراض کی بھینٹ چڑھایا جا رہا تھا۔ پھٹ پڑنے والی جوانی کی ابتدا تھی مگر اس پر مصلحت کا نول منڈھ دیا گیا۔ اس کا بے مثال حسن مجبور یوں اور خاندانی روایات کی اونچی دیواروں میں محصور کر دیا گیا۔ کوئی نامحرم اس کی ایک جھلک تک نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن کرشنوریہ دیواریں پھاند کر چند لمحوں کے لیے سہی، اپنے محبوب، اپنے پاگل سے ملنے ضرور آجاتی تھی۔ پاگل نے اپنی تلوار بلند کر کے قسم کھائی تھی کہ وہ اسے راجا بھیم سین کی ہوس کا شکار نہیں کرنے دے گا حالانکہ راجا نے منگنی کے موقع پر کرشنور کو سرخ یا قوت کی انگوٹھی پہنائی تھی۔

کرشنور اور بلرام ایک حسین و رنگین خواب دیکھ رہے تھے۔ یہ خواب مجھ پور کے راجا کو خون میں غسل دینے بغیر معرض تبیر میں نہیں آسکتا تھا مگر محبت مستقبل کے خطروں سے بے نیاز تھی۔ بلرام ہر پہلی تاریخ کو پہاڑ، گھاٹیوں اور ندی نالوں کی سرزمین اوسے پور میں داخل ہوتا تھا۔ اس کے سرکش اور برق رفتار گھوڑے کی ٹاپیں راج کمار کی دل کی دھڑکنیں تیز کر دیتی تھیں۔ وہ سوڈج ڈوبنے سے پہلے پہلے وادی میں پہنچ جاتی تھی۔ اگرچہ ان کی ہر ملاقات میں مستقبل کے خطرے دھڑکتے تھے لیکن آج کی ملاقات ایک مختلف ماحول میں ہو رہی تھی۔ بلرام معمول سے کہیں زیادہ مسرور تھا کیونکہ اس کی مطلوب کا طلب اس کے دل سے خود بخود بھٹ گیا تھا۔ راجا بھیم سین اچانک مر گیا۔ سفق کی سرخیوں میں بھی تمناؤں کے پھول کھلے تھے۔ بلرام نے اپنی کرشنور، اپنی گلاب پر ایک نظر ڈالی، پھر سفق کی طرف ہاتھ لہرایا۔ "کرشنور! دیکھو، زمین آکاش سے گلے مل رہی ہے۔"

راج کمار کی عارضوں پر آگ دہک رہی تھی۔ سر پر سیاہ دوپٹا تھا۔ اس نے آسمان کی سرخیوں اور سیاہیوں کا امتزاج دیکھا اور وہی آواز میں بولی۔ "بلرام! جب زمین اور آکاش گلے ملتے ہیں تو شام ہو جاتی ہے۔"

"گیا راج کمار کی آج بھی اواس ہیں؟ بلرام افسردگی سے بولا۔ اس نے

کرشنو کا سیاہ دوپٹا دیکھا۔ آپ نے ماتمی لباس زیب تن فرمایا ہے۔ خوب غالباً جو دھپو کے ظالم راجا کا سوگ منایا جا رہا ہے؟

راج کمار کی ہونٹ کپکپائے۔ بلرام! ہمیں سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم ایک عام لڑکی نہیں۔ اس نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

”ارے ارے یہ کیا؟ تم رو رہی ہو؟“ بلرام گھبرا گیا۔ ”راج کمار کی رو رہی ہے؟ تمہیں خوش ہونا چاہیے کرشنو!“ اس نے پیار سے کرشنو کا چہرہ کھولا۔ راجا بھیم سین مر چکے۔ تمہاری آندو پوری ہو گئی، اب تم ایک عام لڑکی ہو اور میں کوئی راجا ہمارا نہیں۔ اب میرے اور تمہارے درمیان کوئی تخت حاصل نہیں رہا۔“

راج کمار کی یاقوتی ہونٹوں پر مستم نے رخصت شروع کیا۔ بلرام! دیکھو! ہم نے منگنی کی انگوٹھی اتار دی ہے۔ تم ہمارے لباس پر نہ جاؤ، ہمارے دل کی آواز سنو۔ یہ دل صرف تمہارے لیے دھڑکتا ہے۔“

”کرشنو! بلرام جانتا ہے کہ تمہارا دل صرف اس کے لیے محفوظ ہے مگر تمہاری آنکھوں میں یہ گھٹا کیوں ہے؟ یہ تو تمہارے لہلہانے کا وقت ہے، میں مجھو منا چاہتا ہوں، ناچنا چاہتا ہوں کرشنو۔“

راج کمار کی خلا میں گھور رہی تھی۔ وہ زیر لب بولی۔ آج راجا کے سوگ کا ساتواں دن ہے، آخری دن۔ کل ہم یہ ماتمی لباس اتار دیں گے اور ہمیں ایک نئی زندگی مل جائے گی۔“

”کرشنو!“ بلرام جوش میں آ گیا۔ اس نے اپنی میان تھپ تھپائی، میان میں جے پور کی ڈھلی ہوئی نغم دار تلوار آراتہ تھی۔ وہ راج کمار سے اور قریب ہو گیا۔ بھیم سین کو مرنا تھا، اگر وہ اپنی موت نہ مرنا تو یہ تلوار اس کا خاتمہ کر دیتی۔“

کرشنو کی بڑی بڑی آنکھیں آسمان کو نواز رہی تھیں، ہم سوچ رہے ہیں بلرام کہ اگر راجا سے ہماری شادی ہو چکی ہوتی تو ہم آج بیوہ ہوتے، ہاں اس کی اڑتھی کے ساتھ ہمیں بھی سستی ہونا پڑتا۔“

”کرتنو! بلرام نے کھنچ کے اُسے سینے سے لگا لیا۔ ”میری رُوح! میری موجودگی میں راجا زندہ ہوتے ہوئے بھی مُردہ تھا۔“ اُس نے تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھا۔ یہ تلوار ایک راجا اور ایک فقیر کی گردن میں تمیز نہیں کرتی۔ تمہارے ابروؤں کی قسم کرتنو! اس کی کاٹ بہت تیز ہے۔“ کرتنو کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔

کچھ فاصلے پر ایک پتھر ملا راستہ تھا۔ وہ اچانک گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج اُٹھا۔ کرتنو اور بلرام الگ الگ ہو گئے۔ پہاڑیوں اور چٹانوں پر اندھیرا پھیل رہا تھا۔ سُرخیاں، سپاہیوں میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ وہ راستہ بے پور کی طرف نکلتا تھا۔ کرتنو اور بلرام نے دُور سے ایک سوار کا ہیولہ دیکھا۔ وہ بہت عجلت میں معلوم ہوتا تھا۔ دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے سے شہر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ٹاپیں بدرتج معدوم ہو گئیں۔ کرتنو اور بلرام نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کچھ سوچ رہے تھے۔ کرتنو دفعۃً بولی ”اندھیرا ہو رہا ہے بلرام! اب ہمیں چلنا چاہیے۔“

بلرام نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور آنکھوں آنکھوں میں اُس سے بہت کچھ کہا پھر پوچھا۔ ”کرتنو! تم نے راج کمار کی چنڈا بانی سے میرا ذکر کر دیا ہے نا؟ وہ مہاراج کی مزاج آشنا ہیں، اگر انہوں نے مناسب سمجھا تو ہمیں لازوال مسرتوں سے نواز سکتی ہیں۔“ چنڈا بانی کرتنو کی پھو پھی تھی اور کرتنو کا باپ اُس کا بے حد لحاظ کرتا تھا۔

”یہ سوگ کے دن ہیں بلرام! کرتنو نے آہستگی سے کہا۔ ”ان دنوں میں ہم پھو پھی ماں سے یہ ذکر کیسے چھیرتے؟“

بلرام بولا ”کمار کی! خیال رہے، تمہارا بلرام کسی ریاست کا راجکار نہیں ہے محض ایک سرفار کا بیٹا ہے۔ کیا تمہارے پتا مہاراج کسی زبردست سفارش کے بغیر اُسے قبول کر سکتے ہیں؟“

کرتنو بولی ”یاد ہے، تم نے کہا تھا کہ جے پور کے مہاراج اس سلسلے میں تم سے تعاون کریں گے؟“

”بے شک میں نے کہا تھا، مہاراج مجھے اپنے بیٹے کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔“

مگر ابھی تک میں بھی اُن سے یہ ذکر نہیں کر سکا ہوں۔ اب وقت نے کروٹ لی ہے، ممکن ہو تو بہت جلد یہ معاملہ اُن کے گوش گزار کر دوں گا۔ مجھے یقین ہے، وہ تمہارے پتا کے دربار میں میرا باقاعدہ پیام بھجوائیں گے۔ ہم پنوار راجپوت ہیں۔ میرا پیام راج پوتوں کے دستور کے مطابق ہوگا اور اُسے پنوار سردار لے کے آئیں گے، اگر مہاراج نے پیام قبول نہ کیا تو تم جانتی ہو، فیصلہ ملواری کی نوک پر آجائے گا۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم راج کمار کی چند بابائی کو اعتماد میں لے کے پہلے ہی حالات کو سنبھال لو۔

کرشنو کے بھرے بھرے سفر ہوٹوں پر معنی خیز تبسم نمودار ہوا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا کے اپنے محبوب کو اطمینان دلایا۔ بلرام نے اس کے رخسار تھپ تھپائے۔

”پیام چند روز میں پہنچ جائے گا۔“

”تم خود بھی آؤ گے نا؟“

”کیا راج کمار کی حکم دے رہی ہیں؟“

”نہیں، یہ ایک التجا ہے۔“

”جس کی التجا حکم سے بڑھ کر ہوتی ہے کمار کی؟ بلرام نے مسکراتے ہوئے کہا۔“

”لیکن پیام کے ساتھ میں خود نہیں آسکوں گا، البتہ جس روز پنوار سردار اُسے پور پہنچیں، تم سمجھ لینا کہ میں بھی پہنچ گیا ہوں۔“

کرشنو شاخ گل کی طرح لہرائی پھر اس نے پرنجوش انداز میں بلرام کا ہاتھ تھام

لیا۔ سنو بلرام! اگر تپا مہاراج نے پنوار سردار کو مایوس واپس کیا تو میں اسی جگہ تمہارا

انتظار کروں گی۔ تیار ہو کر آنا۔ آج تک اُسے پور کی کسی راج کمار نے ایسا فیصلہ نہیں کیا

ہوگا اور یہ فیصلہ بھی کوئی راج کمار نہیں بلکہ ایک لڑکی کر رہی ہے جس کے سینے میں ایک

دھڑکتا ہوا دل موجود ہے۔“



کرشنو اُدے پور کے رانا خاندان کی چشم و چراغ تھی۔ راجپوتانے کے مقدر اور زور اور راجے مہاراجے رانا خاندان کی کسی دوشیزہ کو حاصل کرنا نہایت فخر کی بات سمجھتے تھے اس لیے کہ یہ خاندان راج پوتوں کی روایتی آن بان اور قدیم رسموں کا منظر تھا۔ اُدے پور کے والی رانا پرتاپ نے مغل شہنشاہ اکبر کی اطاعت قبول کرنے اور مغلوں کو اپنی بیٹی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ رانا پرتاپ نے مغل سلطنت کے خلاف بغاوت کرنے کے ساتھ ساتھ اکبر کی مہارانی جو دھا بانی کے بھائی رانا مان سنگھ کو یہ طعنہ بھی دیا تھا کہ اُس نے ایک مغل کو اپنی بہن دے کر راج پوتوں کو ذلیل کر دیا ہے۔

ایک بار راجا مان سنگھ راجپوتانے سے گزر رہا تھا۔ اُس نے رانا پرتاپ سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ رانا نے اس کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام تو ضرور کیا مگر اس سے ملنے اور اُس کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ یہ تو بہن رانا مان سنگھ کو کھا گئی۔ وہ بھی ایک غیرت مند راجپوت تھا۔ اس لیے رانا کی دعوت ٹھکڑے کے آگے لوٹ گیا اور اُس نے یہ واقعہ اکبر کے گوش گزار کیا۔ اکبر نے رانا پرتاپ کی رکشی فرود کرنے کے لیے ایک فوجی مہم تیار کی۔ مغلوں کا وہ خاص دستہ جو صورت شہنشاہ کی قیادت میں بڑھا اور اپنی سپاہیاء ترک تازیوں کے باعث بہت شہرت رکھتا تھا، اس مہم کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ اکبر نے صرف شاہی فوج پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے ولی عہد اور جو دھا بانی کے بیٹے شہزادہ سلیم کو بھی اُدے پور کی مہم سونپ کر دے کے لیے بھیجا۔ یہ صریحاً اس بات کا اشارہ تھا کہ جو مغلوں کے قریب آتے ہیں مغل اُن کی عزت و ناموس کی خاطر کہاں تک جاسکتے ہیں۔

شہزادہ سلیم اور راجا مان سنگھ مغلوں اور راجپوتوں کے لشکر لے کے اُدے پور کی طرف بڑھے۔ ہدی گھاٹ میں قیامت کارن پڑا۔ چوڑے گڑھ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ رانا پرتاپ کو شکست ہوئی اور مان سنگھ کی تلوار کا زخم کھل کے بھاگ لگا۔ اُس نے شکست تسلیم نہیں کی اور زندگی بھر مغلوں سے نبرد آزما رہا مگر ناکامی اُس کا مقدر تھی آخر اپنے دل پر ناکامی کا داغ لیے دنیا سے رخصت ہو گیا۔

راج پوتوں نے رانا پرتاپ کو اپنا ہیرو بنا لیا تھا کیونکہ اُس نے مغل سلطنت کی

معاہدہ قبول کرنے کی بجائے اس سے بغاوت کرنے کو ترجیح دی اور مغلوں کو شہتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جنگ ضرور ہاری تھی لیکن عزت نہیں ہاری۔ اُدے پور نے اکبر کے خلاف بغاوت کر کے تاریخی اہمیت حاصل کر لی۔ اس لیے راجستھان کی بر ریاست کا والی رانا خاندان کی کسی دشمنیہ کا رشتہ حاصل کرنا باعثِ عزت سمجھتا تھا۔

رانا پرتاپ کے واقعے کو تین صدیاں گزر چکی تھیں۔ اب مغل سلطنت کے بلبے پر مٹی حکومتوں کے محل تعمیر ہونے لگے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی تیندوے جیسی مکاری اور ہوشیاری سے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا شکار کھیلنے میں مصروف تھی۔ شہنشاہِ دہلی کی برائے نام حکومت، نظامِ دکن، مرہٹوں اور سپور کی خانہ جنگی نیز ریاستی حکمرانوں کی ناچاقیاں، یہ سب انگریزی اقتدار کو خود آواز دے رہی تھیں۔ مہراج الدولہ اور ٹیپوشکست کھا چکے تھے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں انگریزی سیاست نے سندھیا اور ملہر کا زور بھی توڑ دیا تھا۔ اودھ، وسطی ہند اور پنجاب میں سیاسی طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ برصغیر ایشیا کی ایک بہت بڑی شکار گاہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ایک طرف والیانِ ریاست باہمی جنگ و جدل میں مصروف تھے، دوسری طرف بعض طالع آزما ایک دوسرے پر شکر کشی کرتے رہتے تھے اور تیسری طرف کمپنی سرکار زور آزمائی کر رہی تھی۔

راجپوتانے کی ریاستیں بھی مرہٹوں کی دستِ بڑ کا شکار ہو رہی تھیں۔ ہر طرف عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جو دھ پور کے راجا بھیم سین کو اُدے پور کے ساتھ سیاسی اور فوجی اشتراک قائم کرنے کا خیال آیا اور اُس نے دونوں ریاستوں میں رشتے اور تعلق کا بیوند لگانے کی غرض سے راج کمار کی کرشنو کے لیے پیام بھیج دیا۔ بھیم سین بظاہر جو دھ پور اور اُدے پور کے درمیان سیاسی تعلقات مضبوط کرنا چاہتا تھا تا کہ کسی بیرونی حملے کی صورت میں دونوں ریاستیں متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کر سکیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ رانا خاندان کی وامادی کا فخر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کرشنو کے بے پناہ حسن و جمال کے چرچوں نے اُسے دیوانہ کر دیا تھا۔ دونوں کی عمروں میں اگرچہ بہت فرق تھا۔ بھیم سین کی جوانی رخصت ہو چکی تھی اور حسین کرشنو بھی جوانی کے دوازے پر دنگ دے رہی تھی لیکن راجا جٹوں میں

لڑکی اور لڑکے کی عمروں کا فرق ثانوی امر تھا۔ وہ خاندانی مصلحتوں اور سیاسی ضرورتوں کو ہمیشہ ترجیح دیتے تھے۔ سولہ سولہ سال کی لڑکیاں ساٹھ ساٹھ برس کے بوڑھوں کے ساتھ باندھ دی جاتی تھیں۔ راجپوت لڑکیوں کی زندگی کا مقصد خاندانی ناموس اور والدین کی سیاسی مصلحتوں پر قربان ہونے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ انہیں اس جبر کے خلاف احتجاج کرنے کی اجازت تھی، نہ عادت۔ کرشنو کی منگنی بھی راجہ بھیم سین سے کر دی گئی مگر اس سے پہلے کہ شادی ہوتی، بھیم سین مر گیا۔ اب کرشنو اور بلرام کے درمیان کوئی دیوار حائل نہیں رہی تھی۔

کرشنو کو یقین تھا اگر جے پور کے مہاراجا جانے بلرام کی مدد کی تو اس کے باپ کو اس کا رشتہ دینے سے انکار نہیں ہوگا کیونکہ بلرام کا باپ جے پور کے دربار کا ایک معتمد سردار تھا، نیر جے پور اور جو دھ پور میں قدیم مخالفت چلی آرہی تھی اس لیے جو دھ پور کے آنجہانی راجا کی منسوبہ اپنے ایک سردار کے بیٹے کے لیے بیاہ لانا چاہتی تھی جے پور کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ یہ چٹوڑ کا قلعہ فتح کرنے سے کم کارنامہ نہیں تھا۔



396

رات نے اُدے پور پر اپنی زلفیں کھول دی تھیں۔ کرشنو کو شام کی سیر میں آج پھر دیر ہو گئی۔ اُسے اپنی رازدار خادمہ پر اعتماد تھا کہ وہ اُس کی سیر کا راز فاش نہیں کرے گی۔ لیکن رانا کا حکم تھا کہ اُسے ہمیشہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے محل لوٹ آنا چاہیے۔ کرشنو دھڑکتے دل اور نرم قدموں سے محل میں داخل ہوئی۔ قندیلیں روشن ہو چکی تھیں، قندیلوں کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ اس کی بھوپھی راجکمار چنڈا بانی باوقار انداز میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اُس کی طرف آرہی ہے۔ وہ بہت مضطرب نظر آرہی تھی، کرشنو سمجھ گئی کہ یقیناً کوئی نئی خبر اس کی منتظر ہے۔ پھر معاً وہ یہ سوچنے لگی کہ کہیں اس کا اور بلرام

کا بھید تو نہیں کھل گیا، چندا بائی ایک زدیں چوکی پر بیٹھ گئی۔
 ”کرشنو! ہم دیر سے تمہارے منتظر تھے۔“

”حاضر ہوں پھوپھی ماں!“ کرشنو نے اُس سے آنکھیں ملانے بغیر کہا۔
 چندا بائی نے اُسے چوکی پر اپنے پاس بٹھالیا۔ ”کچھ دیر قبل مہاراج نے تمہیں
 یاد فرمایا تھا۔“ کرشنو مجتہم سوال بن گئی۔ چندا بائی نے کہا۔ ”آج تمہارے سوگ کا ساتواں
 دن ہے۔ معلوم ہوتا ہے سات کا عدد تمہارے حق میں مبارک نہیں ہے۔ آں جہسانی
 بھیم سین سے تمہاری منگنی بھی سات تاریخ کو ہوئی تھی اور آج پھر.....“ وہ کچھ
 کہتے کہتے رک گئی۔

کرشنو نے بے قراری سے پوچھا۔ ”پتا مہاراج نے ہمیں کیوں یاد فرمایا تھا
 پھوپھی ماں!“

”جے پور کا معاملہ ہے۔“ چندا بائی نے آہستہ سے کہا۔
 جے پور کا نام سنتے ہی کرشنو کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں
 کہہ سکی۔ چندا بائی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”مہاراج بے حد پریشان ہیں۔ سنا ہے
 جے پور کے راجا جگت سنگھ نے تمہارا رشتہ طلب کیا ہے۔“
 کرشنو کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں، اُس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو
 پایا مگر اپنا اشتیاق نہ چھپا سکی۔ ”کس لیے پھوپھی ماں!“
 ”اپنے لیے۔“ چندا بائی نے زیر لب جواب دیا۔

یہ دو لفظ کرشنو کے دل پر بجلی بن کے گزرے۔ چندا بائی کا جواب نہایت یوں
 کن اور تعجب نیز تھا۔ کرشنو کو اپنے محبوب کی بات یاد آگئی۔ اُس نے کہا تھا جے پور کا مہاراجا
 اُسے بیٹے کی طرح عزیز رکھتا ہے اور وہ اس سلسلے میں اُس کی مدد کرے گا۔ کرشنو کو چندا بائی
 کے الفاظ کی صحت پر شبہ تھا۔ ”پھوپھی ماں!“ اُس نے بے چینی سے پہلو بدلا ”پیام لے
 کے کون آیا ہے؟“

”ابھی پیام نہیں آیا ہے۔“ چندا بائی نے کہا۔ ”صرف خبر آئی ہے کہ جے پور کے

راجا جگت سنگھ نے تم سے شادی رچانے کا فیصلہ کیا ہے۔ سب تیاریاں مکمل کر لی ہیں اور تم کھانی ہے کہ تمہاری ڈولی اسی کے محل میں اترے گی۔ ایک وفد بہت جلد پیام لے کے آنے والا ہے اور تم یہ سن کے حیران ہو گی کہ اُس وفد کے ساتھ جے پور کا سپہ سالار چاند سنگھ بھی ایک لشکر لے کے آ رہا ہے۔ تاکہ پیام منظور نہ کیا جائے تو وہ اُدے پور پر چڑھائی کرے اگر جنگ چھڑکے تو شاید اُدے پور اُس کا مقابلہ نہ کر سکے کیونکہ مرہٹے اور وہیلے اس کا ساتھ دیں گے۔ چندا بائی کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔

کرشنو اضطراب میں چوکی سے کھڑی ہو گئی۔ اُس کے رخسار انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ اُس کا دل غم کی شدت سے دو نیم ہوا جا رہا تھا۔ کیسی دلچسپ گفتنی عجیب بات تھی۔ بلرام جس قوت کے بل بوتے راجا بھیم سین تک سے ٹکرا جانے کی باتیں کرتا تھا، اب وہی قوت اُس کی رقیب بن کے سامنے آئی تھی۔ بلرام راجا بھیم سین سے بھڑکتا تھا مگر جگت سنگھ کے سامنے سرتک نہیں اٹھا سکتا۔

چندا بائی نے اُس کا غیر معمولی اضطراب محسوس کر لیا اور کھڑے ہو کے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”حوصلہ رکھو کر شنو!“

کرشنو نے ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”اب کیا ہو گا پھوپھی ماں؟ پتا مہاراج کیا ارادہ رکھتے ہیں۔“

”مہاراج نے مٹھا کرا جے سنگھ سے رائے لی تھی۔ مٹھا کو خیال ہے کہ ہمیں جو دھ پور کے نئے مہاراج مان سنگھ سے مدد لینی چاہیے تاکہ راجا بھیم سین کے دور میں جو دھ پور اور اُدے پور میں جو ربط قائم ہوا تھا، وہ قائم رہے۔“ کرشنو تڑپ کر رہ گئی بلرام کا سراپا اُس کے تصور میں گھوم رہا تھا اور وہ بدقت اپنے آنسو ضبط کیے بیٹھی تھی چندا بائی کہہ رہی تھی۔ ”غالباً مہاراج کو مٹھا کو رائے پسند نہیں آئی، اس لیے انہوں نے کوئی قاسد جو دھ پور نہیں بھیجا۔“

کرشنو کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اس نے جلدی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ چندا بائی نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ ”کرشنو! تم اپنے غیرت مند باپ کی پریشانیوں کا

اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ مہاراج کا ایک ہاتھ اپنی بیٹی کے آنچل پر اور دوسرا تلوار کے دستے پر ہے، اگر کسی نے ہماری عزت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جسارت کی تو اُسے پور کی ایک ایک تلوار بے نیام ہو جائے گی۔“ چندا بائی کی نظر کرشنو کی بھگی بلکوں پر پڑ گئی۔ ارے؟ یہ تمہاری آنکھوں میں موتی کیوں جھل رہا ہے ہیں کرشنو!

کرشنو یک بارگی اُس کے سینے سے چمٹ گئی اور سسکیاں بھرنے لگی۔ چندا بائی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ جب کرشنو کی حالت کچھ معتدل ہوئی تو اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”پھوپھی ماں! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ راجا جگت سنگھ کا پیام آنے سے پہلے پتا مہاراج اپنی بیٹی کے لیے کوئی تیسری جگہ منتخب کر دیں؟“

”تیسری جگہ؟“ چندا بائی نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ ”وضاحت سے بات کرو کرشنو! تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

کرشنو کا سر جھجک گیا۔ اُس نے چندا بائی کو سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ”پھوپھی ماں! گتاخی معاف، وہ کوئی راجا نہیں ہے، راجا کمار نہیں ہے، صرف ایک سردار کا بیٹا ہے لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اگر آپ کی کرشنو کسی کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے تو صرف وہی ہے۔“

”کرشنو! چندا بائی چیخ پڑی اور اس طرح کانپنے لگی جیسے اُسے پور کے محل میں بھونچال آگیا ہو۔ ہوش میں آ کر کرشنو! یہ نہ بھولو کہ تم کون ہو اور جس سے تم مخا^طب ہو وہ کون ہے۔ یاد رکھو، اُسے پور کی راج کمار یوں کے لیے محبت زہر کا پیالہ ہے، موت کا پیغام ہے، اگر زندگی چاہتی ہو تو اُسے بھول جاؤ صرف خود کو یاد رکھو۔ اُس دس کی راج کمار یوں کو محبت کا کھیل کھیلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اُن کی زندگی کی ڈور ہمیشہ کسی نہ کسی تخت کے پائے سے بندھی رہتی ہے۔“

کرشنو کا چہرہ فق اور رنگ سفید ہو گیا۔ چندا بائی نے اُس پر ایک گہری نظر ڈالی اور تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے چلی گئی۔ کرشنو چوکی پر اوندھی گر پڑی اور

پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اُس کا ذہن تہہ در تہہ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔



جے پور کا وفد پہ سالار چاند سنگھ کی کمان میں تین ہزار کا لشکر لے کے اُدے پور کی طرف روانہ ہوا۔ وفد میں دوسری اہم شخصیتوں کے علاوہ جے پور کا راج گرو بھی شامل تھا۔ اُس کا انتخاب راجا جگت سنگھ نے اس لیے کیا تھا کہ کرشنو کا باپ اس وفد کی فوجی سیاسی اور مذہبی حیثیت کے سامنے سرنگوں ہو جائے اور بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار نہ کر سکے۔

کوہستان اراولی کا سلسلہ اُدے پور سے جے پور کے شمال تک چلا گیا ہے یہ علاقہ زیادہ تر خشک اور بچر ہے۔ پہاڑیاں دونوں دیاستوں کے جغرافیے میں یکساں پیدا کرتی ہیں۔ ان کی بلندی سمندر کی سطح سے تین ہزار فٹ تک پہنچتی ہے۔ اُدے پور کے علاقے میں ان کی سطح کہیں کہیں چھ ہزار فٹ تک چلی گئی ہے۔ وہاں بلند گھاٹیوں، عمومی چٹانوں، دشوار گزار راستوں، ندی نالوں اور جنگلوں نے اُدے پور کو باقی ریاستوں سے الگ کر دیا ہے۔ جے پور اور اُدے پور کا درمیانی فاصلہ دو سو میل سے زیادہ ہے۔ وریا کے چینل کی ایک شاخ سانپ کی طرح بل کھاتی اُن کے درمیان حائل ہے۔

چاند سنگھ ایسی شان و شوکت سے روانہ ہوا جیسے وہ صرف پیام لے کے نہیں بلکہ برات لے کے جا رہا ہو۔ روانگی کا منظر بہت پر جلال اور پر شکوہ تھا۔ جے پور میں یہ بات عام ہو گئی تھی کہ مہاراجا جگت سنگھ کی شادی اُدے پور کی حسین و جمیل نوزیرا جھکاری کرشنو سے ہونے والی ہے اور اگر رائے نے بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تو چاند سنگھ کو اختیار ہوگا کہ وہ اُدے پور کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے، چاند سنگھ جس فوجی ویدبے سے روانہ ہوا تھا اُس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہر صورت میں کامیاب لوٹے گا۔

راجستھان کے لوگ عموماً کھیتی باڑی کرتے، مویشی پالتے یا سپہ گرتھے۔ سپہ گری راج پوتوں کا آبائی پیشہ تھا۔ آمدورفت کا ذریعہ گھوڑے اور خچر تھے یا بیل گاڑیاں جنہیں گروہلیں کہا جاتا تھا مگر جب کہیں سے کوئی لشکر گزرتا تو فوراً جنگ کی افواہیں گشت کرتے لگتی تھیں۔ اٹھارہویں صدی میں راجستھان کی بیشتر ریاستوں کو روہیلوں، مرہٹوں اور انگریزوں کی تباہ کن ہجرت سے اکثر واسطہ پڑتا تھا۔ بالخصوص مرہٹوں نے یہ ریاستیں خوب پامال کی تھیں۔ مرہٹے چوتھے وصول کرنے کے لیے کئی کئی مہینے ڈیرے ڈالے رہتے تھے کبھی مرہٹے مغلوں کے تعاقب میں ہوتے، کبھی انگریز مرہٹوں کا پیچھا کرتے۔ اس طرح راجستھان مختلف لشکروں کی گزرگاہ بن گیا تھا۔

چاند سنگھ جے پور کے خاص پریمپوں کے ساتھ میں لشکر کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اچانک دوسے گروہ آتی ہوئی نظر آئی پھر دیکھے دیکھتے جو وہ پور کار سالہ اور اس کے پیدل دستے نمودار ہوئے جو آدھی اور طوفان کی طرح بڑھتے آرہے تھے۔ چاند سنگھ نے اپنے لشکر کو روکنے اور مرتب ہونے کا حکم دیا لیکن اب بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ ناگہانی بلا کی طرح نمودار ہونے والی سپاہ نہ صرف تعداد میں زیادہ تھی بلکہ اس نے جسے پوری لشکر کو بہت ہوشیاری سے زخمی میں لے لیا تھا۔

چاند سنگھ اس اچانک اٹھاو سے بے حد پریشان ہوا۔ اب نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ جو وہ پوری سواروں اور پیادوں کے دستے بدستور آگے بڑھ رہے تھے۔ تصادم ناگزیر تھا۔ آخر دونوں لشکر بادلوں کی طرح ٹکرائے اور میدان میں بجلیاں کوندنے لگیں لیکن پلے حملہ آوروں کا بھاری تھا۔ اس کی پہلی ہی ضرب بہت کارگر ثابت ہوئی جسے پور کے سپاہی خاک و خون میں لوٹ گئے۔ بندوقوں کی زبان کئی بہادروں کو چاٹ گئی۔ دھوئیں، بارود کی بو اور خون کی سرخی نے راجستھان کی تاریخ میں ایک نئے خطرے کا دروازہ کھول دیا۔

چاند سنگھ بہت سے سپاہی کٹوانے کے بعد پامال ہوا تھا۔ اس نے جو وہ پور کے سپہ سالار کا اعلان سنا۔ راج کمار کی کوششوں جو وہ پور کی امانت ہے۔ راجا جیم سین کے

بعد اب اُس پر راجہ مان سنگھ کا حق ہے۔ جے پور کے راجہ سے کہہ دو کہ وہ اُدے پو
پیام بھیجنے سے پہلے جو دھ پور کی تلواروں سے نمٹ لے۔ چاند سنگھ کے کچے سپاہیوں کا
لیے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

جو دھ پور کے راجا مان سنگھ نے عجب قدم اٹھایا تھا یہ جے پور کے لیے
ایک چیلنج تھا، ایک راج پوت کی غیرت کا امتحان تھا، ایک جنگ کا اعلان تھا۔ جنگ
جو راج کمار کی کرشنو کے لیے چھڑنے والی تھی۔ کاش راج کمار کی کچھ کم حسین ہوتی!



برام اُدے پور سے راج پوری آ گیا۔ بے حد خوش تھا۔ کرشنو نے اُسے اشارہ
دے دیا تھا کہ اگر اُس کے باپ نے برام کا پیام ٹھکرا دیا تو اُدے پور کی تاریخ ایک نیا
ورق اُلٹے گی اور برام کا ساتھ دے کے اپنی محبت کو زندہ جاوید بنا دے گی۔ برام بے
حد خوش تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ مہاراجا جگت سنگھ کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب
ہو جائے گا مگر اُسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ وہ جس گل بہار کا تنائی ہے۔ راجا جگت
سنگھ اسی کو شانخ سے توڑنے کے لیے ہاتھ دراز کر چکا ہے۔ برام نے راج پوری میں
ایک دن سے زیادہ قیام نہیں کیا اور وہ مہاراجا سے اجازت لے کے نپوارہ سرداروں کو جلد
از جلد اُدے پور بھیج دینا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے گھوڑے کی باگ جے پور کی طرف
موڑ دی۔

شکست خوردہ چاند سنگھ اور اپنے خواہوں میں بدست برام صرف ایک
پہر کے وقفہ سے آگے پیچھے شہر میں داخل ہوئے۔ چاند سنگھ اپنا لٹا پٹا قافلہ لے کے
پہلے پہنچ گیا۔ شکست و ناکامی کا سانحہ راجا جگت سنگھ کو مشتعل کر دینے کے لیے کافی
تھا۔ دُشمن نے اس کے خواب راستے ہی میں بکھیر دیے تھے اور اُدے پور کے محل میں

اس کے پیام کی بجائے شکست کی خبر پہنچی تھی۔ جگت سنگھ زخمی چیتے کی طرح تڑپ رہا تھا۔ بلرام شکست کی خبر سن کے چونک گیا اور اس خبر نے خاص طور پر اس کا سینہ چھلنی کیا کہ یہ سب کچھ کرشنو کی خاطر ہوا ہے۔ اس کے دل پر گویا آسمانی بجلی ٹوٹ پڑی۔ اب اس کے جسے پودانے کا مقصد فوت ہو چکا تھا۔ شہر کے دروازے پر اس نے ایسا محسوس کیا جیسے کوہستان اراولی کا سارا بوجھ اس کے دل پر آگرا ہے۔ وقت کے ہاتھ نے اس کی روح پر ضرب لگائی تھی۔ اس کے تمام ولولے رقابت کی آگ میں جل کر رکھ ہو گئے۔ مہاراجا جگت سنگھ سے ٹکرانے کی ہمت کیسے کرتا؟ وہ آہستہ آہستہ جسے پود کے بازووں سے گزرتا گیا۔ گھوڑے کی دھیمی ٹاپیں اس کے دل کی ویرانی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ جب اپنی حویلی کے دروازے پر گھوڑے سے اترتا تو جنگ میں زخمی ہونے والے سپاہی کی طرح ٹدھال اور نیم جاں تھا۔ وہ جسم کے بجائے دل پر زخم کھا کر آیا تھا۔ چوکیدار نے پک کر گھوڑے کی باگ سنبھالی۔ وہ ڈیڑھی میں داخل ہوا تو مارواڑی خادمہ نے اسے روشنی دکھائی۔ ایک خادمہ سے معلوم ہوا کہ مہاراجا جانے اپنے سرداروں کو کسی ضروری مشورے کے لیے طلب کیا ہے۔ اس لیے اس کا باپ وہاں گیا ہوا ہے مگر بلرام کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد اس کا باپ حویلی میں داخل ہوا۔

بلرام! بہت اچھا ہوا تم راج پوری سے آگئے، مجھے تمہاری ضرورت ہے۔

بلرام کو معلوم تھا کہ اس کا باپ کیا کہنا چاہتا ہے، اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سنتا، اس نے باپ کو اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا اور اپنا مقدمہ اس کی عدالت میں پیش کر دیا۔ سردار کے ہوش اٹ گئے کہ اس کے نادان بیٹے نے اپنی نگاہ کا مرکز بنایا بھی تو اسے بنایا جس کے حصول کی خاطر راجستھان کی سلطنتیں بل رہی تھیں۔ اس نے بیٹے کو سمجھایا، یہ دیوانگی ہے۔ ایک آگ ہے۔ یہ آگ راجاؤں کے دلوں میں لگ جائے تو انہیں پھونک دیتی ہے۔ راج کمار کی کرشنو کی طلب تو مہاراجا کو بھی اس نہیں آئی۔ تمہاری کیا اوقات ہے۔

پتا جی! بلرام نے ادب سے کہا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مہاراجا

اُس کا خیال دل سے نکال دیں۔ جہاں تک راجا مان سنگھ کا تعلق ہے اُس سے میں نمٹ لوں گا۔

”مگر مہاراجا، مان سنگھ سے انتقام لینے اور راج کمار کی کو فتح کرنے کا پختہ فیصلہ کر چکے ہیں۔“

”اگر فیصلہ ہو چکا ہے پتاجی تو سن لیجئے کہ جے پور اور جودھ پور کے راجا آپس میں بڑے مڑ کر ختم ہو جائیں گے لیکن اُن کے ہاتھ راج کمار کی دامن تک نہیں پہنچ سکتے۔ اگر کوئی بھی گئے تو میں انہیں کسی سدر عایت اور کسی خوف کے بغیر کاٹ کے پھینک دوں گا۔“

”لوٹ کے! سردار نے سزائش کی۔“ تم نے حالات کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ مہاراجا کے جودھ پور کے خلاف مہاراجا سندھیا اور رومیوں کے سردار امیر خاں سے مدد مانگی ہے۔ اچھی رعانہ ہو چکے ہیں، اب جودھ پور اور اُدے پور کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی۔“ بلرام دل سوس کے رہ گیا۔ راجا جگت سنگھ ایک بڑی جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا اور ایک جنگ بلرام کے دل و دماغ میں ہو رہی تھی۔ کیوں نہ وہ مہاراجا جگت سنگھ اور راجا مان سنگھ دونوں کا خاتمہ کر دے؟

”میں جانتا ہوں، اس وقت تم کیا سوچ رہے ہو۔ باپ نے کہا۔ اگر تم نے جان پر کھیل کے اپنے رقبوں کو ختم بھی کر دیا تو یاد رکھو، اُدے پور کا رانا پھر بھی اپنی بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں نہیں دے گا۔“

”پتاجی!“ بلرام چیخ اٹھا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اُدے پور کا فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔“

”اتنی بڑی بات زبان پر لانے سے پہلے تمہیں اچھی طرح سوچ لینا چاہیے۔ تم کسی ریاست کے والی یا راج کمار نہیں، محض ایک سردار کے بیٹے جو جس کی وفاداریاں جے پور کے دربار سے وابستہ ہیں۔“

بلرام نے مناسب لفظوں میں اپنے اور کیشنو کے تعلق اور رابطے کی تفصیل بے خبر باپ کو بتادی اور کہا کہ راج کمار کی کیشنو چندا بائی کو بہوار کرنے کا قول دے چکی ہے۔ بلرام

کا باپ حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ چند لمحوں کے لیے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلرام کے کندھوں پر رکھ کے سرگوشی کی: "مہاراجا جلد کے لیے کوئی کارنامہ سزا انجام دو۔ پھر میں انہیں مجبور کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ تمہاری خاطر راجہ کماری کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔"

بلرام کے چہرے پر خون دھونے لگا۔ اُمید کا بجھا ہوا چراغ پھر روشن ہو گیا۔ "اگر مہاراجا میرے حق میں راجہ کماری سے دست بردار ہو جائیں تو میں ان کے لیے اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا سکتا ہوں۔"

سردار نے بیٹے کو بتایا: "مہاراجا، مانہ سنگھ سے انتقام لینے کے لیے سخت بے چینی اور اُسے تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں اس کی تباہی کا ایک راستہ ناگود کی جاگیر سے نکلتا ہے۔ وہ کیسے؟ سنو۔ جو دھ پور کے آل جہانی راجا بھیم سین کی رانی حاملہ تھی۔ پتی کی موت کے چند روز بعد اُس نے ایک راجہ کمار کو جنم دیا لیکن مانہ سنگھ پہلے ہی تخت و تاج پر قبضہ کر چکا تھا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ بھیم سین کی بیوہ نے ایک بچے کو جنم دیا ہے تو وہ بچے کی جان کے دد پے ہو گیا۔ رانی نے اس کے خوف سے بچے کو چھپا دیا اور یہ مشہور کر دیا کہ اس کے ہاں کوئی ولادت ہوئی ہی نہیں۔ پھر اُس نے اپنی ایک معتمد خادمہ ناگود کے ٹھاکر سوانی سنگھ کے پاس بھیجا اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ ٹھاکر راجا بھیم سین کا بہترین دوست تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں رانی اور راجہ کمار کو جو دھ پور سے نکال کے ناگود لے گیا۔

سوانی سنگھ جو دھ پور کے دربار سے وابستہ تھا لیکن ناگود میں پنچ کے اُس نے راجا مانہ سنگھ کی تخت نشینی خلاف قانون قرار دے دی اور اعلان کیا کہ جو دھ پور کے تخت کا اصل وارث تو مولود بچہ ہے۔ آج کل راجا مانہ سنگھ اور ٹھاکر میں ٹھنی ہوتی ہے۔ اگر تم ٹھاکر اور راجہ کمار کو کسی طرح بچے پور لے آؤ تو مہاراجا اسے ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھیں گے۔ پھر جو دھ پور کے تخت کا فیصلہ بچے پور میں ہوگا۔"

بلرام کی آنکھیں چمکنے لگیں: "میں آپ کی اجازت سے ابھی ناگود روانہ ہو جاؤں گا۔"

"ابھی نہیں، تمہاری روانگی صبح ہونی چاہیے۔"

”راجتھان میں رات کا سفر آسان ہوتا ہے پتا جی!“
 ”ہاں مگر میں چاہتا ہوں تم رات یہیں گزارو۔ شاید میں ٹھا کر سوائی سنگھ کے لیے
 مہاراجا سے کوئی ضمانت نامہ حاصل کر سکوں۔“
 سورج طلوع ہونے سے پہلے بلرام کا گھوڑا بچے پور سے کئی کوس دور نکل چکا تھا۔



راجا بھیم سین کے بعد راجتھان کے حالات تیزی سے بگڑنے لگے۔ راکھ کی سطح اگرچہ خاموش
 نظر آتی تھی لیکن تہہ میں ایک چنگاری سلگ رہی تھی۔ جو یک لخت شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ یہ
 راج کمار کی کرشنو کے حسن جہاں سوز کا شعلہ تھا۔ اس نے سب سے پہلے راجا بھیم سین کی متاعِ
 عقل و ہوش پھونکی۔ اس کے بعد راجا جگت سنگھ اس کی لپیٹ میں آیا اور اب راجا مان سنگھ بھی
 اس کی حدت سے مہل رہا تھا۔ اس نے جے پور کے لشکر پر حملہ کر کے اور اسے شکست دے کر
 اُدے پور کے ساتھ اپنے تعلق کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی اور رانا کو پیغام بھیجا۔
 ”سورگیاشی راجا بھیم سین اور حضرت مآب راج کمار کی کرشنو کی منگنی کا
 مقصد جو دھ پورا اور اُدے پور کے تعلقات مضبوط بنانا اور متحد ہو کر
 بیرونی حملے کا دفاع کرنا تھا۔ دونوں ریاستوں میں اتحاد قائم رہنا چاہیے
 اس کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معزز راج کمار کی کرشنو جو دھ پور
 کی مہارانی بنیں۔“

سیاسی ضرورتیں، زنجواڑوں کی فاتی علاقوں اور رقابتیں اُدے پور کے محل کی
 دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ رانا ایک ریاست کا والی ہی نہیں، ایک خوب صورت و شیرازہ
 کا باپ بھی تھا اور اُدے سے بہر حال اپنی خانمانی رعایا کا پاس کرتے ہوئے اس کی ڈولی بھی
 رخصت کرنی تھی۔ اُدے پور کے راناؤں کی سیاسی مصلحت نے اگرچہ شادی وغیرہ کے معاملے

میں ہمیشہ طاقت ور ہاتھ قبول کیے تھے اور اس طرح قوت کا توازن اپنے حق میں قائم رکھا تھا لیکن انہوں نے اپنی راج پوتی آن پر کبھی دُعا نہیں لگنے دیا۔ جب بھی غیرت کا سوال اُٹھا، اُدے پود نے اس کا بھر پور جواب دیا اور راج پوتوں کے لیے ہمیشہ ایک مثال قائم کی۔

۶۔ ۱۸۰۶ء میں وقت کے سیاسی اور تمدنی دھارے صدیوں پرانی تہذیب کا رخ

بدل رہے تھے۔ شرافت اور غیرت کا مفہوم تبدیل ہو رہا تھا۔ راج پوتی آن اُدے پور کے دروازے پر سوال بن کر کھڑی تھی۔ رانا کو اس سوال کا جواب دینا تھا۔ جے پورا اور جوڈھ پور کے راجا برہمن شمشیروں اور بندو قوں سے محل کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ محل کی موثر شخصیت رانا کی بہن راج کماری چندا بائی اپنے بھائی کا فیصلہ سننے کے لیے بے چین تھی مگر رانا نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ وہ جے پورا اور جوڈھ پور میں سے کسی ایک کا انتخاب نہیں کر سکا تھا۔ دن گذرتے جا رہے تھے۔ ہر صبح کا سویرا ایک نئی پریشان کن خبر کے ساتھ طلوع ہوتا تھا۔ سب لوگ جانتے تھے کہ جے پورا اور جوڈھ پور ایک دوسرے کے خلاف زبردست جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں اور یہ جنگ صرف راج کمار کی کرشنو کے لیے لڑی جائے گی۔

اُدے پور کا راج محل ایک خوب صورت تحصیل میں واقع اور کسی محل کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ آج وہ محل اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ محل میں راج کمار کی کرشنو پنوار سرداروں کے پیام کا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو گئی تھی۔ نہ سردار اس کے لیے پیام لے کے آئے تھے نہ اس کا محبوب بلرام اس کے پاس پہنچا تھا۔ البتہ راجا جے پور کے پیام اور اس کے لشکر پر حملے کی خبر اس نے ضرور سن لی اور سمجھ گئی تھی کہ پنوار سرداروں کے نہ آنے کا سبب کیا ہے لیکن وہ مطمئن نہیں تھی۔ بلرام کے بغیر گزرنے والا وقت اس نے اپنی زندگی سے خارج کر دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسی کے تصور میں کھولی ہوئی تھی۔ اچانک چندا بائی وہاں پہنچی کرشنو بظاہر دیکھے تھے تحصیل میں تیرتی بطنوں کا نظارہ کر رہی تھی۔ اُسے کسی کے آنے کا احساس نہیں ہوا۔ چندا بائی نے چپکے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونک کر مڑی۔ چندا بائی نے کہا۔ "کرشنو! بہت اُداس نظر آرہی ہو، کیا بات ہے؟" اس کے لہجے میں ہمدردی

تھی حالانکہ کرشنو کو اس محل میں کسی سے ہمدردی کی توقع نہیں تھی۔ محل اس کے لیے قید خانہ ہو کے رہ گیا تھا۔ یہاں ہر فرد راج پوتی آن کا ہستار تھا، رسم و رواج کے بت پوجتا تھا اور کسی کو یہ ہوش نہیں تھا کہ کرشنو عبرت راجکمار ہی نہیں، ایک لڑکی بھی ہے اور لڑکی کے سینے میں دل بھی ہوتا ہے اور دل میں کچھ محبتیں، آرزوئیں اور امیدیں ہوتی ہیں۔ چندا بانی بولی: "کرشنو! تمہیں اداس دیکھ کے ہمیں دکھ ہوتا ہے۔ مہاراج نے جو کچھ سوچا تھا، وہ پورا نہیں ہو سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم جو چاہتی ہو، شاید وہی ہو جائے۔"

کرشنو کے ہونٹوں پر ایک تلخ ہنسنے بکھر گیا۔ "پھو بھی ماں! یہ راج محل ہے یہاں محبت امرت نہیں، زہر کا پیالہ ہے، موت کا پیغام ہے۔"

چندا بانی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا: "ہم کچھ اور کہنے آئے ہیں کرشنو! اس کی آواز سرگوشی میں تبدیل ہو گئی۔ "مہاراج نے تمہارا فیصلہ تم پر چھوڑ دیا ہے۔"

کرشنو کا ہنسنے ہی رہا۔ "پھو بھی ماں! اس دیس کی راجکماروں کو محبت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس کی زندگی کی ڈور کسی نہ کسی تخت کے پائے سے بندھتی ہے۔"

"درست ہے لیکن وقت اور حالات کے ساتھ خیالات اور رواج بدل جاتے ہیں۔"

چندا بانی کی آواز میں ایک درد تھا۔ "ہم پہلے بھی تمہارے ہمدرد تھے اور آج بھی ہیں۔ ہم تم سے تمہارے مطلوب کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔"

"آپ کو اس کے بارے میں جان کے مایوسی ہوگی پھو بھی ماں! کرشنو نے پاٹ

لہجے میں کہا۔ "وہ کوئی راجا یا راج کمار نہیں ہے۔"

"یہ تم پہلے بھی تباہی ہو۔"

"اس کے پاس کوئی جاگیر بھی نہیں ہے۔"

"کرشنو! چندا بانی کا لہجہ ٹھکمانہ ہو گیا۔ "ہمیں اس کا صرف نام اور پتہ

درکار ہے۔ کرشنو کے دل میں بیکایک شمعیں روشن ہو گئیں۔ فرط مسرت میں چندا بانی سے

لپٹ گئی اور کانپتی ہوئی آواز میں اسے بلرام کے متعلق تفصیلات بتانے لگی۔ پھر اس

نے کہا۔ "اس کے دل میں شوق اور بازوؤں میں فولاد بھرا ہوا ہے۔ وہ اپنی محبت کے

نام پر دنیا کی ہر طاقت سے ٹکرا سکتا ہے۔ پنوار قبیلے کے تمام سردار اور سپاہی اس کے ایک اشارے پر اپنی جانیں نثار کر سکتے ہیں۔
اس نے یہ بھی بتا دیا کہ بلرام نے رخصت ہوتے وقت پنوار سرداروں کو اوسے پو
بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

چندا بائی تشویش سے بولی 'جے پور کے حالات بگڑ چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے بلرام
کسی مصیبت میں گھر گیا ہو ورنہ ہم جانتے ہیں، پنوار قبیلے کے لوگ اپنا قول کبھی نہیں ہارتے
ایک بات اور قابل غور ہے۔ جب جے پور کا راجا خود تمہارا امیدوار ہے اور اس سلسلے میں
جو وہ پور کے خلاف جنگ چھیڑنے کی تیاریاں کر رہا ہے تو جہلا بلرام اس کے انتقام سے
کیسے بچ سکے گا؟'

کرشنو نے اچانک چندا بائی کے پاؤں چھویے۔ 'پھوپھی ماں! وہ آنندھیاں کو
دیکھئے۔ جو یہ چراغ گل کر دینا چاہتی ہیں، اگر بلرام کو کچھ ہو گیا تو آپ اپنی کرشنو کو بھی زندہ
نہیں دیکھیں گی۔'

چندا بائی نے اسے بازوؤں سے تھام کے اُپر اٹھایا۔ 'کیا تم بلرام کو یہاں بلوا
سکتی ہو؟'

کرشنو نے مایوسی سے نفی میں سر کو ہلایا۔ 'وہ ہر پہلی تاریخ کو خود بخود آجاتا تھا۔
مگر اس بار نہیں آیا، نہ معلوم وہ کہاں اور کس حال میں ہو؟'
'ہم کسی کو جے پور بھیج کے معلومات حاصل کریں گے۔ بلرام سے ہماری ایک
ملاقات بے حد ضروری ہے۔'

بلرام کو سفر میں کئی دن لگ گئے لیکن وہ ناگود سے کامیاب لوٹا اور جب پور
میں داخل ہوا تو اس کے ترکش میں مہاراجا جگت سنگھ کے لیے کئی ہیرے تھے۔ ناگود کا جاگیردار
سوائی سنگھ، راجا بھیم سین کی بیوی، جودھ پور کا نومولود راج کمار کنور اور ناگود کے وہ
راج پوت مٹھا کر جو سوائی سنگھ کے حامی اور راجا مان سنگھ کی بھانجے جودھ پور کے تخت
تراج کا جائز وارث نومولود کنور کو سمجھتے تھے۔

مہاراجا جگت سنگھ نے ان سب کا پر جوش استقبال کیا۔ یہ لوگ راجا جان سنگھ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر جے پور چلے آئے تھے۔ انہیں یقین دلایا گیا کہ جو دھ پور کا تخت اس کے جائز وارث کو دلوانے کے لیے کوئی دقیقہ فرو گناشت نہیں کیا جائے گا۔

بلرام نے ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ وہ سوائی سنگھ اور کنور کونا گود سے ایسے وقت میں نکال کے لایا تھا جب جو دھ پور کے سپاہی انہیں گرفتار کرنے کے لیے روانہ ہو چکے تھے، اگر ایک پہر کی بھی دیر ہو جاتی تو ان کا سینا مشکل تھا۔

پنوار سردار نے جو مہم اپنے بیٹے کے سپرد کی تھی وہ اس میں کامیاب رہا۔ سردار بے حد خوش تھا۔ اس نے مہاراجا جگت سنگھ سے اصل مقصد ابھی تک بیان نہیں کیا تھا۔ بلرام اور راجکماری کوشنو کے خواب بتانے کی جرأت کی تھی۔ البتہ اس نے مہاراجا کے سامنے اپنے بہادر بیٹے کا کارنامہ ایسے موثر انداز میں بیان کیا کہ اس کی بہادری اور وفاداری کی ساکھ قائم کر دی۔ راجا جگت سنگھ بھی بلرام سے بے حد خوش تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھاتا کہ پنوار سردار نے مہاراجا سے یہ قول لے لیا تھا کہ بلرام کو اس خدمت کے صلے میں منہ مانگا انعام دیا جائے گا اور وہ جے پور کی جو بھی جاگیر سپرد کرے گا، اسے بخش دی جائے گی۔

سردار کا ارادہ تھا کہ وہ کسی مناسب الفاظ میں مہاراجا کو راجکماری کوشنو کا خیال ترک کرنے کا مشورہ بھی دے گا۔ مگر موجودہ حالات میں یہ مشورہ اسے مشتعل کر سکتا تھا کیونکہ وہ جو دھ پور کے خلاف رقابت کی جنگ لڑنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ سردار نے بیٹے سے کہا۔ "سیاست کی بساط پر تمہاری پہلی چال کامیاب رہی۔ اب انتظار کرو کہ شاہ کب گھوٹے کی زد پر آتا ہے؟"

راجکماری کوشنو کو فتح کرنے کے لیے راجستھان کے دو طاقت ور رجواڑوں میں بڑی طرح ٹھس گئی تھی۔ کوئی بھی تیسرا فریق اس باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ پنوار سردار کے نزدیک کامیابی کا یہی راستہ باقی رہ گیا تھا۔ جے پور میں جنگ کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ جو دھ پور کے راجا کے خلاف ملامت کا اشتہار جاری کر دیا گیا تھا۔ ریاست میں جگہ جگہ فوجی بھرتی شروع ہو گئی تھی۔ نوجوانوں کو جنگ کی تربیت دی جا رہی

تھی۔ مختلف والیان ریاست حمایت کے لیے تیار کیے جا رہے تھے۔

اس معاملے میں بھی نوار سردار پیش پیش تھا۔ اس نے مہاراجا سے کہا تھا۔
 'مہاراج! جنگ میں فتح باہی کے لیے بازوؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم جس قدر
 بازو پیدا کریں گے، فتح اسی قدر آسان ہوگی۔' اس کی کوششوں سے مہاراجا راجستھان کی کئی
 ریاستوں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ایک روز بلرام کو اچانک راج محل میں طلب کر لیا گیا۔ وہ شاداں و فرحساں
 مہاراجا کے سامنے پہنچا تو اس کے ہوش و حواس پر ایک قیامت گزر گئی۔ یہ پہلا موقع تھا
 کہ اس نے محل کے ایک خصوصی ایوان میں حاضری دی تھی۔ کونٹش کے بعد اس نے سر اٹھایا
 تو وہ مہاراجا کے عقب میں دیوار پر راج کمار کی کشتی کی ایک رنگین اور قد آدم تصویر دیکھ کے
 دم بخود رہ گیا۔ اس کی غیرت پر ایک زبردست کوٹا پڑا۔ اس کے راج پوتی خون کی گردش
 تیز ہو گئی۔ مہاراجا نے اس کی حیرانی سے اندازہ لگایا کہ تصویر کے حسن و جمال نے آسمان
 دسور کر دیا ہے۔ وہ خود بھی دیوار کی طرف گھوم گیا اور خیال انگیز انداز میں کہنے لگا۔

'نوجوان! شاید تمہیں علم نہ ہو، یہی اُسے پود کی راج کمار اور جے پود کی ہونے
 والی مہارانی کشتی ہیں۔ یہ تصویر ایک پرنگالی مصور نے ہمارے حکم پر تیار کی ہے۔ مصور نے
 اُسے پود کے جل محل میں صرف ایک بار نہیں دیکھا تھا۔ ہم سوچتے ہیں جب کشتی کمار کی
 کی تصویر اس قدر دلکش ہے تو وہ خود کس قدر دلکش ہوں گی۔ ان کی خاطر ہم نوک ہزاروں
 دریا عبور کرنے کے لیے تیار ہیں۔'

بلرام کی نگاہ ابھی تک تصویر پر مرکوز تھی۔ مصور نے کشتی کے حسن و جمال کی ایسی
 صحیح عکاسی کی تھی کہ صرف گویائی کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ تصویر کے سامنے دو آدمی دو قریب
 کھڑے تھے۔ مہاراجا پٹا۔ اس نے محسوس کیا کہ بلرام راج کمار کے جلوہ حسن میں غیر معمولی طور
 پر محو ہو گیا ہے۔ اس کے دل میں غمزہ غمزہ کی ایک لہر اٹھی۔

'بلرام! تم راج پوت ہو، ایک نوجوان اور بہادر راج پوت۔ ہمیں بتاؤ اگر راج
 کمار سے تمہیں انس ہو جاتا تو کیا تم راجا مان سنگھ کو زندہ چھوڑ سکتے تھے؟'

بلرام کی محبت کو حالات نے مصلحت سیکھا دی تھی۔ وہ مہاراجا کے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا مگر خاموش بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اُس نے ایک تیسرا راستہ اختیار کیا۔ دل کی طاقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوتی ہے مہاراجا!

مہاراجا نے یہ جواب بہت پسند کیا۔ بلرام! ہم چاہتے ہیں کہ تم ہماری نمائندگی کرو اور ہمارے راج کماری کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

بلرام نے چونک کر حیرت سے مہاراجا کی طرف دیکھا۔ ایسی فرمائش آج تک کسی نے اپنے رقیب سے نہ کی ہوگی۔ بلرام کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ مہاراجا کہہ رہا تھا۔ بلرام! تم ٹھاکر، کنور اور رانی کو یہاں لا کر ایک معرکہ سرچکے ہو۔ اب ہم دوسرا معرکہ تمہارے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اسے بھی کامیابی کے ساتھ سر کر سکتے ہو۔

بلرام نے سر جھکا دیا۔ مہاراجا نے کہا۔ سنا ہے راجا مان سنگھ راجستھان کے مختلف راجاؤں کو ہماری مخالفت پر اُگسا رہا ہے۔ اُس نے اُسے پور کے رانا سے بھی مدد مانگی اور درخواست کی ہے کہ پور کے خلاف دونوں ریاستوں کو متحد ہو جانا چاہیے۔ ہم تمہیں پیغام رساں اور نمائندے کی حیثیت سے اُسے پور بھیجنا چاہتے ہیں تاکہ تم رانا کو راجا مان سنگھ سے کنارہ کش رکھ سکو اور اُسے اچھی طرح سمجھا دو کہ ہم جو دھ پور کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ راجستھان کے بہت سے راجا ہمارے ساتھ ہیں۔ ہمیں امیر خاں کے روہیلے جان بازوں اور مہاراجا سندھیا کے مرہٹہ سپاہیوں کی حمایت بھی حاصل ہو چکی ہے۔ اُن کے لشکر ہمارا اشارے کے منتظر ہیں۔ راجا مان سنگھ جیسے فاضل اور ظالم حکمران کے خلاف رانا کو بھی ہم سے تعاون کرنا چاہیے اگر اُسے یہ منظور نہیں ہے تو وہ جو دھ پور کا ساتھ بھی نہ دے۔

بلرام نے تمام باتیں توجہ سے نہیں مگروہ بات جس نے اُسے بے قرار کر رکھا تھا۔ سارے فسانے میں کہیں نہیں تھی اور وہ اُسے کا منتظر تھا۔ شاید مہاراجا کی تقریر کا حاصل بھی وہی بات تھی۔ مہاراجا بلرام کے قریب ہو گیا۔ سیاست کی بات ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ دل کی بات چھپانے والا تھا لیکن شاید اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آغاز کہاں سے کرے؟ آخر اس نے جیب سے سرنج باقوت کی ایک نہایت قیمتی انگوٹھی نکالی اور بلرام کے ہاتھ پر رکھ دی۔ بلرام ایسی

ہی ایک انگوٹھی پہنے بھی کرشنو کی انگلی میں دیکھ چکا تھا اور اب جسے پود کا مہاراجا سرخ یا قوت کو اپنی زبان بنا رہا تھا۔ بلرام نے کچھ سنے بغیر سب کچھ سمجھ لیا۔ پھر بھی وہ الفاظ کا منتظر تھا۔ مہاراجا نے فیصلہ کو بھیجے میں کہا۔

’ہم چاہتے ہیں کہ رانا سے ملاقات کے بعد تم کسی طرح راج کمار سے بھی ملو اور ہماری طرف سے انہیں یہ انگٹری پیش کرو۔ تم یہ انگوٹھی ان تک کیسے پہنچاؤ گے؟ یہ ہمیں سوچنا ہے۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ ہماری نشانی ہر صورت میں ان تک پہنچ جانی چاہیے۔ اُسے پود کی سفارت کے لیے ہم نے تمہارا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ ہم تم پر اعتماد کرتے اور سمجھتے ہیں کہ تم راج کمار سے ملنے کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور پیدا کر لو گے۔ یہ کام مشکل ضرور ہے مگر تم جیسے بہادر نوجوان ہر شکل سہل کرنا جانتے ہیں۔ راج کمار سے عرض کرنا کہ ہم اُس کے لیے جسے پود جنت بنا دیں گے۔‘

مہاراجا نے اصرار کر کے بلرام سے یہ عہد لیا کہ وہ اُس کا تحفہ راج کمار تک پہنچائے بغیر لوٹے گا نہیں۔ اُس نے مسرت کے جوش میں دونوں ہاتھ بلرام کے کندھوں پر رکھ دیئے ’آج سے تم ہمارے دوست بھی ہو اور راز دار بھی۔ ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں تمہاری ہر آرزو پوری کی جائے گی۔‘

’سوچ لیجئے مہاراج! جب ایک پوٹ دوسرے راج پوت سے وعدہ کرتا ہے تو جان کی بازی لگانے کے بھی اُسے ایفا کرتا ہے۔‘

مہاراجا اُسے کرشنو کی تصویر کے پاس لے گیا۔ ’بلرام! ہم حُسن کی اس شہزادی کے سامنے تمہیں قول دیتے ہیں کہ تمہاری ہر خواہش پوری کی جائے گی۔‘

بلرام نے نہ سمجھا لیا۔ غلام سوئے اُدے پود کی طرف روانہ ہو جائے گا۔

اُسی وقت اطلاع آئی دوہیلے سردار نواب امیر خاں کا پیغام آیا ہے کہ اُس کا لشکر جسے پود کی مدد کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ مہاراجا کا چہرہ کھل اُٹھا۔ اُسے اپنی فتح یقینی معلوم ہونے لگی۔ مہاراجا کی رانی امیر خاں کی مژدہ بولی بیٹی بیٹی ہوئی تھی اور امیر خاں کمپنی سرکار کے بعد ویری فیصلہ کن طاقت سمجھا جاتا تھا۔ اُس کے لشکر میں دوہیل کھنڈ کے بہادر افغان جبروت راؤ ہلکر

مرہٹے پنڈارے اور بھیل سبھی شامل تھے۔ امیر خاں کی آمد کا پیغام طوفانوں کے آگے آگے اٹنے والے پرندے کی حیثیت رکھتا تھا۔ مہارا جانے برام سے مخاطب ہو کر کہا۔
 ”اوسے پور کے دربار میں تمہارا کام اب پہلے سے آسان ہو گیا ہے۔ اوسے پور کا رانا امیر خاں کی طاقت سے واقف ہے۔ اب وہ ہماری دشمنی مول لینے کی ہمت نہیں کرے گا۔ تم اس کی طرف ہماری دوستی کا ہاتھ بن کر جاؤ۔“

برام محل سے نکلا۔ جنوری کا سرد دن تمام کے خشک اندھیرے میں تحلیل ہو رہا تھا۔ محل کے دروازے پر روہیلے سواروں کا ایک دستہ موجود تھا۔ یہ دستہ امیر خاں کا پیغام لے کے آیا تھا۔ اس کے ارد گرد ہجوم اکٹھا تھا۔ امیر خاں کے سواروں کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے جے پور میں پھیل گئی تھی۔ برام جہاں جہاں سے گزرا اس نے لوگوں کو یہی باتیں کرتے سنا کہ اب جودھ پور کے راجا کو اس کی خود سری اور گستاخی کا عبرت ناک سبق دیا جائے گا۔ امیر خاں کی ہیبت اور دہشت سے مالوہ ہی نہیں راجستھان بھی کانپتا تھا۔ اس کا جنگ کے نکلنا راجا مان سنگھ کی بد نصیبی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

برام اپنی حویلی پہنچا۔ اس کو باپ نے راستے میں اطلاع دی کہ اوسے پور کا ایک ایلچی اس سے ملنے آیا ہے اور اس نے اپنی آمد خفیہ رکھی ہے۔ سردار نے ایلچی کو حویلی کے کچھوٹے ایک ایسے کمرے میں ٹھہرایا تھا جو مدت سے بند پڑا تھا۔ وہ برام کو لے کے حویلی کا چکر کاٹتا ہوا وہاں پہنچا۔ اوسے پور کا ایلچی بے چینی سے برام کا منتظر تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اوسے پور کی معزز راج کمار چندا بانی کا بلا والے کے آیا ہے اور اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ چندا بانی نے اسے کیوں طلب کیا ہے، اس کے بارے میں ایلچی کچھ نہیں جانتا تھا۔ البتہ وہ ایک نشانی ساتھ لایا تھا جس سے بلا والے کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ ایلچی نے برام کو ہونے کی ایک انگوٹھی دی۔ انگوٹھی میں سُرخی یا قوت جڑا ہوا تھا۔ برام فوراً سمجھ گیا کہ یہ بلا چندا بانی کی بجائے دراصل کرشنو کی طرف سے ہے۔ وہ سُرخی یا قوت کی یہ انگوٹھی اس کے ہاتھ میں دیکھ چکا تھا، یہ انگوٹھی وہی تھی جو جودھ پور کے مورگیاشی راجا جیم سین نے اسے سنگنی کے موقع پر بھیجی تھی اور جسے کرشنو نے اس کی وفات کے بعد سنگنی سے اتار دیا تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا۔ ایلچی

ٹھیک اسی روز پہنچا، جب وہ خود مہاراجا کا پیغام لے کے اُسے پور جلنے والا تھا۔ حالات نے سنگین موڈ کاٹ کے اچانک اسی صورت اختیار کر لی تھی کہ بلرام کو اپنی کامیابی یقینی معلوم ہونے لگی۔ کرشنو نے اُسے بلانے کے لیے اپنی انگوٹھی بھیجی تھی اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ مہاراجا نے بھی اُس کے لیے اُسے ویسی ہی انگوٹھی دی تھی۔ دوسری انگوٹھی میں بھی سرخ یا قوت جڑا ہوا تھا۔

بلرام نے ابھی سے رخصت ہو کے قندیل کی روشنی میں دونوں انگوٹھیاں اپنے ہاتھ ہاتھ پر رکھ کے دیکھیں۔ وہ دنگ رہ گیا۔ دونوں انگوٹھیوں میں محض سرخ یا قوت کی مماثلت نہیں تھی بلکہ وہ ایک ہی ساخت، ایک ہی نقشے اور ایک ہی ہاتھ کی بنی ہوئی تھیں لکن دونوں میں سرسبز کوئی فرق نہیں تھا۔ راجا بھیم سین اور مہاراجا جگت سنگھ دونوں اُس کے رقیب تھے۔ دونوں یا قوت پسند کرتے تھے، دونوں نے کرشنو کے لیے ایک جیسی انگوٹھیاں بھیجی تھیں اور اس وقت دونوں انگوٹھیاں بلرام کے پاس تھیں۔



رانا اُسے پور کے دربار میں حاضری دینے سے پہلے بلرام کو راج کمار کی چندا بانی کے حضور پیش ہونا پڑا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُسے چندا بانی کے نام سے دراصل کرشنو نے بلا یا ہے۔ لیکن جب راج محل کے پرے دارا سے شاہی آداب و ضوابط کے ساتھ رانا کی بہن کے قصر میں لے گئے تو اس پر پہلی بار یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ بلا و چندا بانی ہی کی طرف سے تھا اور بلاوے کے لیے اُس نے کرشنو کی انگوٹھی استعمال کی تھی۔

چندا بانی نے بلرام کو اور بلرام نے چندا بانی کو پہلی دفعہ دیکھا۔ ایک حسن و جمال اور تمکنت کی مالک تھی، دوسرا وجاہت کے علاوہ راج پوتی آن کا مرتع نظر آتا تھا۔ چندا بانی کو ایسا محسوس ہوا جیسے کہنی افسانوی نوجوان آکاش سے اتر کے سامنے آ گیا ہو۔ اس نے کرشنو کا

انتخاب پسند کیا۔ بلرام کسی ریاست کا شہزادہ نہیں تھا لیکن وہ ایک شہزادی کا حق وار ضرور تھا
چندا بانی نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”نوجوان! ہمارے علم میں ہے کہ تم پہلے بھی اُدے پور آتے رہے ہو مگر اس بار
بار تم ہم سے ملنے آئے ہو۔ تمہیں ہم نے بلایا ہے۔ تمہاری آمد راج کماری کرشنو کے علم میں
نہیں ہے۔“

”یہ میری خوش نصیبی ہے معزز راج کماری کہ آپ نے مجھے طلب کیا، میں آپ کے
حکم کا منتظر ہوں۔“

چندا بانی نے دو چار رسمی جملوں کے بعد اُسے بتایا کہ جے پور اور چودھ پتہ کے
درمیان جو جنگ چھڑنے والی ہے، اُدے پور اس سے الگ تھلگ رہنا چاہتا ہے مگر
سب جانتے ہیں کہ اس لڑائی کی وجہ کرشنو ہے اور جب تک اُس کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہو
جاتا، راجستان میں بھڑکنے والی آگ ٹھنڈی نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ ابھی تک رانائے کوئی فیصلہ نہیں
کیا لیکن وہ چاہتی ہے کہ یہ معاملہ زیادہ طویل نہ کھینچے اور جنگ کا لاؤڈ دہکنے سے پہلے کرشنو کا ہاتھ
بلرام کے ہاتھ میں دے دیا جائے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے، جب مہاراجا جگت سنگھ کرشنو
کی اُمیدواری سے دست بردار ہو جائے۔

بلرام نے تمام صورتِ حال بیان کر دی اور بتایا کہ مہاراجا کو اس خیال سے باز رکھنے کی
ابھی تک کوئی کوشش نہیں کی گئی اور وہ اُس کے قاصد کی حیثیت سے اُدے پور آیا ہے، لیکن
مہاراجا کو جلد اس صورتِ حال سے آگاہ کر دیا جائے گا کہ وہ جو دھ پور سے جنگِ جیت کر بھی
کرشنو کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اپنے قول کے مطابق اُسے بلرام کی خواہش پوری کرنی ہوگی۔ بلرام
نے کہا کہ اگر مہاراجا نے اپنا قول پورا نہ کیا تو وہ اپنی جان پر کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا
چندا بانی نے اُسے مشورہ دیا کہ اگر وہ اس سلسلے میں مہاراجا کی بجائے اُس کی رانی سے رابطہ پیدا
کرے اور اُس کے فدیے روہیلے سردار امیر خاں کی حمایت حاصل کر سکے تو اس کی کامیابی
یقینی ہے، آخر جے پور کی مہارانی کو یہ بات کب گوارا ہوگی کہ اُس پر کوئی سوتن آئے۔ وہ
اپنے منہ بولے باپ امیر ناناں سے کہہ کے مہاراجا کو کرشنو کا خیال ترک کر دینے پر مجبور کر سکتی ہے۔

برام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ میں مہارانی کی بارگاہ میں ضرور حاضری دوں گا۔ اس نے جوش میں کہا اور راج کمار کی چندا بانی کی ذہانت کا معترف ہو گیا، اس نے اشاروں اشاروں میں اسے ایک نئے پہلو پر سوچنے کی دعوت دی تھی۔

چندا بانی نے وقار سے کہا 'جب تم ہمیں یہ نصیحت دلا دو گے کہ مہاراجا جاگت سنگھ راج کمار کی کرشنو کے دعوتی سے دستبردار ہو گئے ہیں تو ہمیں تم جیسے بہادر اور ذہین نوجوان کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں رہے گا۔ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ 'اب تم مہاراجا کی خدمت میں باہر جا کر آؤ پورے چلے جاؤ گے مگر ہم یہ پسند نہیں کریں گے کہ تم راج کمار کی کرشنو کے دشمن کیے بغیر لوٹو، ہم نے راج کمار کی کو بلوایا ہے، وہ تمہیں یہاں دیکھ کے فنگ رہ جائے گی۔'

ایک باندی نے خبر دی کہ راج کمار کی تشریف لارہی ہیں۔ چندا بانی وہاں سے اٹھ کے ہوئے ہوئے قدم اٹھاتی باہر چلی گئی۔ کرشنو اپنی روایتی شان سے چلتی اور گرم عبا کا مہن لہراتی داخل ہوئی۔ برام کو دیکھ کے اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس کے یاقوتی لیوں سے حیرت کی سسکی نکلی۔ برام اسے دیکھتا رہ گیا۔ آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ دل کش نظر آ رہی تھی۔ 'کرشنو! اس نے خواب ناک آواز میں کہا۔ اس ملاقات کے لیے ہمیں راج کمار کی چندا بانی کا شکر گزار بننا چاہیے۔'

راجستھان کا ایک عام نوجوان اُسے پورے عظیم ایشان محل میں داخل ہو چکا تھا۔ محل پری کی جھیل جیسی گہری گہری آنکھیں مسرت کے آنسوؤں سے بھیک گئیں۔ یہ ملاقات حسین بھی تھی اور عجیب بھی، محل کتنی تاریخی روایات کا امین تھا اور آج ایک نئی روایت کا آغاز ہو رہا تھا۔ طالب و مطلوب نے دل بھر کے ایک دوسرے کو دیکھا اور دنیا جہان کی باتیں کہیں۔ دونوں جھرنوں کی طرح برسے اور ندیوں کی طرح ابلے۔ حسب طبیعتوں کو کچھ قرار آیا تو برام نے اپنے انگرکھے میں ہاتھ ڈال کے سڑخ یا قوت کی انگوٹھی نکالی اور اسے کرشنو کی طرف بٹھا کے بولا۔

'میں نے جے پور کے مہاراجا سے عہد کیا تھا کہ یہ انگوٹھی تمہارے ہاتھ تک پہنچا

دو لگا۔ مہاراجا کا عزم ہے کہ ہم جے پور تمہارے لیے جنت بنا دیں گے۔ بلرام نے آنکھیں بند کر لیں۔ راجستھان کی ہواؤ! گواہ رہنا۔ میں اپنا عہد پورا کر رہا ہوں۔ گرشنو خیران تھی۔ بلرام نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کے اُس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔ پھر جب وہ اُس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا تو گرشنو نے چیخ کے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ”نہیں۔“ پھر اُس نے غور سے انگوٹھی کی طرف دیکھا۔ ”ارے یہ تو اور گباشی راجا بھیم سین کی انگوٹھی ہے۔“

”نہیں۔“ بلرام نے دوسری انگوٹھی نکالتے ہوئے کہا۔ ”راجا بھیم سین کی انگوٹھی

یہ ہے کماری۔“

”بلرام یہ دونوں انگوٹھیاں جھیل میں پھینک دو۔ انہیں دیکھ کے ہمیں وحشت ہو رہی ہے۔“

اُسی وقت چندا بائی نمودار ہوئی۔ ”یہ انگوٹھیاں ہمیں دے دو۔“

گرشنو اور بلرام احتراماً کھڑے ہو گئے۔ بلرام نے چندا بائی کے حکم کی تعمیل کی۔ چندا بائی نے دونوں انگوٹھیاں ایک چھوٹے سے چرمی بٹوسے میں رکھ لیں۔ ”بلرام! ہم نے ہمارا نام سے تمہاری ملاقات کا بندوبست کر دیا ہے، اگر وہ تمہیں ایک دن قیام کے لیے کہیں، تو انکار نہ کرنا۔“

اُسی روز بلرام رانا کے دربار میں پیش ہوا۔ ایک شاہی مہمان کی طرح اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ بلرام نے اُدے پور کے ٹھاکروں کے سامنے رانا کو مہاراجا جگت سنگھ کا پیغام سنایا۔ رانا نے جواب دیا۔

”جے پور اور جو دھ پور کی جنگ میں ہم کسی کی طرف داری نہیں کریں لیکن کسی نے اُدے پور پر حملہ کیا تو ہم اپنی سرکار کی مدد سے اس کا مقابلہ ضرور کریں گے۔“ گفتگو خوش گوار ماحول میں ہوئی اور رانا نے بلرام کو ایک دن قیام کے لیے کہا۔ بلرام نے فوراً قبول کر لیا۔

دوسرے دن اُدے ساگر کی جھیل کے کنارے مہمان کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ اُدے پور کے بڑے بڑے ٹھاکروں اور راج پوت سردار ضیافت میں شریک ہوئے۔ یہ دعوت چندا بائی کی تمغیب پر دی گئی تھی۔ دعوت کے اصل مقصد سے شاید رانا بھی قہقہے

نہیں تھا۔ چند بائی یہ چاہتی تھی کہ بلرام اُسے پودے کے ٹھا کر روں کے لیے اجنبی نہ رہے تاکہ جب کرشنو کے لیے اس کے رشتے کا ذکر پھیرا جائے تو کوئی اعتراض نہ کر سکے۔ کرشنو کے لیے یہ تہائی خوشی کا دن تھا۔ وہ محل محل کی بھیل ملیوں سے جھیل کے کنارے اپنے محبوب کی عزت افزائی کا نظارہ کر رہی تھی۔



امیر خاں کا لشکر آندھی اور طوفان کی طرح جے پور پہنچ گیا۔ مہاراجا ساندھیانے بھی دو مرہہ سرداروں کی قیادت میں مدد بھیج دی تھی۔ اب مہاراجا جگت سنگھ کی فوج ایک لاکھ کا ہندسہ چھو رہی تھی۔ اس میں روہیلے افغان، مرہٹے، پنڈارے، بھیل اور اجپوت شامل تھے۔ راجا مان سنگھ نے مقابلے کی تیاریوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ راجستھان کے ٹھا کر روں کے علاوہ دن کچھ اور مہارائے تھر پار کر کے کئی قبیلے بھی اس کے ساتھ تھے۔

جے پور اور جودھ پور کی باہمی کش مکش نے پورا راجستھان دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کوئی راجا، کوئی ٹھا کر رو اور کوئی سردار ایسا نہیں تھا جو کسی فریق کے ساتھ شریک نہ ہو۔ دونوں نے یہ کش مکش راج پوتوں کی غیرت کا سوال بنالی تھی۔ راجستھان کی سرزمین پر تاریخ کی ایک ہولناک جنگ ہونے والی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا اس کا انجام کیا ہوگا۔ راج پوتوں نے بیشتر جنگیں انجام سے بے پروا ہو کر روی تھیں لیکن اگر جنگ کا کوئی اصول اور طاقت کا کوئی نتیجہ ہو سکتا ہے تو مہاراجا جے پور نصف جنگ میدان جنگ میں جائے بغیر جیت چکا تھا۔

امیر خاں کے طاقت ور لشکر کے علاوہ راجپوتانے کے بیشتر راجے اور ٹھا کر رو اسی کے ساتھ تھے۔ اس نے جودھ پور کے اصل وارث تخت اس کی بیوہ ماں اور ٹھا کر رو کی سنگھ کی حمایت حاصل کر کے راجا مان سنگھ کو ظالم اور غاصب حکمران شہور کر دیا تھا۔ دیائے زبدا کے جنوب اور شمال میں امیر خاں ایک فیصلہ کن طاقت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے کسی بار

کمپنی سرکار کی فوجوں کو بھی شکستِ فاش دی تھی۔ جسے پور نے اس کی مدد حاصل کر کے سپاہی دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔

فروری ۱۸۰۷ء میں امیر خاں جے پور پہنچ گیا۔ طبلِ جنگ پر چوٹ پڑی۔ جے پور کا سپہ سالار چاند سنگھ امیر خاں کے بڑے بڑے رٹکے امیر الدولہ وزیر محمد خاں اور دو میلہ سالار عمر خاں کی ہمراہی میں جو دھ پور سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے بڑھا۔ اس کے بعد ٹھاکر سوانی سنگھ نے راج پوتوں کے پیدل دستوں اور مہاراجا چندھیہ کے مرٹھ سواروں کے ساتھ کوچ کیا۔ پھر مہاراجا جگت سنگھ، بیکانیر اور مار وار کے راجاؤں اور ٹھاکروں کی معیت میں خود امیر خاں جے پور سے روانہ ہوا۔

راجپوتانے کی تاریخ ایک نیا ورق اُلٹ رہی تھی۔ راجاؤں کی دھرتی سواروں، پیدل دستوں اور توپ خانے کی گاڑیوں کی دھمک سے لرز رہی تھی۔ راجپوتوں کی طیرت ایک دوسرے کے لہو میں غسل کرنے والی تھی لیکن اُسے پورامس جنگ سے بے تعلق تھا حالانکہ اسی کی راجکار پنکے فساد تھی۔

بلرام رانا کا جواب لے کر واپس آ گیا۔ جے پور کے لشکر روانہ ہو چکے تھے۔ مہاراجا جگت سنگھ کی سواری بھی جا چکی تھی اور وہیلوں کی توپیں جو دھ پور پر گولہ باری کر رہی تھیں پنوار سردار اپنے بیٹے کے لیے یہ پیغام چھوڑ گیا تھا کہ وہ لوٹتے ہی میدانِ جنگ کا رخ کرے مگر بلرام کے قدم سن بھومی کی بجائے راج محل کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ مہارانی جے پور سے بے بغیر کہیں جانا نہیں چاہتا تھا۔ جنگ کا زمانہ تھا اس لیے محل پر کڑا پہرا لگا ہوا تھا مگر بلرام کو مہارانی سے ملاقات کرنے کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مہارانی نے جلد ہی اسے باریابی کا شرف بخش دیا۔ وہ جانتی تھی پنوار سردار کا بیٹا بلرام اُسے پور سے کوئی ضروری پیغام لے کے آیا ہوگا۔ بلرام نے اس کی خدمت میں حاضر ہو کر تھیلیے کی درخواست کی۔ مہارانی نے داروئے محلات کو زحمت کر دیا۔ داروئے کچھ ناصیلے پر ایک پر سے کے پیچھے موجود تھا۔ اب کوئی ہماری گفتگو نہیں سن سکتا۔

بلرام نے بساط پر پہلا مہرا چلا یا۔ غلام محترم مہارانی کے لیے اُسے پور کی راجکاری

چندا بائی کا ایک پیغام لے کے حاضر ہوا ہے۔ "چندا بائی کا نام سن کے مہارانی چونکی۔ وہ اس کا پیغام سنتے کے لیے چین اور مضطرب نظر آنے لگی۔ بلرام نے کہا۔ اُسے پور کی راج کمار کی کیسے ایک جنگ میدانوں میں لڑی جا رہی ہے اور دوسری محلوں میں۔ راج کمار کی چندا بائی کی خواہش ہے کہ محلوں میں لڑی جانے والی جنگ کا فیصلہ آپ کے حق میں ہو۔" مہارانی ہمت تن گوش تھی۔ "راج کمار کی چندا بائی کو آپ سے ہمدردی ہے۔ وہ صرف آپ کی خاطر راج کمار کی کشتیوں کا رشتہ مہاراجا سے پود کو دینے کے حق میں نہیں ہیں۔"

مہارانی نے ایک سرواہ بھری۔ بلرام کا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ سوتن عورت کی کمزوری ہوتی ہے، مہارانی بھی ایک عورت تھی۔ وہ دھیمی اور غم زدہ آواز میں بولی۔ "مگر چندا بائی کو معلوم ہوگا جو اڑوں کی رانیاں اور راج کماریاں بے بس اور مجبور ہوتی ہیں، ہم اگر کوشش بھی کریں، تو مہاراجا کو مجبور نہیں کر سکتے۔ راج کمار کی کشتیوں اور ہماری قسمت کا فیصلہ تو میدانِ جنگ میں ہوگا۔" غلام کہنے کی اجازت دیکھنے کہ مہاراجا یہ جنگ نواب امیر خاں کی مدد سے لڑ رہے ہیں۔ آپ نواب امیر خاں کی منہ بولی بیٹی ہیں۔ راج کمار کی چندا بائی کا امید ہے کہ اگر آپ نواب امیر خاں کو رضا مند کر لیں تو مہاراجا جنگ جیت کر بھی راج کمار کی کشتیوں کو نہیں جیت سکتے۔" مہارانی کے چہرے پر ایک پرچھائیں سی گورگی۔ "چندا بائی کی امید غلط نہیں ہے، اب ہم پانسپلٹ دیں گے لیکن کان کھول کے سن لو، یہ راز باہر نہیں نکلنا چاہیے۔" مہارانی غلام پر ہاتھوں کر سکتی ہیں۔



پہلے ہی معرکہ میں سے پود کے لشکروں نے اپنی برقی ثابت کمزوری۔ مہاراجا جگت سنگھ کے راج پتہ دستے بے جگری سے لڑے۔ دوسری طرف سے امیر خاں کے افغان روہیلے مرہٹے پندارے اور بھیل آسمانی قبر بن کر ٹوٹے۔ جو وہ پوری فوج حوصلہ ہارنے لگی۔ راجا مان سنگھ نے

فوج کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن روہیلوں کا توپ خانہ قیامت کی آگ برسا رہا تھا۔ گولے ٹھیک نشانے پر پھٹتے اور جو وہ پورے سپاہی گردوغبار اور دھوئیں کے بادلوں میں گم ہو جاتے مرنٹوں، پنڈاروں اور بھیلوں نے الگ تباہی مچائی۔ صرف چند روز میں راجا مان سنگھ کے ٹھاکر اور سردار بے ہمت ہو گئے۔

دونوں لشکروں کے درمیان آگ اور خون کا دریا بہ رہا تھا۔ جو وہ پور کی مدافعت کے خطوط سمٹنے لگے۔ ایک روز ٹھاکر اور سردار راجا مان سنگھ کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ارکان حکومت بھی بھاگے اور ان کے پیچھے پیچھے راجا بھی بھاگا۔ جو وہ پور ہار گیا لیکن راجا مان سنگھ نے ہمت نہیں ہاری۔ ہزاروں سپاہی کٹوائے کے بعد وہ اپنے مضبوط قلعے میں جا چھپا۔ امیر خان راجا جگت سنگھ اور ٹھاکر سواٹی سنگھ اس کے تعاقب میں تھے قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا۔

مہاراجا جگت سنگھ نے جنگ جیت لی تھی۔ اُدھر بلرام نے بھی محل کا مورچا سہر کر لیا تھا۔ مہارانی جے پور نے نواب امیر خان پر واضح کر دیا تھا کہ وہ راج محل میں اُسے پور کی راجکمار کا داخلہ پسند نہیں کرتی۔ امیر خان نے بلرام کے باپ پنوار سردار کو اپنی زبان بنایا اور مہاراجا کو پیغام بھیجا کہ اُس نے راجا مان سنگھ سے اپنی توہین کا بدلہ لے لیا ہے۔ اب اُسے راج کمار کی شہنشاہ کا خیال ترک کر دینا چاہیے۔ اُدے پور نے اس جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ اس پر حملہ کرنا نہیں زیب نہیں دیتا۔

مہاراجا جگت سنگھ یہ پیغام سن کے بہت جُور بڑ ہوا۔ پنوار سردار نے اُسے بتایا کہ اُدے پور کی راج کمار کسی اور کو چاہتی ہے چنانچہ وہ جنگ جیت سکتا ہے مگر راج کمار کی ذل نہیں جیت سکتا۔ مہاراجا کے دل پر ایک اور کوڑا پڑا، اُس نے گرج کر کہا۔ کیا بکتے ہو؟

”غلام درست عرض کر رہا ہے مہاراج!“

مہاراجا چند لمحوں تک اُسے خون خوار نظروں سے گھورتا رہا پھر بولا۔

”آخر وہ کون بد نصیب ہے جسے ہمارا رقیب بننے کا اعزاز حاصل ہوا ہے؟“

بلرام کے باپ نے ہمت کی۔ ”جواب دینے سے پہلے میں اپنے اور اپنے بیٹے کے

لیے جان کی امان چاہتا ہوں۔“

”امان دی گئی“

برام کے باپ نے سر جھکا لیا۔ ”اُسے پور کی راج کماری آپ کے غلام زادے برام

سے پایا کرتی ہیں۔“

مہاراجا نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ برام کے باپ نے جو وہ پود کی فتح پر خطِ تہنیت

کھینچ دیا تھا جو مہاراجا کا دل کا ٹٹا ہوا گزر گیا۔ لوہا گرم تھا۔ برام کے باپ نے قول کہا ”مہاراجا نے قول دیا تھا کہ برام کی ہر آند و پوئی کی جائے گی۔ وہ درخواست گزار ہے کما سے راج پوری

کا قلعہ بخش دیا جائے اور سرکار کی سرپرستی میں راج کماری کے لیے اس کا پیام جائے۔“

مہاراجا کے چہرے پر کوب و کش مکش کے آثار تھے۔ اُسے برام پر، برام کے باپ

پر اور امیر خاں پر بہت اعتماد تھا۔ یہ لوگ اُس کے دست و بازو تھے۔ انہی کی مدد سے اس

نے جنگ جیتی تھی لیکن یہی لوگ اب اُسے راج کماری کو فراموش کرنے کا مشورہ دے رہے تھے

امیر خاں کا پیغام اور نپوار سردار کی باتیں ناقابلِ فہم نہیں تھیں۔ حالات رنج بدل رہے تھے اور

وقت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ بھی بدل جائے۔ اُس نے تذبذب کے ساتھ برام اور کوشنو کے

علاقیوں کی تفصیل پوچھی اور اُسے سننے کے بعد تردد اور انتشار سے دوچار ہو گیا، اُسے اپنا

فیصلہ سنانے میں خاصی دیر لگی۔

”برام کی آند و پوری کی جائے گی۔ راج پوری کا قلعہ بھی اُسے بخش دیا جائے گا۔“

اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

باپ نے لوٹ کے اپنے بیٹے کو مژدہ سنایا کہ مہاراجا راج کماری کوشنو سے دستبردار

ہو گئے ہیں اور راج پوری کا قلعہ اُسے مل جائے گا۔ برام کو ساری کائنات ہنستی مسکراتی اور

اور رقص کرتی نظر آنے لگی۔

اُسی شام اُس کا گھوٹا اُسے پود کی طرف اٹھا جا رہا تھا۔



راجستھان میں جنگ کی جو آگ بھڑکی، وہ ابھی تک ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی، جوڑوں کی باہمی رقابتیں اور عداوتیں گیلی لکڑیوں کی طرح اندر اندر سُلگ رہی تھیں۔ امیر خاں اپنے لشکر کے ساتھ جو دھ پور کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ راجا مان سنگھ ہار کر بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ٹھاکر سوانی سنگھ اپنے بہادروں کے ساتھ ناگود چلا گیا اور جو دھ پور کے ٹھاکروں کو نومولود کنور کی تخت نشینی کے لیے ہموار کر رہا تھا۔ امیر خاں کے پیغام کے بعد مہاراجگت سنگھ بھی دل برداشتہ ہو کر جے پور لوٹ آیا تھا۔ راجا دولت رائے دھاکے مرہٹہ سوار، بھیل اور پنڈارے جو دھ پور کو تخت و تاج کرتے پھر رہے تھے۔ ان کی کچھ ٹکڑیاں اُدے پور کی سرحدوں پر بھی منزلدار ہی تھیں۔

راجا مان سنگھ چالاک لومڑی کی طرح اپنے بھٹ میں دبکا ہوا تھا۔ مہاراجا جگت سنگھ نے اس کی طاقت کا مان توڑ دیا اور سوانی سنگھ نے جو دھ پور کی تخت نشینی کا جھگڑا کھڑا کر کے اُسے پریشان کر رکھا تھا۔ اس پریشانی نے اُس کا سکون لوٹ لیا۔ ریاست کے کئی ٹھاکر اس جھگڑے کی وجہ سے اُس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اب اُسے پریشانیوں سے صرف ایک طاقت، صرف ایک شخصیت نجات دلا سکتی تھی، امیر خاں۔ راجا مان سنگھ نے امیر خاں کو درخواست بھیجی کہ اگر جو دھ پور کا محاصرہ اٹھا لیا جائے تو وہ پچاس لاکھ روپے نقد جنگ کا تاجمان ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔

راجستھان کی جنگ میں ایک کروڑ پچاس لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ امیر خاں نے اپنے توشے خانے کے لیے چار لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر کا الگ مطالبہ کیا۔ مان سنگھ اس پر بھی تیار ہو گیا لیکن اُس نے یہ شرط لگائی کہ اُسے سوانی سنگھ کی سرانگیزی سے نجات دلائی جائے کیونکہ اس کی موجودگی میں جو دھ پور کے تخت و تاج کا جھگڑا ختم نہیں ہوگا۔

امیر خاں اور راجا مان سنگھ کے درمیان مفاہمت کی بات چیت چل رہی تھی۔ دوسری طرف اُدے پور کے محل میں کرنلو کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ چندا بائی نے اپنے بھائی رانا کو مشورہ دیا کہ اگر کرنلو کی نسبت کسی ریاست کے والی سے طے کی گئی تو ہو سکتا ہے، جے پور اور جو دھ پور کی رقابتیں پھر بھڑک اُٹھیں اور راجستھان میں پھر خون کی ندیاں بہنے

لگیں۔ اس لیے کرشنو کا ہاتھ کسی ایسے نوجوان کے ہاتھ میں دے دیا جائے جو غیرت مند ہو اور کرشنو کی حفاظت کر سکے۔ اس سلسلے میں چندا بائی نے بلرام کا نام بھی لے دیا۔ رانا کی آنکھوں میں حیرت کی بجلیاں کوندنے لگیں۔ رانا بلرام کو صرف مہاراجا جے پور کے نمائندے کی حیثیت سے جانتا تھا۔ چندا بائی نے اُسے بتایا کہ مہاراجا جگت سنگھ نے بلرام کو راج پوری کا قلعہ دینے کا وعدہ کیا ہے اور اُس کی خاطر کرشنو سے بھی دست بردار ہو گیا ہے۔ رانا نے بہن کا مشورہ قبول کر لیا مگر وہ چاہتا تھا کہ شادی کی رسوم انتہائی خاموشی اور رازداری سے ادا کی جائیں۔

صدیوں سے راجستھان کے راجے مہاراجے رانا خاندان کی دامادی اپنے لیے فخر کی بات سمجھتے تھے اور اُسے پور کی راج کماریوں کی رعنائی نہایت شان و شوکت سے عمل میں آتی تھی۔ ملک کے تمام راجاؤں اور بڑے بڑے مٹھا کروں کو شادی کی تقریبات میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی لیکن ۱۸۰۷ء میں کرشنو کے لیے جو جنگ لڑی گئی اُس نے حالات بدل دیئے تھے یہی وجہ تھی کہ رانا اپنی بیٹی کی شادی خاندانی دستور کے خلاف ایک کم حیثیت گھرانے میں کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس نے کشت و خون روکنے کے لیے ہارمان لی اور اب یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی کی شادی کا چرچا ہو۔

چندا بائی نے یہ خبر کرشنو کو سنائی کہ بلرام سے اُس کا رشتہ منظور کر لیا گیا ہے۔ کرشنو پر شادی مرگ کی حالت طاری ہو گئی، اگر چندا بائی اُسے تھام نہ لیتی تو شاید وہ خوشی سے غش کھا کے گر پڑتی۔ جو دھ پور اور جے پور کے راجا ہار گئے تھے مگر کرشنو جیت گئی تھی۔ وہ اپنی پھوپھی کے قدموں میں گر گئی اور چندا بائی نے اپنے قدموں پر نمی محسوس کی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے کرشنو کو فوراً اوپر اٹھایا اور اپنے پلو سے اُس کے آنسو پونچھنے لگی۔ یہ سترت کے آنسو تھے۔

بلرام کو اطلاع دی گئی تھی کہ کامیابی نے اُسے چُن لیا ہے۔ وہ پنوار سرداروں کے ساتھ آئے اور اپنی خوش نصیبی کی ڈولی اٹھا کے لے جائے۔ شادی کے لیے دو مہینے بعد کی تاریخ رکھی گئی تھی کیونکہ بلرام کے باپ کو شادی کے لیے بہت کچھ بندوبست کرنا تھا ایک روز اُس نے مہاراجا سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ رانا اُسے پور نے اُس

کے بیٹے کا پیام قبول کر لیا ہے۔ لہذا اگر مہاراجا بلرام کو راج پوری کا قلعہ سونپ دیں تو بلا جگہ
مگر شہنشاہ کی ڈولی اسی قلعے میں اتاری جائے۔

مہاراجا کو محبت کی بساط پر ایک پیادے نے شہرہ مات دے دی تھی۔ اُس نے
نہ ہر خند سے کہا۔ ”بلرام کو راج پوری کا اختیار نامہ بہت جلد دے دیا جائے گا۔ پہلے ہم
راج پوری کے موجودہ منصب دار کا کوئی بندوبست کر لیں۔“



اُنہی دنوں مہاراجا جگت سنگھ نے اپنے محل میں مہاراجا سندھیا کے ایک سردار
سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے صرف چند روز بعد مرہٹوں، بھیلوں اور پنڈاروں کی جو
ٹکڑیاں اُدے پور کی سرحدوں پر منڈلا رہی تھیں، وہ ریاست کے اندر گھس کے لوٹ مار
کرنے لگیں۔ اُدے پور کا رانا راجستھان کی جنگ سے الگ تھلگ رہا تھا۔ اس نے بیاخطرہ
محسوس کیا اور فوراً کمپنی سرکار سے مدد کی درخواست کی۔ مرہٹوں اور انگریزوں کی کشمکش
میں رانا نے کمپنی کا ساتھ دیا تھا۔ اس لیے اُسے اُمید تھی کہ کمپنی سرکار مہاراجا سندھیا کے
خلاف فوراً حرکت میں آجائے گی مگر کمپنی نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

کمپنی کے کلکتہ ہیڈ کوارٹر میں رانا کی درخواست پر انتہائی سرد مہری کا اظہار کیا گیا
لاٹو کارنوالس کے جانشین گورنر جنرل سر جارج بارلون نے وہ درخواست آلو کے حقیر قلعے کی
طرح پرے پھینک دی اور راجستھان کے معاملات میں مداخلت کرنے سے صاف انکار
کو دیا۔ امیر خاں کی موجودگی میں کمپنی سرکار راجستھان میں کوئی مداخلت کرنے سے بچنا چاہتی تھی
اُسے خطرہ تھا اگر روہیلہ سردار غضب ناک ہو گیا تو وہ سندھیا کے ساتھ مل کے برطانوی
حکومت کے لیے ایک خطرہ بن جائے گا۔ اسی سیاسی مصلحت سے کمپنی نے اُدے پور کو
مرہٹوں کی ماتحتی کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ سندھیا کے مرہٹوں کے علاوہ روہیلہ کے بعض

افغان بھی لوٹ مار میں شامل ہو گئے۔ ماہی میں بھی اُن کی لوٹ مار کا حلقہ دریائے زریا سے دریا تلج تک وسیع تھا مگر اُس وقت امیر خاں جو دھ پور کے راجا مان سنگھ سے اپنے تعلقات درست کر رہا تھا۔ اس لیے مرہٹوں اور پنڈاروں کا اُدے پور میں گھسنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ رانا نے ایسا محسوس کیا جیسے اس پر اسرار خطرے کے پیچھے مہاراجا جے پور کے ہاتھ حرکت کر رہے ہوں۔

اُدے پور میں مرہٹوں کی تاخت کا دائرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پراسرار دشمن غالباً اُدے پور پر حملہ کرنے کے بہانے تلاش کر رہا تھا۔ رانا سخت مضطرب اور پریشان تھا پہلے بیٹی کا غیر معمولی حسن اُس کے لیے بلائے جاں ثابت ہوا تھا۔ اب اگر سلطنت ہاتھ سے نکل گئی تو کیا ہوگا؟ اُس کا خاندان صدیوں سے اُدے پور کا دفاع کر رہا تھا۔ رانا کا فرض تھا وہ راج پوتوں کی اس روایتی سرزمین کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فرو گناشت نہ کرے مگر وہ تنہا تھا اور دشمن ہاتھ کی لکیروں کی طرح جھگھٹا کر رہے تھے۔ اُس نے بیٹی کے لیے حالات کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب اپنی سلطنت کے لیے پانسا پھینکا تو یہاں بھی امیر خاں کا چہرہ نظر آیا۔ اس آڑے وقت میں وہی اُسے پراسرار دشمنوں سے بچا سکتا تھا۔ رانا نے فوراً امیر خاں کی طرف قاصد دودھایا۔

امیر خاں، رانا اُدے پور کا بہت اہم کرتا تھا۔ اس ریاست سے کچھ تاریخی روایتیں وابستہ تھیں۔ ایک بہادر جرنیل کی طرح امیر خاں وہ روایتیں زندہ دتا بندہ رکھنا چاہتا تھا۔ قاصد کے پہنچتے ہی گبولے کے مانند اڑتا ہوا اُدے پور پہنچا۔ رانا نے اس کا بہترین استقبال کیا اور اُدے پور کے دفاع کی خاطر جو تھائی ریاست امیر خاں کی نذر کر دی۔

امیر خاں اپنا لشکر لے کے اُن مقامات کی طرف لپکا جہاں مہاراجا سندھیا کے مرہٹہ سواروں نے تباہی پھیلا رکھی تھی۔ امیر خاں کا نام سن کے وہ افغان، روہیلے، پنڈارے اور جھیل چھٹنے لگے جو سندھیا کے مرہٹہ سواروں کے ساتھ لوٹ مار میں شامل ہو گئے تھے۔ جے پور کے راج پوت بھی مہاراجا جگت سنگھ کے اشارے پر سرحدی تاخت میں حصہ لے رہے تھے۔ وہ بھی فرار ہو گئے۔ امیر خاں نے صرف چند روز میں گڑھی ہوئی حالت



سنبھال لی۔ اُدے پور پر چھائے ہوئے خطرے کے بادل روہیل کھنڈ کی تیز ہوائیں اڑانے لگیں۔

کرشنوبے حد خوش تھی۔ امیر خاں اس کے باپ ہی کا نہیں، اُس کا بھی محسن تھا جانتی تھی کہ اُسی نے مہاراجا جگت سنگھ کو اُس کا خیال ترک کرنے کا مشورہ دیا تھا اور یہ امیر خاں ہی کے مشورے کا اثر یا خوف تھا کہ جگت سنگھ اس کے اور بلرام کے راستے سے ہٹ گیا تھا۔ اُدھے پور اور امیر خاں کی دوستی کا سب سے بڑا فائدہ کرشنوبہ کو پہنچنے والا تھا کیونکہ اُس کا محبوب جے پور سے تعلق رکھتا تھا اور اگر جے پور اور اُدے پور کے درمیان محض اُس کی وجہ سے تعلقات استوار نہیں ہو سکے تھے۔ نیز مہاراجا جگت سنگھ نے اپنے دل پر ناکامی کا ایک زخم بھی کھایا تھا لیکن امیر خاں کی طاقت نے دونوں ریاستوں پر بادل کی طرح سایہ کر رکھا تھا، وہ سمجھتی تھی یہ سایہ اُسے راج پوری میں بھی حاصل رہے گا۔ امیر خاں نے اُدے پور کے رانا کو اپنا پڑوسی بدل بھائی بنا لیا تھا۔ اس اعتبار سے کرشنوبہ اس کی بھتیجی ہو گئی تھی۔

بلرام کی طرف سے اُسے متواتر پیغام مل رہے تھے کہ عنقریب مہاراجا جگت سنگھ اُسے راج پوری کا اختیار سونپنے والا ہے۔ بلرام کے باپ نے راج پوتوں کے دستور کے مطابق شادی کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں اور دوسرے پوار سرداروں کے ساتھ مقررہ تاریخ پر اُدے پور پہنچ جانا چاہتا تھا۔ راجستھان کی روایات کے پیش نظر چاند کی چودھویں رات کو شادی ہوتی تھی اور پوار سردار اسی روز اُدے پور پہنچنے والے تھے۔ جے پور سے آخری خبر یہ آئی تھی کہ بلرام کو راج پوری کا اختیار چاند کی دس تاریخ تک مل جائے گا اور قلعہ کرشنوبہ کے خیر مقدم کے لیے راستہ کو دیا جائے گا۔

اُسے پور کی ہدایات کے خلاف راج کمار کی کوخصت کرنے کے لیے راجا دل اور
ٹھا کر دن کو دعوت نہیں دی گئی تھی۔ اُس شان و شوکت سے بھی اجتناب برتا جا رہا تھا۔ جو
رجواڑوں کی تہذیبی زندگی کا حصہ تھی۔ پھر بھی وہ ایک راج کمار کی شادی تھی۔ لہذا راج محل
میں کئی دن پہلے سے چہل پہل شروع ہو گئی۔

جیسے جیسے چاند کی تاریکیاں گزر رہی تھیں، کرشنو کے شہابی عارضوں پر شفق کھلتی جا
رہی تھی، اُس کا حسن اور نکھرتا اور سنوتا جا رہا تھا۔ اُس کے متناسب مرمری بدن پر خوشبوؤں
میں بسا ہوا اٹن ملا جا رہا تھا، کہ وہ اور بھی ملائم اور شفاف ہو جائے۔ راج کمار کی اپنے محبوب
کے لیے دلہن بنائی جا رہی تھی۔

چاند کی تیرھویں رات اُسے پور کے قدیم لوگ گیتوں اور سنگیت کی مدھرتانوں میں
بیت گئی۔ سنئے دن کا سورج طلوع ہوا۔ اُسے ساگر جھیل کے کنارے پوار سرداروں کے
قیام کا بندوبست کیا گیا۔ وہاں ایک آرائشی دروازہ کھڑا کر دیا گیا۔ دو لھا کو برائیوں کے آگے
آگے اسی دروازے سے گزرنا تھا لیکن اُس کے گورنے کا دروازہ تو دلہن کے دل میں تعمیر ہوا
تھا۔ کرشنو نے محل محل کی کھڑکی سے جھیل کے کنارے آراستہ دروازہ دیکھا اور شرما کے اپنا پتہ
گھونگھٹ میں چھپا لیا۔ یقیناً اُس کا بلرام اپنے قبیلے کے سرداروں کے ہمراہ جے پور سے
خصت ہو چکا ہوگا۔ اُس کی آمد کسی بھی وقت متوقع تھی۔

کرشنو تصور میں اُس کے گھوڑے کی ابھرتی اور گونجتی ٹاپیں سنتی رہی تھی، جنہیں
سننے ہی اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں مگر آج وہ ٹاپیں ابھی تک سنائی نہیں
دی تھیں۔ کرشنو کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ دل تو خیر کئی دلوں سے دھک دھک
کر رہا تھا اسی لمحے اس کی سہیلی پورنیا ترم قدموں سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے جھیل کی طرف
کھلنے والی کھڑکی میں کھڑے ہو کے اپنی پردہ آواز میں گانا پھیر دیا۔ "کلہے کو بیا ہی بدیں۔"

جھیل کی لہروں پر کرشنو کا دل ڈوبنے لگا۔ آج بابل کے گھر میں اُس کا آخری دن
تھا۔ پورنیا کے گیت کی لے تھی تو کرشنو کی جھگی پلکوں سے آنسوؤں کے ستارے ٹوٹ رہے
تھے۔ پورنیا نے بڑھ کر اُسے تھام لیا۔

جل محل کے کسی کمرے میں ڈھولک بج رہی تھی۔ ڈھولک کی تھاپ پر کچھ لڑکیاں یہی گیت گارہ ہی تھیں۔ "کاہے کو بیا ہی بدیس"۔ پورنیا کرشنو کو بانوں سے تھام کے وہاں لے گئی جہاں اُسے عروسی لباس پہنایا جانے والا تھا۔

جھیل کے کنارے شامیلنے آراتہ ہو چکے تھے۔ محل میں کرشنو دھن بنا دی گئی تھی اور پنوار سرداروں کا انتظار ہو رہا تھا۔ کچھ چوب دار جے پور کے راتے پر کھڑے کر دیئے گئے تھے تاکہ وہ جیسے ہی مہانوں کو دیکھیں، فوراً محل میں اطلاع بھجوادیں، مگر ابھی تک کوئی سوار نمودار نہیں ہوا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ انتظار میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ محل میں پریشانی محسوس کی جانے لگی۔ لوگوں کی خاموش نظریں سوال کر رہی تھیں۔ "پنوار سردار ابھی تک کیوں نہیں آئے؟" انتظار ہوتا رہا، یہاں تک کہ سورج کا سنہرا رتھ نول رنگ شفق میں ڈوبنے لگا۔ آفتی پر آسمان اور زمین گلے مل رہے تھے یکا یک جے پور کا راتہ ٹاپوں سے بج اٹھا۔ صرف ایک سوار گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا اُدے پور میں داخل ہوا۔ شور بلند ہوا کہ "راج کمار کی کا دوٹھا آگیا"۔

مگر وہ بلرام نہیں تھا بلکہ جے پور کا ایلچی تھا۔ اُس کے گھوڑے کی خرچی میں رانا کے لیے ایک پیغام تھا۔ اُسے فوراً محل میں کرشنو کے باپ رانا کے پاس پہنچا دیا گیا۔ وہاں رانا چندا بانی اور ٹھا کرا جے سنگھ بہات کا انتظار کر رہے تھے۔ راج پوت ایلچی بے خوفی سے اندر داخل ہوا اُس کے ہاتھ میں گھوڑے کی خرچی تھی۔ وہ براہ راست رانا سے مخاطب ہوا۔

"راج کمار کی رخصتی پر مہاراجا جے پور نے آپ کے لیے ایک تحفہ بھیجا ہے۔" ایلچی نے خرچی سے ایک کٹا ہوا انسانی سر نکالا اور اُسے رانا کے قدموں میں دیا۔

وہ بلرام کا سر تھا۔ کرشنو کا بہادر محبوب جے پور میں قتل کر دیا گیا تھا۔

رانا اور ٹھا کرا جے سنگھ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چندا بانی کے منہ سے ایک

جگر خراش چیخ نکلی، وہ تیور کر گر پڑی راج پوت ایلچی رانا اور جے سنگھ کے سنبھلنے سے پہلے

واپس جا چکا تھا۔

اچھے سنگھ نے بلرام کا کٹا ہوا سر اٹھایا اور اُسے پھر خرچی میں ڈال دیا۔ چندا بائی
تدریج ہوش میں آرہی تھی۔ غم کی شدت سے انا کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ اُس نے دکھ سے کہا۔
” آج کرشنو کا ہونے والا دوپہا دوسری بار مرا ہے۔ شاید ہماری بیٹی کی قسمت میں
کوئی دوپہا نہیں۔“

” اگر راج کمار کی میری بیٹی ہوگی۔“ ٹھاکر اچھے سنگھ نے غصے میں کانپتے ہوئے کہا۔
” تو میں اُن کی شادی موت سے رچا دیتا۔ راجا بھیم سین کے بعد نہیں زندہ رہنے کا کوئی
حق نہیں تھا، اگر وہ اپنے منگیتر کے ساتھ ہی مرجائیں تو راجستھان میں خون کی ندیاں نہ بہتیں۔
مرہٹے، روہیلے اور پنڈارے ہمارے دیس میں اس طرح نہ گھٹتے اور راج پوتوں کی غیرت
بندو قوں کا نشانہ نہ بنتی۔“

وہ چندا بائی سے مخاطب ہوا۔ گستاخی معاف! راج کمار کی دوسری منگنی کر
کے اپنے بھائی کے ہاتھ پر کلنک کا میکا آپ نے لگایا ہے، اُسے پور کی آن آپ نے لوٹی ہے
ہماری عزت آپ نے مجروح کی ہے اور اگر آپ چاہتی ہیں کہ اُسے پور کے راجپوت
اپنی گردن کبھی اُونچی نہ کر سکیں تو جیسے کرشنو کے لیے کوئی تیسرا برتلاش کر لیجئے۔
راتا زخمی شیر کی مانند گرج کے بولا۔ ٹھاکر اچھے سنگھ! تم نے ہماری غیرت کا
مذاق اڑایا ہے۔ ہم اُسے پور کی راج پوتی آن کے محافظ ہیں اور ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ اب
کرشنو کی شادی موت ہی سے ہوگی اور آج ہی ہوگی۔ چندا بائی جاؤ بیٹی کے لیے
زہر کا پیالہ تیار کرو۔ ہم اُسے اپنے ہاتھ سے امرت پلائیں گے۔
چندا بائی کی آنکھوں سے ایک عزم جھانک رہا تھا۔ وہ پرفکار انداز سے چلتی
کرے سے باہر نکل گئی۔

کرشنو دھن بنی بیٹی تھی۔ وہ اس فکر میں ڈوبی ہوئی تھی کہ بلرام ابھی تک کیوں
نہیں آیا؟ اُس نے تو قول دیا تھا کہ میں اپنی جان پر کھیل کے بھی تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔
پھر وہ کیوں نہیں آیا؟ چندا بائی وہاں داخل ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں چاندی کا ایک کٹورا تھا اور
لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ کرشنو سمجھی کہ شاید اس کا دوپہا آگیا ہے اور چندا بائی اُسے مطلع کرنے

آئی ہے مگر چندا بائی۔ کہہ بیچھے بیچھے رانا اور بٹھا کر بھی تھے۔ کرشنو چونک سی گئی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ چندا بائی چاندی کا کٹورا لیے ایک طرف کھڑی تھی۔ رانا بیٹی کے سامنے پہنچ گیا۔ بیٹی نے تمام تر حیا کے باوجود ڈوبے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”پتا مہاراج! کیا پنوار سردار ابھی تک نہیں آئے؟“

رانانے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر عزم آواز میں بولا۔ ”بیٹی! بے شک پنوار سردار نہیں آئے لیکن تمہارا دوٹھا ضرور آئے گا۔ تمہاری ڈولی ضرور اٹھے گی۔ اگر ڈولی نہیں اٹھے گی تو ارٹھی اٹھے گی اور موت تمہیں ہم سے جدا کر کے لے جائے گی۔ یہ تمہارے غیرت مند باپ کا فیصلہ ہے۔ آج ہم تمہارے خون سے اپنے ماتھے کا داغ دھونا چاہتے ہیں۔ تاکہ ٹھا کر اچھے سنگھ کی طرح کوئی راج پوت آئندہ ہمیں بے غیرتی کا طعنہ نہ دے سکے۔“

کرشنو سمجھ گئی کہ کوئی حلوٰۃ ہو گیا ہے۔ اس نے مضبوط آواز میں کہا ”پتا مہاراج! آپ کا سر اونچا رہنا چاہیے مگر ہم یہ پوچھنے کا حق ضرور رکھتے ہیں کہ کیا مرنے سے پہلے ہمیں بلرام کی صورت دیکھنے کی اجازت ہے؟“

”تمہاری یہ خواہش پوری کر دی جائے گی۔“

کرشنو نے خود آگے بڑھ کے چندا بائی کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ لے لیا اور ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی گھونٹ میں اسے خالی کر دیا۔ چندا بائی بہت تیز زہر لے کے آئی تھی زہر نے فوراً کرشنو کا جگر کاٹنا شروع کر دیا۔ کرشنو کا سر چکرانے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہی لفظ تھا۔ ”بلرام“۔ رانا کے اشارے پر بٹھا کرنے بلرام کا کٹا ہوا سر نکالا اور ساگوان کی گول میز پر رکھ دیا۔ کرشنو نے کٹا ہوا سر دیکھا اور ایک دل و دماغ سے گری گئی محل کے کسی کونے سے ڈھولک کی تھاپ پر آواز آرہی تھی ”کلہے کو بیا ہی بیس۔“

چندا بائی نے سرنخ یا قوتوں کی دونوں انگوٹھیاں کرشنو کی مڑوہ انگلیوں میں پہنا دیں۔



اردو کے صاحب طرز ادیب
قمر اجنالوی کی تاریخی پیش کش

پر تھال

چھ پاکستان ادب تجارت میں یکساں مقبولیت حاصل ہوئی قیمت ۲۵ روپے

مکتب القریش، سرگزر روڈ، لاہور

حالی اور اقبال کے بعد
قمر اجالوی عالم اسلام کی رودادِ غم بیان کرتے ہیں
اس دور کا سب سے بڑا قصیدہ نعتیہ

بنام خیر الانام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

- جس نے سنا جھوم اٹھا
 - جس نے پڑھا دل تھام لیا
- اُردو شاعری میں اپنی نوعیت کی منفرد اور عظیم نظم
یہ قصیدہ حضرت رسالت مآبؐ کے حضور شاعر کی دردمندانہ فریاد بھی ہے
اور اسلام کے عروج و زوال کی منظوم تاریخ بھی۔

جناب احمد ندیم قاسمی - جناب ڈاکٹر عبادت بریلوی جناب ڈاکٹر عبدالسلام خورشید
کے نگرانیگر مقالات - جناب غلام جیلانی باصراور جناب انوار قمر کے معلومات افزا مضامین
کے علاوہ جناب اقبال راہی - ڈاکٹر اقبال سرہندی - شریف شیوہ - جناب جاوید سہیل اور جناب سکندر
سہراب کے وہ منظوم نذرانے جو قمر اجالوی کے اس قصیدہ نعتیہ کے حوالہ سے پیش کیے گئے۔
علاوہ ازیں جناب عثمان عرفانی نے اس مقدس اور تاریخی تقریب کی مکمل روداد
قلم بند کی ہے جو عاشق رسولؐ (فلم سٹار) جناب حبیب کے دولت کدہ پر منعقد ہوئی۔
مکتبہ القریش اس لافانی قصیدے کو آپ تک پہنچانے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔
آج ہی طلب فرمائیے

قیمت .. ۱۵ روپے

مکتبہ القریش، چوک اردو بازار، لاہور

مؤرخ - ادیب صحافی اور شاعر

قمر اجٹالوی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں اسلامی دنیا

کا پورا پورا مائپش کرتے ہیں

اس دور کا سب سے بڑا قصیدہ نعتیہ

بنام خیر الانام

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اگر آپ نے یہ قصیدہ نہیں پڑھا تو کچھ نہیں پڑھا۔

اگر آپ نے حضورِ اقدس کی یہ نعت نہیں سنی تو کچھ نہیں سنا۔

حقیقت مند اس لافانی قصیدے کو گھروں کی زینت بناتے ہیں۔

ہم سے طلب فرمائیے قیمت .. ۱۵ روپے

مکتبہ القریشی چوک ادو بازار، اہول

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

مکتبہ القریش اُردو کے منفرد اور صاحبِ طرز ادیب قمر اجالوی کا ایک انتہائی پراسرار
سنسنی خیز اور شخیر انگیز ناول پیش کرتا ہے

مقدمہ مورتی

تمہاگت بدھ کے فلسفہ نروان اور بودھ تاریخ و آثار کے پس منظر میں
بودھ گیانی تھا روکشپ کی لرنہ خیز آپ بیتی جسے پڑھ کر آپ رائیڈر
ہیگرڈ کی کہانیوں کو بھول جائیں گے۔

○ ہزاروں لوگوں کا متفقہ فیصلہ

اس سے بڑی سنسنی خیز کہانی ہم نے آج تک
نہیں پڑھی۔

یاد رکھیے

یہ آپ کے محبوب مؤرخ اور ادیب

قمر اجالوی

کی تحریر ہے

○ وہ جیون بھید کیا تھا جس کی خاطر ساؤغاندان

تین صدیوں تک نسل در نسل بودھ کی ایک

مورتی کو تلاش کرتا رہا؟

اُردو ادب میں ایسا سنسنی خیز ناول آج تک نہیں لکھا گیا

نروان کے اسرار و تحریر کی داستان

بہت جلد پیش کی جا رہی ہے

مکتبہ القریش، چوک اردو بازار، لاہور

احب طرز ادیب قمر اجنالوی
کا نام تاریخی ادب میں
سند کا درجہ رکھتا ہے

ولی عہد

— اٹھارہویں صدی کے بڑے صغیر کی لہو لہو تصویر —

● جب کمپنی سرکار والیان ریاست کا شکار کھیل رہی
● جب انگریز حکمران اعلیٰ کی زبان میں گفتگو کر رہا تھا

● ایک خانہ بدوش جو ولی عہد بن گیا
● ایک شہزادی جو خانہ بدوش بن گئی

آزادی کی عجیب و غریب، لرزہ خیز داستان
جسے قمر اجنالوی کے تاریخ ساز قلم نے لکھا

(آج ہی طلب فرمائیں)

مکتبہ القریش، سرکلر روڈ، لاہور